یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

نگرانِ اعلیٰ
حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مجلسِ ادارت اعزازی
سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی

برہان

جلد: ۱۲۲ — جنوری ۷ فروری ۱۹۹۸ء — شمارہ ۲_۱

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ برہان
4136 - اُردو بازار جامع مسجد دہلی-110006 ✦ فون نمبر 3262815

زرِ تعاون
فی پرچہ: ۶ روپے
سالانہ: ۷۰ روپے
کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISION

عمید الرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے عیسائیت اور اسلام کے بارے میں پیش آنے والے واقعات کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب جو تقریباً تین چار ماہ پہلے ہی منظر عام پر آئی ہے لکھا ہے کہ اسلامی دنیا میں جس طرح کے واقعات رونما ہو رہے ہیں اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے اس بات کی زوردار تائید ہوتی ہے کہ اسلام اپنے جارحانہ انداز میں ایک بار پھر عیسائیت کو فنا کرنے کے ارادے سے پوری دنیا میں تیزی سے نمودار ہوگا اور اگر عیسائیت کو اپنی بقاء و سلامتی درکار ہے تو اسے ابھی سے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی اور اسلام کی جارحیت کو اسے کس طرح روکنا ہے اس کے لیے پوری عیسائی دنیا کو ابھی سے مل بیٹھ کر کوئی جامع لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا اور اگر ہم نے اس طرف سے لاتعنائی اختیار کیے رکھی تو عیسائیت کو اپنے وجود کو ختم کرنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ لیکن مارگریٹ تھیچر کا تعلق سیاست سے بھی ہے اس لیے انھوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے بھی پبلسٹی کے ذرائع کو استعمال کرنا زیادہ مناسب سمجھا، ورنہ تو یہ ایک حقیقت ہے کہ یورپی دنیا میں جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ محض مارگریٹ تھیچر ہی کے خیالات کی عین ترجمانی ہے اور مارگریٹ تھیچر نے تو یہ بات ظاہر کردی اور کیوں کردی ان کی اس میں کیا مصلحت تھی یہ تو وہ خود ہی جانتی ہوں گی اور مارگریٹ تھیچر نے یہ بات کہہ کر عیسائیت پر کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ اسلامی دنیا کے لیے ان کی یہ کتاب یقیناً ایک حیرت انگیز انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے اور اسلامی دنیا کے اہل و دانش اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنی حکمت عملی کیا اختیار کرتے ہیں اس سے واقفیت ہم سب کے لیے باعث دلچسپی ہوگی۔

مارگریٹ تھیچر کی یہ بات تو چار پانچ ماہ پہلے ہی عیسائی دنیا کو شاید جگانے کے مقصد سے سامنے آئی ہے یا خود مارگریٹ تھیچر ہی عیسائی دنیا کے پروگراموں پر پردہ ڈالنے کے عین مقصد میں ہی یہ بات ایک کتاب کے ذریعہ کہنے پر اس لیے کمربستہ ہوئی ہیں کہ اسلامی دنیا کو مزید غفلت کی نیند میں مبتلا رکھا جائے اور اس سے پہلے

[illegible] کے یورپی دنیا کی طرف سے کارروائیاں عمل میں لائی گئیں یا لائی جا رہی ہیں اس کو اسلامی دنیا عبرت کی نظر سے دیکھے بلکہ اسی نقطۂ نظر سے ہر گزند دیکھے اور وہ مزید گمراہی میں پڑ کر اپنے کو تباہ و برباد کرنے کے دام میں پھنسنے سے خود کو روک پائے۔

میرے خیال میں تو مارگریٹ تھیچر نے یہ کہہ کر کوئی اہم بات نہیں کہی ہے کہ مستقبل میں عیسائیت کو اسلامی جنون اور اسلامی اگروادکو ذہن میں رکھ کر کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا، شاید مارگریٹ تھیچر کو یہ بات معلوم نہیں یا وہ جان بوجھ کر اس کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ عیسائیت تو ایک عرصہ دراز سے اسلام کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھ کر مختلف طریقوں سے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمت عملی اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس میں کچھ تو عمل اسلامی دنیا کے اہل دانش کی نا سمجھی ہی کو جاتا ہے اور کچھ مفاد پرست وہ لوگ جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر وہ حرکتیں کر رہے ہیں جنھیں وہ اسلام مذہب کے مطابق گردانتے ہیں لیکن حقیقت میں اسلام سے اس کا کوئی تعلق و واسطہ نہیں ہے اور سب سے بڑی بات جو ہے وہ یورپی دنیا کا کام کرنے کا بہترین اور کارگر طریقۂ عمل ہے، جس منظم انداز سے وہ ایک عرصہ سے اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں اس کا کوئی بھی توجواب موجودہ اسلامی دنیا کے پاس بالکل نہیں ہے۔ صلیبی جنگوں سے عیسائیت نے زبردست سبق سیکھا ہے انہوں نے موجودہ حالات میں صلیبی جنگوں میں اپنی ناکامیوں کا زبردست بدلہ اسلامی دنیا سے لینے کی ٹھانی ہوئی ہے اور اس میں کسی حد تک ان کی کامیابی کو نظر انداز کرنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی سے خلافت عثمانیہ کا خاتمہ خود مسلمانوں کے ہی ایک طبقہ جس کی نمائندگی مصطفےٰ کمال پاشا کر رہے تھے، کے ذریعے ختم کرنا عیسائیت کی اسلامی دنیا پر سب سے بڑی چوٹ تھی اس وقت اسلامی دنیا کے کسی بھی فرد نے اسے معمولی انداز میں لیا، صرف ایک شخص تھا اور وہ بھی ہندوستان میں جس کا نام مسٹر محمد علی علیگ سے بنے مولانا محمد علی جوہرؒ ہے، اس محترم ہستی نے چاک خلافت کو دراصل اسلام مذہب پر کاری ضرب ہی سے تعبیر کیا تھا چنانچہ اس پر تمام دنیا میں مولانا محمد علی جوہر چیختے چلاتے رہے مگر کسی نے اس مجسم ایمان کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا اور آخر میں وہ اپنوں اور غیروں کی لن ترانیاں سنتے سنتے موت کی آغوش میں جا پہنچا۔ اس کے بعد عربوں کے قلب میں فلسطین کے تمام احتجاجات کے باوجود فلسطینیوں کے حقوق کو پامال کرتے ہوئے اسرائیل نام کی سلطنت قائم کر کے اسلامی دنیا پر وہ زبردست وار کیا جس کے زخم کو اسلامی دنیا شاید ہی ختم کر سکے۔ آج پچاس سال ہو چکے ہیں دنیا کے نقشے پر اسرائیل نام کی ریاست قائم ہوئے، اس دوران میں عرب ممالک جب بھی فارغ البال ہو کر اپنے لیے کچھ کرنے کی تدابیر اختیار کرتے ہیں تو ان پر اسرائیل کی طرف سے جنگ لاد دی جاتی ہے اور وہ پھر جنگ سے ہونے والے نقصانات کی بھرپائی میں لگ جاتے ہیں۔ اس چکر میں ان کی زندگیاں ختم ہو رہی ہیں وہ اپنے بارے میں اپنی قوم کے بارے میں اپنے ملک کے بارے میں کچھ بھی فلاح و ترقی کی باتیں سوچ ہی نہیں پاتے ہیں۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اس کے تحت جو ریاستیں

آزاد و الگ ہوئیں ان میں اکثریت مسلمان تھیں۔ سوویت روس سے چھٹکارا پانے کے بعد انہوں نے اپنے غصب شدہ مذہب اسلام کو بازیاب کیا تو یورپی دنیا نے ان کو ایسا الجھادیا کہ وہ اپنے مذہب اسلام کو بھول کر اپنی بقاء سلامتی ہی کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئیں۔ بوسنیا میں مسلمانوں پر حملے ہوتے ہیں تو بجائے اس کی مذمت کے اسے اسلامی جنون پرستی کی دین کہہ کر اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے، چیچنیا میں لڑائی تھوپ کر مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ ترکی میں دو فرقے بنا کر تمام دنیا میں یہ باور کرانے کی مہم شروع ہو جاتی ہے کہ ترکی میں اسلام کی آڑ میں دہشت پسندی نے زور کر رکھا ہے اس طرح الجیریا میں خواہ مخواہ کا قضیہ کھڑا کر کے اسلام کو ماڈرن انسان کے ذہن میں ایک جارحیت پسند مذہب کی صورت میں پیش کرنے کی زبردست سازش چل رہی ہے۔ تمام پبلسٹی کے ذرائع ان کے ہاتھ میں ہیں اور اس دور میں الیکٹرانک میڈیا پر بھی عیسائی دنیا کی اجارہ داری ہے۔ ایسی پوزیشن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپی طاقتوں نے ان تمام ملکوں میں جہاں اسلام کو ماننے والوں کی اکثریت و حکومت ہے، حُسن ومال، دولت و سائنسی ایجادات، ہتھیاروں اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر اپنی خفیہ سازشوں و کارروائیوں کو جاری کیے رکھا ہے۔ عراق وایران جنگ جو ۹ سال تک مسلسل چلتی رہی اور پھر عراق کے خلاف اقوام متحدہ کے حکم کے تحت اتحادی ملکوں کی طرف سے زبردست فوجی واقتصادی بائیکاٹ جیسی کارروائیاں بھی دراصل عیسائیت کا پوری دنیا پر تسلط قائم کر کے تمام مذاہب کو تہس نہس کر دینے کے پوشیدہ پلان کا ہی ایک حصہ ہے۔ یہاں ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام کے شیدائی یورپی دنیا کے اس شاطرانہ کھیل سے چشم پوشی اختیار کر کے دنیا کی وقتی چمک دمک اور عیش و آرام میں کھوئے ہوئے ہیں جو مستقبل میں خود ان کے لیے اور ان کی نسلوں کے لیے باعث ہلاکت ہی ثابت ہوگی۔ مارگریٹ تھیچر کی کتاب کو اسی نقطۂ نظر سے بار بار پڑھنے کے بعد کوئی آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے تو اس کی تباہی و بربادی کو کون روک سکتا ہے۔

ہندوستان کی بارہویں پارلیمنٹ کے الیکشن ہو رہے ہیں۔ اس میں کانگریس کے پروپیگنڈہ کے لیے شریمتی سونیا گاندھی بالآخر میدان میں کود ہی پڑیں۔ اور جیسے ہی انھوں نے انتخابی جلسوں کو خطاب کرنا شروع کیا عوام کا جم غفیر ان کے خطاب کو سننے کے لیے ٹوٹ ہی پڑا۔ ان کا سب سے پہلا خطاب جس انتخابی جلسہ میں ہوا وہ وہی جگہ تھی جہاں چھ سال پہلے ان کے شوہر راجیو گاندھی بم حادثہ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اخباری رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ شریمتی سونیا گاندھی کے خطاب کو سننے کے لیے اس قدر بھیڑ اکٹھی تھی کہ اس سے پہلے ایسی بھیڑ کسی کو بھی سننے کے لیے کبھی نہیں اکٹھی ہو سکی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں شریمتی سونیا گاندھی کی انتخابی تقریریں ہو رہی ہیں اور اس میں عوام کی اس قدر کثیر تعداد موجود ہوتی ہے کہ بڑے بڑے دانشور حیرت واستعجاب میں پڑ گئے ہیں۔ الیکشن کے ماہرین جو بارہویں پارلیمنٹ کے لیے الیکشن

میں کانگریس کو پچاس سیٹیں ہی ملنے کا اندازہ لگا رہے تھے اب انہوں نے اپنی یہ رائے اور اندازہ بدل دیا ہے۔ بعد ازیں جنتا پارٹی سونیا گاندھی کے منظر عام پر آنے سے سب سے زیادہ بوکھلا گئی ہے اور اس نے سونیا کے بارے میں اوٹ پٹانگ باتیں کہنا شروع کر دی ہیں۔ کبھی بوفورس کا معاملہ کھڑا کر دیا جاتا ہے تو کبھی سونیا گاندھی کے غیر ملکی ہونے کی بات کہہ کر ہندوستانی عوام کو گمراہ کیا جاتا ہے اور مسٹر جارج فرنانڈیز جو بھارتیہ جنتا پارٹی کے حلیف ہیں، نے تو آئندہ پارلیمنٹ میں اس طرح کا بل پاس کرانے پر زور دیا ہے کہ جو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا اس کے ہندوستان کے وزیر اعظم بننے پر پابندی لگا دی جائے۔ اور انہوں نے اس کے لیے امریکہ کے قانون کی مثال دے کر اپنی دلیل کو پختہ کرنے کی کوشش کی ہے اگر ہم مسٹر جارج فرنانڈیز سے الٹا یہی سوال کریں کہ ہندوستان میں غیر ملکی قانون کو نظیر بنا کر کوئی قانون بنانا، ہندوستان میں غیر ملکی قانون رائج کرنا کون سا صحیح قدم ہے؟ اور کیا جارج فرنانڈیز پر غیر ملکیت کا بھوت نہیں سوار ہے؟ (ان سطور کی تحریر کے وقت سونیا گاندھی نے الیکشن میں کھڑے ہونے سے قطعاً انکار کر دیا ہے)

اس الیکشن میں کانگریس کی طرف سے کچھ باتیں ایسی سرزد ہوئی ہیں جو مضحکہ خیز ہی ہیں اور جسے ہم کانگریس میں دانشمندی کا فقدان ہی کہنا زیادہ پسند کریں گے۔ بابری مسجد کا انہدام ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا بدنما داغ ہے جو شاید ہی کبھی دھل سکے۔ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد پوری دنیا کے سامنے ڈھا دی گئی اور ہندوستان کی فوج، پولیس، حکومت سب تماشائی بنے رہے اور عین الیکشن مہم کے دوران میں اپنے مینی فیسٹو میں اس پر معافی مانگی جا رہی ہے۔ یہ کس قدر دھوکہ، فریب، عیاری اور مکاری اور سب سے بڑھ کر چالاکی کی بات ہے۔ کانگریس شاید ہندوستانی مسلمانوں کو اس قدر بے وقوف سمجھ رہی ہے کہ وہ اس معافی نامہ کو قبول کر کے اسے معاف کر دیں گے۔ بڑے سے بڑا خالی الذہن انسان بھی اس موقع پر یہ سوال کیے بغیر نہیں رہے گا کہ اتنے دنوں بعد معافی، وہ بھی جب اسے اپنے مفاد کی بازیابی کی چاہت ہو کیا معافی کہی جا سکتی ہے۔ یہ تو ابن الوقتی والی بات ہے جس میں مطلب کے لیے گدھے کو باپ بنانے والی معلوم و معروف کہاوت دل و دماغ میں ایکدم تازہ ہونا قدرتی بات ہے

ہماری دعا ہے کہ ہندستان کی بارہویں پارلیمنٹ کے انتخابات بخیر و خوبی ہو جائیں اور یہ پارلیمنٹ پورے پانچ سال چلے جو پارٹی یا پارٹیاں برسر اقتدار آئیں وہ ملک و قوم کی صحیح معنوں میں خدمت کریں اور ہندستان سے بے روزگاری، دہشت پسندی، بدامنی، بدعنوانی کا مکمل طور پر خاتمہ کرنے میں لگ جائیں۔ ہندوستان کے تمام باشندوں میں مایوسی کے بجائے خوشی و مسرت پیدا ہو۔ مہنگائی جو اس وقت عروج پر ہے اس میں گراوٹ آجائے، ملک کا ہر باشندہ امن و امان کے ساتھ جی سکے اس کے لیے ہی ہر ممکن اقدامات کے لیے نئی حکومت مستعد عمل ہو جائے۔

دوسری اور آخری قسط

اقبال کا پیغام
عصر حاضر کے نام

از جناب مولوی قاری محمد بشیر الدین صاحب پنڈت ایم۔اے (علیگ)

علامہ اقبال اپنے وسیع مطالعہ اور صحیح ذوق و وجدان کی بنا پر اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں۔ اپنے مقالہ "فلسفۂ عجم" کے سلسلہ میں اقبال نے مغربی و مشرقی فلسفے کا نہایت گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ مغربی مفکرین میں افلاطون۔ اگسٹائن۔ سینٹ فرانسیس۔ اگناٹس لائیلا۔ میدام دی گابان براڈلے۔ الگزنڈر۔ ہیگل۔ نطشے۔ برگسان اور مشرقی صوفیا و حکماء میں امام غزالی، رومی، حافظ، شیخ سرہندی، شنکر آچاریہ، ریک ناتھ اور دکمبر وغیرہ کے خیالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ اس وسیع مطالعہ نے اقبال پر ایک بات بہت واضح کر دی اور وہ یہ کہ "قرآن ہدایتِ انسانی کے لیے آخری صحیفہ ہے" وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انسان اس کا مطالعہ خشوع و خضوع سے کرے تو اس پر کائنات کے تمام اسرار سربستہ کھل جائیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ ختم نبوت کے لیے وہ ایک انوکھی دلیل سے کام لیتے تھے، ان کا کہنا ہے کہ محمد رسول اللہ پر نبوت اس لیے ختم ہو گئی کہ انہوں نے انسانیت کو ایک ایسا نظامِ زندگی دیا جو عقل پر مبنی ہے۔ معجزات کی ضرورت اب اس لیے باقی نہیں کہ انسانی عقل اب اپنی فلاح و بہبود کے وسائل خود متعین کر سکتی ہے۔ قرآن کی تعلیمات اور عقل انسانی میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں

ہے۔ انسانی نشوونما کے لیے جن بنیادی قوانین اور اصولوں کی ضرورت ہے وہ دے دیے گئے ہیں ان اصولوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی البتہ ان کی روشنی میں ضرورت زمانہ کے مطابق اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اقبالؔ کی نظر میں عہد حاضر کا انسان جو قلب و نظر کے امراض فاسدہ میں مبتلا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کے پیش کردہ دین فطرت یعنی اسلام کے اصولوں کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور نتیجہ کے طور پر تشکک ولادینیت، جبریت وذواقیت کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ آیئے کچھ دیر کے لیے اقبالؔ کے ساتھ ان روحانی امراض پر ایک نظر ڈالیں۔

(۱) تشکیک ولادینی: تہذیب حاضر کے زیر اثر جو نسل پیدا ہوئی ہے اس کی نظر میں مذہب ایک "جنونِ خام" ہے اور "ہستی غایب" کی تلاش کرنے والے احمق و نادان ہیں۔ علوم جدیدہ کی بنا محسوس پر ہے۔ اس لیے موجود وہی ہے جو محسوس ہے۔ حقیقت کا علم ہمیں ادراک، مشاہدہ اور ارتسام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور ہمارے تمام تصورات ان ہی ارتسامات کی نقول ہیں گویا ارتسام تصور کی اصل ہے۔ بالفاظ دیگر ہمارے لیے حقیقی چیز وہی ہو گی جس کو ہم محسوس کریں مذہب کا معروض "ہستی غایب" ہے جس کا کوئی ادراک یا احساس ممکن نہیں لہٰذا اس کا کوئی علم قابل حصول نہیں اس کی تلاش ایک سیاہ بلی کی تلاش ہے جو ایک تاریک کمرہ میں کی جارہی ہے جو اس کمرہ میں موجود نہیں ہے۔" یہ ہے استدلال دور حاضر کے نوجوان انسانوں کا جو اپنا مسلک مذہب کے خلاف انتہائی تجربیت یا احساسیت کو قرار دیتے ہیں۔ اقبالؔ نے اس کو اس طرح ادا کیا ہے۔

تعلیم پیر فلسفۂ مغربی ہے یہ ۔۔۔ ناداں ہیں جن کو ہستی غایب کی ہے تلاش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی ۔۔۔ اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے ایک جنونِ خام ۔۔۔ ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور ۔۔۔ مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش
باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ۔۔۔ ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

"بے جنوں مباش" ہی میں حقیقتاً انسانیت کی فلاح و بہبود ہے لیکن بقول حسرتؔ مرحوم۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آج مذہب سے بے زاری کا نتیجہ یہ ہے کہ عصر حاضر کے نوجوان کے لیے نہ زندگی کی کوئی غایت ہے اور نہ تخلیق کائنات کی کوئی غرض یا مقصد بلکہ وہ اس سوال ہی کو لایعنی سمجھتے ہیں کہ کیا زندگی کی کوئی غایت ہو سکتی ہے اور عالم کا کوئی مقصد؟

مسلمانوں کی نئی پود میں لادینی اور الحاد کے اسی میلان کو علامہ اقبالؔ نے "فردوس بریں" کی مشہور نظم میں مکالمہ کی صورت میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز — حالیؔ سے مخاطب ہوئے یوں سعدیؔ شیراز
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیاں کر — وا ماندہ منزل ہے کہ مصروف تگ و تاز
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں — تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمی آواز
باتوں سے ہوا شیخ کے حالیؔ متاثر — رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعجاز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی — فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیرو زمیں تاز
پانی نہ ملا زمزمہ ملت سے جو اس کو — پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

الحاد کے انداز پیدا ہوتے ہی کردار میں تغیر کا رونما ہونا ضروری تھا۔ اوامر نواہی کی پابندی اور رضائے الٰہی کا خیال، سزا کا خوف اور جزا کی امید، یہ سب محرکات ہمارے عصر حاضر کے نوجوانوں کے نزدیک نہ قابل التفات ہیں اور نہ لائق توجہ۔

جدید نفسیات یا تحلیلی نفسیات (Psycho- Analysis) نے نوجوانوں کو تعلیم دی ہے کہ ذہن انسانی کا بیشتر حصہ غیر شعوری ہے انسانی شخصیت کی مثال برف کے اس انبار کی سی ہے جو سمندروں میں بہتا رہتا ہے اس کا صرف تھوڑا سا حصہ سطح کے اوپر نظر آتا ہے باقی سب نیچے پوشیدہ ہوتا ہے یہ حصہ جس کو غیر شعوری نفس کہا جاتا ہے نہ صرف نسبتاً زیادہ بڑا بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی نفس شعوری سے کہیں زیادہ عظیم الشان ہوتا ہے۔ شعور میں جو کچھ نمایاں ہوتا ہے وہ غیر شعوری نفس ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کے ذہن کا شعوری حصہ اہمیت کی چیز نہیں اس لیے کہ اس کا سارا مواد اور اس کے سارے اعمال و وظائف ان قوتوں کے اظہار ہیں جن کا نہ ہمیں عام طور پر علم ہوتا ہے اور نہ یہ ہمارے تصرف و اختیار میں ہوتے ہیں۔ اس طرح جب کسی غیر شعوری خواہش کا ظہور شعور میں ہوتا ہے تو وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی لہٰذا ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہیں ہماری سیرت نتیجہ ہے ان تاثرات، تحریصات، ترغیبات اور قوتوں کے باہمی

عمل یا افعال کا جو غیر شعوری نفس میں جاری ہیں اور جن کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ اگر ہم سے کہا جائے کہ ہمیں ضبط نفس سے کام لینا چاہیے۔ بُری خواہشات کو دبانا چاہیے اور ان کی نفی کرنا چاہیے تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

اگر ہم ان کے ضبط پر قادر بھی ہوں تو جدید نفسیات کی تعلیم ہے کہ ان کی نفی یا ان کا دبا دینا ہماری ذہنی صحت کے لیے سخت مضر ہوتا ہے۔ آسکر وائلڈ کا کہنا ہے کہ کسی خواہش نفسی سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی تکمیل کر لی جائے۔

ہماری توانائی و قوت کے مبداء اصلی کو جو ڈی بی ڈو (Dibido) کہلاتا ہے فرائیڈ اس کو چشمہ آب سے تشبیہ دیتا ہے جو زمین کے نیچے بہہ رہا ہے اور کسی مخرج کی تلاش میں ہے اگر تم اس چشمہ کو پشتہ لگا کر روک دو اور اس کے پانی کو بہہ کر نکلنے کا موقع نہ دو تو پھر یہ بند ہو کر کیچڑ پیدا کرتا ہے یہ کیچڑ گویا مؤلفات (Complexes) ہیں اور بخارات عہد حاضر کی زندگی کے وہ بے شمار عصبی امراض (Neurosis) اور سقیم خوف (Phobias) جن کا نفسی تحلیل علاج کرنا چاہتی ہے اور علاج کا طریقہ بس یہی ہے کہ ان رکی دبی خواہشات کو ظاہر ہونے دیا جائے۔

لیکن اس کے بر خلاف دین و مذہب کی روح تو یہ ہے کہ اوامر الٰہی کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کی کوشش کی جائے۔ اور جدید نفسیات کی تعلیم یہ ہے کہ خواہشات کو بے لگام رکھنا ہی صحت ذات کے لیے ضروری ہے اسی ہوس رانی کا اصطلاحی نام اظہار ذات (Self-Expression) ہے جس کو (D.H.Lawrence) وغیرہ کے ناولوں نے عام فہم بنا دیا ہے۔

بہر حال ان تعلیمات و خیالات نے مذہب اخلاق کی بیخ کنی کر دی۔ نوجوان کے قلوب مسخ ہو گئے، دل تیرہ اور نگاہ بے باک ہو گئی۔ ان کی عقل اور ان کا دل "طواف آب و گل" میں گرفتار ہو گیا۔ "جاوید نامہ" میں اسی حالت کا نقشہ ان دردناک الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

روزگارے را کہ می آید نگر   گر خدا سازد ترا صاحب نظر

چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز   عقلہا بے باک و دلہا بے گداز

زوج زوج اندر طواف آب و گل   علم و فن دین و سیاست عقل و دل

آگے چل کر کچھ اور وضاحت کی گئی ہے ؎

نوجواناں تشنہ لب خالی ایاغ شستہ رو تاریک جاں روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید

نوجوانوں نے دین فطرت کو ہاتھ سے کھو کر اور عقل واستدلال کو اختیار کر کے کیا پایا؟ مادی عقل نے ان کے قلوب میں کیا انقلاب پیدا کر دیا؟ ان کے نقطۂ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چار سو ان کے لیے کیسے بدل گئے۔ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا۔

جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک

یعنی روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی اس کے عوض تن میں فربہی پیدا ہونے لگی لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی اور عفت ان سے رخصت ہو گئی

(۲) جبریت : جدید تحلیلی نفسیات کی تعلیم کے بارے میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے تمام شعوری ارادات و واقعات کا مبداء اصلی غیر شعوری نفس ہے گویا ہماری خواہشات اور افکار عکس میں ہمارے غیر شعوری عناصر کا جو غایب و غیر معلوم ہیں اور ہمارے اختیار سے باہر اس لیے ہم اپنے شعوری افکار وخواہشات کے ذمہ دار نہیں۔ لہٰذا پرستان مذہب واخلاق کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے اور وہ ہمارے افکار وخواہشات پر حکمرانی کرتا ہے انہیں اپنے اقتدار میں رکھتا ہے جو خواہشات کہ ہماری روح کے مفاد کے خلاف ہوتی ہیں انہیں ترک کر دیتا ہے اور جو اس کی فلاح کی معاون ہوتی ہیں انہیں کو اختیار کرتا ہے صحیح یہ ہے کہ جبلتیں ہی انسانی اعمال کی حقیقی محرکات ہیں اور انہیں جبلتوں کی تشفی کے لیے ہم عمل کرتے ہیں جن پر ہمیں کوئی اقتدار حاصل نہیں اس لیے "اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا" ہمیں اپنے حال پر رہنے دے یہ ہے عقیدۂ جبریت آج انسان کے اندر جبریت کا اثر "عقیدۂ تقدیر" کی غلط فہمی کی وجہ سے زہر کی طرح سرایت کر گیا ہے اور ان کے عمل کی قوت کو مفلوج کر دیا ہے۔ نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت رہی اور نہ سالک میں مستی کردار۔ شاعر کی نوا افسردہ و بے ذوق ہو کر رہ گئی۔ مرد مجاہد مفقود ہو گیا۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

تقدیر کے غلط عقیدے نے خاص کر مسلمانوں کو عمل سے غافل کر دیا۔ قسمت ہی میں ایسا لکھا تھا کہ کروز ندگی کی کشمکش سے کنارہ کش ہو گیا اور اپنی شکست تسلیم کرلی

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی　　اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

لذت اندوزی: اگر ہم عمل و مجاہدے سے اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتے اگر ہم اپنے مستقبل کے سنوارنے میں اتنے ہی مجبور ہیں جتنے کہ اپنے ماضی کے بدلنے میں تو پھر ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے وہ جیسی بھی کچھ ہے پوری طرح بہرہ اندوز ہونا چاہیے اور جو کچھ مل جائے اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے اسی کو کہتے ہیں "اگر زمانہ نسازد تو بازمانہ بساز۔" یہیں سے لطف اندوزی کی بنا پڑتی ہے۔ عصر حاضر نے اس کو یہ تعلیم دی کہ مذہب کا یہ فرمان کہ انسان کو ہوائے نفسانی کی مخالفت کرنی چاہیے اور خواہشاتِ طبعی کو شرع کے تحت رکھنا چاہیے نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ شخصیتِ انسانی کے لیے قطعاً مضر بھی ہے۔ فرائڈ نے ذرا تفصیل سے بتایا کہ موجودہ زمانہ کی بے شمار ذہنی بیماریاں، عصبی امراض، ہسٹریا اور زندگی سے بیزاری اور عدم طمانیت نتیجہ ہیں فطری خواہشات کو دبانے اور روکنے کا۔ صحت و طمانیت کے لیے انکار ذات نہیں بلکہ اظہار ذات کی ضرورت ہے، نقد وقت کو ہاتھ سے کھونا شخصیت کی عمارت کو جڑ سے اکھاڑنا ہے اس لیے عصر حاضر کا انسان اس عقیدہ کا پورا قائل نظر آتا ہے کہ اوقات فرصت کو لذت اندوزی میں صرف کرنا چاہیے وہ ان افعال و اعمال کو لذت بخش تصور کرتا ہے جو ہوائے نفسانی کی تکمیل کرتے ہیں جو ظاہر ہے جنسی خواہشات، رقص و سرود اور لہو و لعب کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ خوشی و راحت محض نفس کی خاطر ہے زندگی کے فرائض کو انجام دینے کی خاطر نہیں۔ مختصر یہ کہ عصر حاضر کا نوجوان اقبالؔ کے الفاظ میں بدن ہی میں غرق ہے اور جان سے بے خبر۔

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں　　در بدن غرق است و کم اندوز جاں

اقبالؔ اس قوم کو اور اس قوم کے افراد کو جنہیں "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ" یعنی تم بہترین گروہ ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان و یقین رکھتے ہو کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا انہیں عصری آلودگیوں میں پھنسا ہوا دیکھتے ہیں تو خون کے آنسو بہاتے ہیں اور درد و اضطراب کی حالت

میں ان کے مہلک امراض یعنی ان کے ظلمت آباد سے چراغ ضمیر کو، ان کی غلامی اور حریت و شکنی کو، ان کی لادینی و الحاد کو ان کی فرنگ مستی اور اپنی نوعیت و حقیقت سے بیگانگی کو ان کی بزدلی اور موت سے خوفزدہ ہونے کو ان کی لذت پرستی اور عیش کوشی کو، یورپ کے باطل عقائد اپنے قلب کی پہنائیوں میں جگہ دے کر اور پھر ان کے آگے سجدہ ریز ہونے کو کس درد کے ساتھ سرور دوعالمؐ کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور دعا طلب کرتے ہیں۔

این مسلماں زادہ ٔ روشن دماغ　　ظلمت آباد، ضمیرش بے چراغ
مکتب از وے جذبہ دیں در ربود　　از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
مومن از رمز مرگ آگاہ نیست　　در دلش لا غالب الا اللہ نیست
از فرنگی می خرد لات و منات　　مومن و اندیشہ ٔ او سومنات
قم باذنی گوئے او ٔ را زندہ کن　　در دلش اللہ ہو را زندہ کن

نژادِ نو کو خطاب کر کے "جاوید نامہ" میں اقبال نے جو نصیحت کی ہے اس کا حاصل بس اتنا ہے کہ سادہ دلوں کے یقین کو فلسفیوں کے نکتہ ہائے دقیق پر ترجیح دے کر بے دلیل و برہان از روئے جان یعنی قلب کی گہرائیوں سے اپنے خالق کی الوہیت اور محمدؐ عربی کی رسالت کا اقرار کر لے۔

اقبال کے نزدیک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان کامل نہ ہونے کی وجہ سے آج دنیا مختلف قسم کے ذہنی و دماغی اور معاشی و عمرانی امراض میں مبتلا ہے۔ دنیا کی اکثر و بیشتر قومیں تو صرف ابھی لا کی منزل سے گزر رہی ہیں الا اللہ سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اقبال کو تہذیبِ حاضر سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اس کی مجلس میں صرف شراب لا کا دور چل رہا ہے الا اللہ کی بوتل کا کہیں پتہ نہیں۔

لبالب شیشہ ٔ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے　　مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ ٔ الا

لا بیشک نقش باطل کو مٹاتا ہے لیکن اس کے بعد نقش حق بھی ثبت کرنا چاہیے ورنہ متاع حیات فوت ہو جائے گی۔

در مقام لا نیاساید حیات　　سوئے الا می خرامد کائنات

جو قومیں صرف لا کا وظیفہ پڑھتی ہیں وہ اپنی طاقت انسانوں کو [illegible]

[illegible] جب حد سے گزر جاتی ہیں تو خود تباہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے   نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

اس لیے نفی کے بعد اثبات کرنے سے ہی زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اعتدال بنی آدم کے حق میں رحمت ہوتا ہے

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کے چار صفحات کے اندر علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں " لاالٰہ الا اللہ " کی تفسیر پیش کی ہے جس کی تفصیلات خالی از طوالت نہیں لیکن اجمالاً دو ایک باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں، فرماتے ہیں ؎

نکتہ می گویم از مردان حال   امتاں را لا جلال الا جمال

یعنی توحید کی اصلیت و حقیقت سمجھنے کے لیے قال کی ادنیٰ منزل سے گزر کر حال کی منزل ارفع میں داخل ہونے کی ضرورت ہے جو لوگ اس تہ سے آشنا ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ع امتاں را لا جلال الا جمال۔ جلال سے مراد ہے قاہری اور جمال سے مراد ہے دلبری۔ قاہری دل میں خوف پیدا کرتی ہے اور دلبری دل میں محبت پیدا کرتی ہے اور یہ دونوں حیات انفرادی اور حیات اجتماعی کے لیے ضروری ہیں یعنی زندگی کی دو شانیں ہیں جن کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی قاہری و دلبری دونوں ایک ذات میں جمع ہو جائیں تو انسان میں پیغمبری کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن صرف دلبری جادوگری ہے اور صرف قاہری ابلیسیت ہے۔

دلبری با قاہری پیغمبری است   دلبری بے قاہری جادوگری است

اسی طرح جب کوئی قوم لاالٰہ کا نعرہ بلند کرتی ہے خواہ وہ جرمنی ہو یا رومی، انگلشی ہو یا امریکن، روسی ہو یا کوئی اور تو وہ اپنے اقوال و افعال سے "دیگرے نیست" کا اثبات کرتی ہے اس سے فرد و قوم دونوں کے اندر بے پناہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے اسی طاقت کا دوسرا نام جلال ہے لیکن جب کوئی قوم قاہری یا جلال کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ لاالٰہ کے بعد الا اللہ بھی ہے تو وہ [illegible] صفات حسنہ کی حامل بن جاتی ہے۔ اس [illegible] مکمل بن جاتی ہے اور [illegible]

چاہتی ہے۔ انفرادی طور پر جلال کو مع جمال دیکھنا ہو تو عمر فاروق اور حیدر کرار کی سیرت پر نظر ڈالیے اور جلال کو بغیر جمال کے دیکھنا ہو تو اس کی کیفیت مہدی سوڈانی کی استخوان سوختہ سے پوچھیے یا چنگیز و ہٹلر میں دیکھیے، حیدر کرار کی خودی کو جس کے اقبال مؤید ہیں حضور اکرمؐ کے حسین و جمیل ہاتھوں نے بنایا اور سنوارا ہے، ہٹلر کی خودی کو نطشے نے ترتیب دیا ہے وہ نطشے جس کے متعلق اقبال کہتے ہیں ۔

حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم ۔۔۔ نگاہ چاہیے اسرار لا الہ کے لیے
خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند ۔۔۔ کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی ۔۔۔ ترس رہی ہے مگر لذت گنہ کے لیے

نطشے کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہی ان تمام مشرقی و مغربی مفکرین و مصلحین پر منطبق کیا جاسکتا ہے جو کلمۂ توحید کے اسرار سے بے بہرہ ہیں نطشے کا "فوق البشر" عقلیت کا پجاری، عشق سے عاری اور ایمان سے خالی ہے اس کے نزدیک رزم گاہ حیات میں نیکی نہیں بلکہ قوت درکار ہے تاکہ کمزوروں پر غلبہ کیا جاسکے، وہ اخلاقی خوبیوں کو کمزوری پر محمول کرتا ہے اور خیر و شر کو محض اضافی حیثیت دیتا ہے۔ وہ دراصل "بقائے اصلح" کے بجائے "بقائے اقویٰ" کا قائل ہے اس کے برخلاف اقبال کے "انسان کامل" کا خمیر دین فطرت کی مٹی سے بنا ہے جس میں بہت سے اجزاء شامل ہیں۔ اس کا انسان کامل خودی کا پیکر ہے۔ عشق کا حامل ہے وہ عشق جہاں عقل کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور ذوق وجدان کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے۔ وہ حیات و حرکت کا مجسمہ ہے۔ اور شریعت نبوی کا پابند۔ اس کا ایمان تابندہ، اس کی آرزو زندہ اور اس کا عزم و استقلال پائیدار۔ وہ دنیا کا بادشاہ ہے لیکن ایک مرد قلندر ہے جو روحانی قدور کے سامنے دنیا کی ہر چیز ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ "بقائے اقویٰ" کے بجائے "بقائے اصلح" کا قائل ہے وہ قومی حاکم نہیں بلکہ انسانیت کا علمبردار ہے۔ بہر حال اقبال تو عصر حاضر کے انسان کو "مرد قلندر" دیکھنا چاہتے ہیں جس کی پہچان اسے بلیغ شاعرانہ انداز میں ضرب کلیم کے صفحات میں اس طرح پیش کی ہے ۔

کہتا ہے زمانہ سے یہ درویش جواں مرد ۔۔۔ جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا ۔۔۔ چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا

توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا ‌ ‌ ہے تجھ میں مکر جانے کی عادت تو مکر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ‌ ‌ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

اب یہ فیصلہ کرنا عہد حاضر کے انسان کا کام ہے کہ وہ "مرد قلندر" بننا چاہتا ہے یا "فوق البشر" انسان وما علینا الا البلاغ

دوسری قسط

زمینداری اور جاگیرداری کا

تاریخی پس منظر

از جناب مولوی تقی الدین صاحب بہاری

قطائع

خلافتِ راشدہ میں ایک قسم ان آراضی کی ملتی ہے جو مفادِ عامہ کے پیش نظر خلافت کی جانب سے لوگوں کو دی جاتی تھیں جس کو کلام عرب میں "قطائع" کہتے ہیں۔

اس انتظام کی دو صورتیں رائج تھیں۔

(۱) کاشت کے لئے کسی کو زمین دی جاتی اور وہ خود کاشت کرتا۔

(۲) اگر مفادِ عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہونے کی بناء پر وہ کاشت نہ کر سکتا تو دوسرے کے ذریعہ کاشت کرواتا اور آمدنی یا پیداوار میں دونوں شریک ہوتے۔

خلافت کی جانب سے اس عطیہ کی کبھی تو یہ شکل ہوتی کہ صرف زمین کی منفعت کا مالک بنادیا جاتا نفس زمین پر کسی قسم کے تصرف بیع، ہبہ وغیرہ کا اختیار نہ ہوتا اور کبھی زمین کی ذات اور منصب منفعت دونوں کا مالک بنادیا جاتا۔ اس صورت میں ہر قسم کے تصرف بیع، ہبہ وغیرہ کے اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے لیکن قطائع کی کوئی شکل بھی سرکاری قانون اور تملیک سے مستثنیٰ نہ تھی بلکہ اجتماعی مفاد کے پیش نظر خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دوسری زمینوں کے قطائع پر

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بہت سے ایسے قطائع تک واپس لے لئے۔ جو پیغمبر اسلام نے اپنے عملیں اور صحابیوں کو عطا فرمائے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا دینا بھی مفاد عامہ کے پیش نظر تھا اور فاروق اعظم کا واپس لینا بھی اسی مقصد کی تکمیل کرنا تھا۔

اس بحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زمانۂ خلافت کے قطائع کی اصل حقیقت واضح ہو سکے اور یہ معلوم ہو سکے کہ بعد میں اس کی اصل صورت کیسے مسخ ہوئی۔ اور اب اس لفظ کو موجودہ زمینداری اور جاگیرداری کی حمایت میں کس بُری طرح آلۂ کار بنایا جارہا ہے۔

قطائع کی تعریف

خلافت راشدہ میں قطائع کی جو نوعیت تھی اس کے پیش نظر اس طرح تعریف کی جاسکتی ہے

"مفاد عامہ کے پیش نظر غیر آباد زمین کو آباد کاری کے لئے کسی کو دینا اور حسب حاجت و مصلحت سرکاری ٹیکس وصول کرنا۔"

چنانچہ اس کی تائید فقہاء متقدمین کے اس قول سے ہوتی ہے

"الاقطاع اعطاء الارض للاحیا سواء وجب فیه العشاء او الخراج" — "اقطاع" کسی آباد کاری کے لیے زمین دینا چاہے اس میں عشر واجب ہو یا خراج

ذیل کی تصریحات سے بھی کسی حد تک اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس بارے میں علامہ مقریزی کلام عرب کا یہ محاورہ نقل کرتے ہیں۔

"اقطعه نهرا و ارضا اباح له ذلك" — نہر اور زمین قطیعہ دیا یعنی اس کے لیے مباح کر دیا

عبداللہ بن محمد شارح بخاری کہتے ہیں:

"اقطاع" قطیعہ کی جمع ہے خلیفہ کے قطیعہ دینے کی یہ شکل ہے کہ جس شخص میں اہلیت دیکھے اللہ کے مال میں سے کچھ حصہ خلافت کی جانب سے اس کو عطا کرے۔ اکثر اس لفظ کا استعمال زمین کے بارے میں

ہے اور اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو زمین کی ذات اور منفعت دونوں کا مالک بنا دیا جائے یا صرف منفعت
ملک بنا دیا جائے ذات کا نہیں[1]

قاضی ابو بکر بن عربی شارح ترمذی کہتے ہیں :

"اقطاع" یہ ہے جس میں ایک کا حصہ دوسرے شرکاء سے جدا کر دیا جاتا ہے کیونکہ آراضی میں تمام
...شریک ہیں[2]

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کہتے ہیں :

"خلیفہ کو قطیعہ دینا جائز ہے اس کی دو صورتیں ہیں یا تو زمین کا مالک بنا دے یا مالک نہ بنائے صرف انتفاع کا
حق دے[3]

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "قطائع" کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ
...شخص کو آباد کاری کے لئے خلافت کی جانب سے آراضی دی جائے۔

...قسم کی آراضی دی جاتی تھیں

احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قسم کی آراضی ایسی ہوتی تھیں جو خلافت کی
...ب سے بطور قطیعہ دی جاتی تھیں۔

(۱) بنجر زمین جو ہمیشہ سے غیر مزروعہ اور غیر آباد چلی آتی تھیں۔ ان کی ویرانی اور سختی دیکھ
...عام لوگوں کو انہیں قابل کاشت بنانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، خلافت نے ایسی زمینوں کی طرف
...جہ کی اور انہیں قابل کاشت بنانے کے لئے لوگوں میں تقسیم کر دی چنانچہ "نقیع" میں جو زمین
...رت زبیرؓ کو دی گئی تھی وہ اسی زمین سے تھی۔[4]

(۲) افتادہ زمین جو قابل زراعت ہونے کے باوجود کسی وجہ سے زیر کاشت نہ ہو۔

اس میں تمام وہ زمینیں شامل تھیں جو بستیوں کے اجاڑ ہو جانے کے بعد بے کار پڑی تھیں اور
...ئی آباد کرنے والا نہ رہا۔

مدینہ کی وہ زمینیں بھی اسی میں شامل تھیں جو آبپاشی کی دشواری کی وجہ سے پیغمبر اسلام کے
...الہ کر دی گئیں تھیں۔ بلال بن حارث کو رسول اللہ نے "وادی عقیق" اسی زمین سے عطا فرمائی
...۔

[1] ...دۃ القاری ج ٦ ص ٣٦ [2] عمدۃ القاری ج ٦ ص ١٥٠ [3] فیض الباری [4] مسعودی ص ٢٠٥ ...

(۳) خالصہ (سرکاری) زمین۔ مفتوحہ علاقہ کی تمام وہ زمینیں جو خلافت کے لئے "خالصہ" قرار دی جاتی تھیں جن کی تفصیل یہ ہے
(۱) جن آراضی کے مالک جنگ میں مارے جاتے۔
(ب) یا بھاگ جاتے۔
(۲) شاہی جاگیریں جو بادشاہ کے صرف خاص کے لئے خالصہ ہوتی تھیں۔
(۵) شاہی خاندان اور افسران کی جاگیریں۔
(۰) ترائی، جھیلیں، جھاڑیاں وغیرہ۔
یہ اور اسی قسم کی تمام وہ زمینیں جن پر چند افراد قابض ہو کر عیش کرتے تھے اور اسلام کے بعد ان کا کوئی مالک اور آباد کرنے والا نہ رہتا تھا خلافت کے لئے "خالصہ" ہو جاتی تھیں۔[۲]

ابو عبید "خالصہ" کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں :

فلم یبق بہا ساکن و لا لہا عامر مکان حکمہا الی الامام[۳]	مذکورہ آراضی میں نہ کوئی رہنے والا تھا اور نہ آباد کرنے والا اس لیے ان کا معاملہ خلیفہ کے سپرد تھا (خالصہ ہو گئی تھیں)۔

قاضی ابو یوسف کہتے ہیں :

وذلک بمنزلۃ المال الذی لم یکن لا حد و لا فی ید احد[۴]	اس زمین کی حیثیت اس مال جیسی تھی جو نہ کسی کا ہو اور نہ کسی کے قبضہ میں ہو۔

حاصل یہ ہے کہ زمانۂ خلافت میں انہی آراضی سے "قطائع" دیئے جاتے تھے جو کسی کے قبضہ میں نہ ہوں نہ ان کا کوئی مالک اور وارث ہوتا۔ کسی کے آباد کرنے کا کوئی نشان نہ ہوتا اور نہ ایسی زمین ہوتی جو قانونا کسی کو نہ دی جا سکتی تھی مثلاً چراگاہ، جنگل، نمک کی جھیل وغیرہ اور نہ ایسی صورت ہوتی جس میں کسی کا نقصان ہوتا۔[۵] ایسی زمینوں کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو بیکار پڑی رہتیں اور مفاد عامہ جو زمین سے متعلق ہیں پامال ہوتے رہتے اور یا وہ صورت اختیار کی جاتی جو مفاد عامہ کے لحاظ سے مناسب اور بہتر ہوتی خلافت نے نفع خلق کے پیش نظر دوسری صورت اختیار کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ زمانۂ خلافت میں تمام بنجر و افتادہ زمینیں آباد ہو گئی تھیں اور

[۱] الاموال ص ۲۸۲ [۲] الاموال ص ۲۸۲ والخراج ص ۵۷ و ص ۵۸ [۳] الاموال ص ۲۸۲ [۴] الخراج ۵۷ [۵] الخراج ص ۵۹

آباد شدہ زمینوں سے غلہ اگنے لگا تھا۔

کس مقصد سے دی جاتی تھیں

"قطائع" دینے کا مقصد زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا اور خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا۔ جب تک یہ مقصد پورا ہوتا رہتا خلافت کو کوئی دخل دینے کی ضرورت نہ تھی لیکن اگر اس میں کوتاہی ہوتی یا آراضی کے تنظیم کی اس سے عمدہ صورت سامنے آتی جس میں نفع خلق زیادہ معلوم ہوتا تو خلافت کو بے دخل کر دینے کا پورا حق تھا۔ چنانچہ تاریخ خلافت میں چند ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں بلا پس و پیش اسی نظریہ کے ماتحت اہل زمین کو بے دخل کر دیا گیا تھا۔

چند یہ ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارثؓ کو پوری "وادی عقیق" دے دی تھی لیکن وہ اس کا بڑا حصہ آباد نہ کر سکے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ نے یہ زمین آپ کو اس لئے نہ دی تھی کہ نہ خود آباد کریں اور نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں جتنی آپ آباد کر سکتے ہوں اپنے پاس رکھئے اور بقیہ واپس کیجئے حضرت بلالؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ کی دی ہوئی زمین کبھی واپس نہ کروں گا آخر حضرت عمرؓ نے آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر بقیہ زمین واپس لے لی۔[۱]

اس موقع پر قابل غور بات یہ ہے کہ بلال بن حارثؓ رسول اللہ کے قریب ترین صحابی تھے اور زمین کا عطیہ خود رسول اللہ نے دیا تھا جس کے ساتھ لگاؤ ہونا فطری بات تھی مگر فاروق اعظمؓ نے مفاد عامہ کے پیش نظر نہ حضرت بلال جیسے جلیل القدر صحابی کا خیال کیا اور نہ اس جذبہ کا کہ رسول اللہ کا دیا ہوا عطیہ کس طرح واپس لیں۔

یہ واقعہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ خلیفۃ اللہ کے سامنے خلق اللہ کا عام مفاد ہوتا تھا وہ اس کے لئے نہ اپنے بزرگ ساتھیوں کے ساتھ کسی قسم کا بھی سلوک کرنے کے لئے تیار تھا اور نہ محض جذباتی امور سے متاثر ہو کر عام مفاد کو نظر انداز کر سکتا تھا۔

جب رسولؐ کا دیا ہوا عطیہ بلالؓ جیسے بزرگ سے واپس لیا جا سکتا ہے تو دیگر عام لوگوں کے پاس سے بیکار زمین واپس لینے میں کیسے غور و فکر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

(۲) رسول اللہ نے ایک اور شخص کو زمین دی تھی حضرت عمر نے آباد کئے ہوئے حصہ

[۱] الاموال ص ۲۹۰ و الخراج یحییٰ ص ۹۳

[illegible] کے سپرد کی گئی تھی۔

(۲) [illegible] واقعہ اوپر گزر چکا ہے فاروق اعظمؓ نے خالصہ زمین کا کچھ حصہ ان کو دے دیا تھا [illegible] وہ آباد بھی کرتے رہے لیکن جب نفع خلق کے پیش نظر اس سے عمدہ صورت [illegible] واپس لے لیا۔

(۳) فاروق اعظمؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا عام قانون کے تحت مسلمانوں کو زمین جائداد سے بے دخل کر کے وظیفہ مقرر کر دینا اس بات کی شہادت کے لئے کافی ہے کہ حکومت الٰہی میں قطائع دینے کا سلسلہ عام مفاد کے پیش نظر اور پیداوار بڑھانے کے لئے تھا جب تک قطائع کے باقی رکھنے میں یہ مقصد پورا ہو تا باقی رکھے جاتے ورنہ جس صورت کے اختیار کرنے میں نفع خلق زیادہ نظر آتا حتی الامکان ذاتی مفاد کو طوطاق رکھ کر وہی صورت اختیار کرنے کی پوری گنجائش تھی، اس نظریہ کی مزید وضاحت ان اصولوں سے ہوتی ہے جو قطائع کے بارے میں نافذ تھے۔

کن لوگوں دی جاتی تھیں

حکومت الٰہی میں انہی لوگوں کو قطائع دیئے جاتے تھے جو کاشتکار تھے یا جن کے ذمہ مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی تھی۔

اس بارے میں علامہ مقریزیؒ اور قاضی ابو یوسف یہ کلیہ بیان کرتے ہیں:

"پیغمبر اسلام اور آپ کے جانشینوں نے انہیں لوگوں کو قطائع دیئے تھے جن کے دینے میں ملک و ملت کی بھلائی تھی۔"[۲]

علامہ بدرالدین عینیؒ کہتے ہیں۔

"خلیفہ کے قطائع دینے کی شکل یہ ہے کہ اللہ کے مال سے ان لوگوں کو "عطایا" دے جس میں ان کی اہلیت دیکھے۔"

ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جن لوگوں میں آبادکاری اور کاشتکاری کی صلاحیت ہوتی۔

(۲) جن کے ذمہ مفاد عامہ کی کوئی خدمت سپرد ہوتی۔

(۳) فوجی اور عام لوگ جو ملک و قوم کی حفاظت پر مامور ہوتے۔

[illegible] مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو [illegible] ص ۲۰،۲۲،۲۳

(۴) نو مسلموں کو تالیف قلوب کے لئے۔ بسا اوقات لوگ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو بے گھر اور محتاج پاتے تھے۔ گذر بسر کی کوئی شکل نہ ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں خلافت قطائع دے کر ان کو کسب معاش کے قابل بناتی تھی تاکہ دوسروں کی دست نگری سے محفوظ رہ کر آزادانہ اپنی صلاحیتوں کو نشو و نما دے سکیں۔ نو مسلموں کے ساتھ اس حسن سلوک کو دیکھ کر غیر مسلموں کو سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا اور اسلام قبول کرنے کے لئے راہیں کھلتی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ خلافت کے سامنے "قطائع" کا مقصد خلق اللہ کے لئے زیادہ پیداوار حاصل کرنا تھا اس لئے عام طور سے انہیں لوگوں کو دئے جاتے جو زمین کو زیر کاشت لا کر پیداوار بڑھا سکتے تھے اور اسی وقت تک باقی رکھے جاتے جب تک مقصد اجازت دیتا تھا۔

اسی بناء پر قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

ولولا ذلك لم يا توه و لم يقطعوا حق مسلم و لا معاهد	اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو رسول اللہ اور خلفا کسی کو کسی مسلمان یا معاہد کا حق نہ دیتے کیونکہ زمین میں سب شریک ہیں۔

کتنی مقدار دی جاتی تھی

اس سلسلہ میں تاریخ خلافت کا مطالعہ کرنے سے پہلے بنیادی طور پر چند باتیں پیش نظر ہونی چاہئیں۔

(۱) بنجر و افتادہ آراضی بکثرت تھیں اور آباد کرنے والے کم تھے۔

(۲) پیداوار آج کے مقابلہ میں نہایت ہی کم تھی خصوصاً عرب کی زمینوں کی۔

(۳) رسول اللہؐ اور صدیق اکبرؓ کے زمانۂ خلافت میں فوجیوں اور دیگر کارپردازوں کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں۔

(۴) فاروق اعظمؓ نے تنخواہوں اور وظیفوں کا باقاعدہ انتظام کیا۔

(۵) تنخواہ مقرر ہونے کی صورت میں مفاد عامہ کی خدمت کرنے والے لوگ خدمت چھوڑ کر خود کاشت کرتے یا زمین کاشتکاروں کے حوالہ کر کے پیداوار یا آمدنی میں دونوں شریک ہوتے۔

(۶) تنخواہوں اور وظیفوں کے مقرر ہو جانے کے بعد فاروق اعظمؓ نے مسلمانوں کی زمین و جائداد کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا قابل غور ہے۔

مزید وضاحت کے لئے چند واقعات یہ ہیں۔

(۱) ابو بکر صدیق نے حضرت طلحہؓ کو قطیعہ عطا فرمایا اور چند لوگوں کو گواہ بنا کر حکم نامہ ان کے حوالے کر دیا گواہوں میں حضرت عمرؓ تھے۔ حضرت طلحہؓ جب دستخط کرانے کے لئے عمرؓ کے پاس آئے تو یہ کہہ کر دستخط سے انکار کر دیا۔

هذا كله لك دون الناس — کیا یہ سب تمہیں ہی مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

پھر طلحہؓ غصہ میں بھرے ہوئے ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا

والله ما ادری انت الخليفة ام عمر — واللہ میں نہیں جانتا کہ کون خلیفہ ہے آپ ہیں یا عمر

ابو بکرؓ نے فرمایا بل عمر بلکہ عمر ہیں

الغرض عمرؓ کی مخالفت کی وجہ سے فرمان صدیقی رد ہو گیا۔[1]

(۲) حضرت عینیہؓ کو صدیق اکبرؓ نے " قطیعہ " دیا جب دستخط کے لئے عمر کے پاس آئے تو انہوں نے دستخط کرنے سے انکار ہی نہیں کیا بلکہ لکھے ہوئے کو بھی مٹا دیا۔ عینیہؓ دوبارہ ابو بکر کے پاس آئے اور دوسرا حکم نامہ لکھنے کی درخواست کی

والله لا اجدد شيئا رده عمر[2] — خدا کی قسم وہ کام دوبارہ نہ کروں گا جس کو عمرؓ نے رد کر دیا ہو

باقی رہی یہ بات کہ حضرت عمرؓ نے دستخط سے کیوں انکار کیا جب رسول اللہؐ ابو بکرؓ اور خود عمرؓ سے "قطیعہ" دینا ثابت ہے اس کی وجہ حضرت عمرؓ نے خود ہی ان الفاظ میں بیان کر دی تھی کہ:

اهذا كله لك دون الناس — کیا یہ سب تجھے ہی مل جائے اور دوسرے محروم رہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ صدیق و فاروق دونوں کا ایک مقصد تھا یعنی "قطائع" دے کر زمین کو زیر کاشت لانا تا کہ خلق اللہ کو زیادہ سے زیادہ غذا مہیا ہو سکے مگر یہ بات بھی ہر وقت ملحوظ رہتی تھی کہ زمین صرف چند افراد کے ہاتھوں میں پڑ کر ان کے لئے عیش و آرام طلبی کا سامان نہ بن جائے یا بیکار

---

[1] الاموال ص ۲۸۳ [2] الاموال ص ۲۸۳

نہ بچی رہے اس لئے یہ احتیاط ضروری تھی کہ صرف ان لوگوں کو زمین دی جائے جو اس کے اہل [illegible]
اتنی دی جائے جتنی وہ استعمال کر سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ میں کسی فرد کو نہ تو بے کار رہنے دیا جاتا اور نہ دوسرے کی محنت [illegible] فائدہ اٹھا کر عیش و عشرت کا موقع ملتا تھا۔

اگر کسی فرد میں کاشتکاری کی اہلیت اور صلاحیت ہوتی تو آراضی اس کے حوالہ کر کے خلق اللہ کی خدمت پر [illegible] اور اگر دیگر مفادِ عامہ کے لئے موزوں ہوتا تو اتنی مقدار زمین دی جاتی کہ دوسرے لوگ اس سے کاشت کرا کے خدمت کے فرائض اطمینان کے ساتھ انجام دے سکتے۔ ایسی صورت میں کاشتکار اپنی صلاحیت کے مطابق خدمتِ خلق کرتا تھا اور صاحبِ زمین اپنی صلاحیت کے مطابق اس فرض کو انجام دیتا تھا۔

اسی بناء پر بدرالدین عینیؒ کہتے ہیں۔

یجوز للجندی الذی یقطع له ان یوجرما اقطع له	فوجی کے لیے اپنے قطائع کو کرایہ پر دینا جائز ہے

اور شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں۔

ولا یقطع الا قدرا یتأتی العمل علیه[1]	ایسی مقدار قطیعہ دیا جائے جس پر کام کرنا آسان ہو

پھر کہتے ہیں:

امام را باید کہ اقطاع کند بقدر حاجت[2]

قطائع اور سرکاری ٹیکس

زمانۂ خلافت میں "قطائع" سرکاری ٹیکس اور قانون سے مستثنیٰ نہ تھے بلکہ خلیفہ کے اختیارات بہ نسبت دیگر آراضی کے "قطائع" میں زیادہ وسیع ہوتے تھے۔

جیسا کہ قاضی ابویوسفؒ کہتے ہیں۔

"قطائع" اگر عشری زمین سے دیے گئے ہیں تو عشر واجب ہوگا، خراجی زمین سے دیے گئے ہیں تو خراج واجب ہوگا۔[3]

[1] عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۳۶ [2] مسوّی ص ۴۰۵ [3] مصفیٰ ص ۴۰۵

پھر کہتے ہیں۔

جس کسی کو خراجی زمین سے قطائع دیئے جائیں تو پیداوار کا دسواں، پندرہواں، بیسواں حصہ بارش سے بھی زیادہ یا خراج بہر حال جو مناسب ہو خلیفہ مقرر کرے۔

آگے چل کر کہتے ہیں:

مجھے امید ہے کہ اس بارے میں خلیفہ جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گا اس کے لئے وسعت اور گنجائش ہے۔

ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مفاد عامہ کے پیش نظر آپ جو مناسب سمجھیں اس میں آپ کو پورا اختیار ہے۔[۱]

حاصل یہ ہے کہ حکومت الٰہی میں زمین جائداد نہ ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے تھی اور نہ کاشتکاروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مفت خوروں کا طبقہ پیدا کرنے کے لئے بلکہ یہ ساری چیزیں پیداوار حاصل کر کے مفاد عامہ کی راہوں میں صرف کرنے کے لئے اور خلق خدا کی خدمت کے لئے تھیں اس لئے قانون اور ٹیکس کے معاملات میں خلیفہ کے اختیارات وسیع تھے مذکورہ تمام تصریحات کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ موجودہ زمینداری اور جاگیرداری کی صورت قطائع سے بالکل مختلف ہے۔ جاگیردار اور زمیندار ایک وسیع حصۂ زمین کا مالک ہوتا ہے کاشتکار اور مزدور اس پر کام کرتے ہیں اور مالکِ زمین بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے ان کے منافع سے عیش و آرام کرتا ہے۔

"قطائع" سے اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی جواز نہیں نکل سکتا بلکہ متعدد مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ ایسے نظام کو سختی کے ساتھ ختم کیا گیا اور ایسا کرنے میں مفاد خلق کے سوا کوئی دوسرا جذبہ یا مصلحت کار فرما نہ تھی۔ (جاری ہے)

---

[۱] الخراج ص ۵۹ و ص ۶۰

پہلی قسط

مغربی فن تعمیر پر اسلامی فن تعمیر کے اثرات

از مارٹن۔ ایس۔ برگس

ترجمہ: جناب سید مبارزالدین صاحب رفعت ایم۔ اے

ابھی ایک نسل اور گزرے تب کہیں جا کر کچھ دنوں کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے گا کہ فن تعمیر پر اسلامی دنیا نے کیا کیا احسان کیے ہیں۔ ہمارے موجودہ علم کا جہاں تک تعلق ہے اسلامی فن تعمیر کے بہت سے اہم پہلوؤں کے بارے میں اتنے شبہات باقی ہیں کہ کسی جوشیلے طرفداری کو اپنی رائے پر پورا پورا اعتماد ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی سے حال کا بہت سا تحقیقاتی کام جسے غیر یقینی نقاط پر روشنی ڈالنا چاہیے تھا، ہمارے آگے نزاعی بحثوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بحثیں اسلامی فن تعمیر کی پختگی کے دوروں کی خصوصیت سے کم ہی متعلق ہیں اور ہماری دنیا کے فن تعمیر کے ارتقا پر اس کے اثرات کا ذکر تو ان میں بہت ہی کم ہے۔ بلکہ یہ تحقیقاتی کام زیادہ تر اسلامی فن تعمیر کی اصل اور اس کی ابتدائی عمارتوں کے حال پر مشتمل ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ تحقیقاتی کام اس سوال سے راست تعلق رکھتا ہے کہ اسلامی فن تعمیر نے بنی نوع انسان کو ورثہ میں کیا دیا ہے کیونکہ ہم اسلام کی میراث کا اس وقت تک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتے جب تک خود

اسلام کے پاس اپنی کسی حقیقی چیز کے ہونے کا کوئی ثبوت ہمیں نہ مل جائے۔ بہ الفاظ دیگر کہا جاتا ہے کہ اسلامی فن تعمیر میں اتنی بہت سی چیزیں غیر مسلم قوموں سے لی گئی ہیں کہ بعض عالموں نے تو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں نے تعمیری شکلیں مستعار لی ہیں اور ان کا اپنا کوئی فن تعمیر نہیں۔ اس بنیادی نقطۂ نظر کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسلامی فن تعمیر کی ابتداء اور اس کی ماہیت کا ایک عام خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

آدھی صدی کے اندر عرب، حجاز سے لے کر مغرب میں ہرکولس کے ستونوں (Pillars of Herculus) تک اور مشرق میں ہندستان کی سرحدوں تک صحرائی بگولے کی سی تیزی سے پھیل گئے اور انہوں نے پہلے سے متمدن بہت سے ملکوں کو فتح کر لیا۔ ان کی سلطنت اتنے وسیع علاقے پر پھیل گئی تھی کہ اتنا وسیع علاقہ رومی سلطنت کو اپنے انتہائی پھیلاؤ کے زمانے میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ ان علاقوں میں ایسی بہت سی قومیں آباد تھیں جن کا فن تعمیر رومیوں کے فن تعمیر سے مختلف اور بعض صورتوں میں اس سے بھی کہیں زیادہ قدیم تھا۔

قرون وسطی کے مغربی فن تعمیر کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ فن تعمیر بڑی حد تک رومی ہے۔ اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس کی ہر چیز ایران یا آرمینیا سے لی گئی ہے۔ اب چاہے کوئی اس اختلاف خیال میں کسی گروہ کا ساتھ دے، پر اب یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ آخرالذکر مکتب خیال ہماری سنجیدہ توجہ کا طالب ہے۔ آمینیا، عراق (مسوپٹمیا) اور ترکستان میں جو غیر معمولی دریافتیں ہوئی ہیں اور جو اگرچہ ہمارے سامنے نزاعی صورت میں پیش کی گئی ہیں، ان دریافتوں نے ہر چیز کے رومی ہونے کے نقطۂ نظر پر ہمارے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ کلیسا نے صدیوں تک یہ عقیدہ پھیلایا کہ ہماری رومانسیکو (Romanasque) اور گوتھک عمارتیں شہنشاہی روما کے کھنڈروں پر ہی مبنی ہیں یا پھر ہمارے اس فریب تخیل کے ذمہ دار نشاۃ ثانیہ کے بر خود غلط "انسانیت دوست" ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ چاہے وجہ کچھ بھی ہو، یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اب ہمیں مشرق کی طرف جانب دارانہ نظر سے دیکھنا چاہیے اور سب سے پہلے ہمیں مشرق کو ایک واحد علاقہ سمجھنے کی عادت بھی ترک کر دینی چاہیے۔ ہم پر روما کے جو احسان ہیں، [illegible] شاید ہی کسی کو سنجیدگی سے کوئی شبہ ہو لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس بات کا اندازہ لگا لیا

جائے کہ ہم کس حد تک اس کے ممنون احسان ہیں۔

عرب فاتحوں نے جو علاقے فتح کیے تھے ان میں شام، آرمینیا کا ایک حصہ اور شمالی افریقہ کا آباد علاقہ جس میں مصر بھی شامل تھا یہ سب کے سب علاقے مشرقی رومی مملکت سے حاصل کیے گئے تھے۔ اسپین وسغوطیوں سے چھینا گیا۔ لیکن اس سے پہلے یہ علاقہ رومی صوبہ تھا۔ عراق (مسوپٹیمیا) سے لے ترکستان اور افغانستان تک کے ملک خسرو دوم کی پچھلی ساسانی مملکت میں شامل تھے۔ اس پورے وسیع وعریض علاقے میں آرمینیا اور شام کی مشرقی سرحد تک نصرانیت کے قدم آچکے تھے۔ اور ہمیں (جنوبی عرب) کے علاقے سنا میں چھٹی صدی عیسوی کا ایک کلیسا تک پایا جاتا تھا۔[1] اس طرح فاتحوں کو اپنے مفتوحہ علاقے کے ہر صوبے میں آسانی کے ساتھ ماہر تعمیر کار مل گئے اور انہیں اپنے پیش رو قبطیوں اور وسغوطی نصرانیوں کی طرح بہت سی عمارتیں بھی مل گئیں جن کو فاتحوں نے آزادی کے ساتھ پتھر کی کانوں کی طرح استعمال کیا۔ اس ناقابل تردید حقیقت کا بڑا چرچا ہوا ہے، لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عربوں کو اپنی مملکت کے مشرقی صوبوں میں ایسے مقامی صناع بھی ملے جو ایسی طرز میں عمارتیں بناتے تھے جو رومیوں کی طرز سے بالکل مختلف تھی اور اگر ہم بعض ماہروں کی بات مانیں تو ان ہی صناعی نے بازنطینی تعمیر کاروں کو وہ تمام باتیں سکھائیں ہیں جن کی وجہ سے بازنطینی کام رومی کام سے مختلف نظر آتا ہے۔

پہلے عرب فاتحوں میں تعمیری کام کی مہارت پائی جاتی تھی اور نہ وہ اس کا ذوق رکھتے تھے یہی نقطہ نظر عام ہے اور درست بھی ہے۔ اس پر جھگڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس وقت کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ان میں اسی بات کی توقع کرنی چاہئے اس طرح کی فتح سپاہیوں کی ایسی نسل ہی کو نصیب ہو سکتی تھی جن کی ہمتوں کو دینی جوش نے بلند کر دیا تھا اور جن کے وقت کا بڑا حصہ لڑائیوں اور عبادتوں میں بٹا ہوا تھا اس کے سوا یہ لوگ شہروں میں رہنے والے لوگ نہ تھے بلکہ خانہ بدوش بدوی تھے اور جب انہیں میدان کارزار سے فرصت ملی اور انھوں نے حکومت کا کاروبار سنبھالا تب بھی تعمیری صنعتوں میں انھیں ناگزیر طور پر مقامی صناعوں ہی سے یا (اور یہ اہم بات ہے) ایسے صناعوں سے جو ایک مفتوحہ ملک سے دوسرے مفتوحہ ملک میں درآمد کیے گئے تھے، کام لینا پڑا۔ اس طرح یہ معلوم ہے کہ آرمینیا کے سنگ ساز نہ صرف مصر میں بلکہ اسپین میں

---

[1] بی اینڈ ای، ایم وِش شا، عربک اسپین (لندن ۱۹۱۲ء) ص ۱۲۲ B & E. M. WISHAW, Arabic Spain

بھی کام پر لگائے گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ غالباً اسی ملک کے سنگ سازوں سے فرانس میں نویں صدی کے کلیسا جرمگنی دیس پرس (Germigny - des Pres) کی تعمیر میں کام لیا گیا تھا جس میں بہت سی اسلامی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔[1]

فتح کے ابتدائی سالوں میں تعمیر کاری سے عربوں کی ممکنہ ناواقفیت کے باوجود اسلامی فن تعمیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت نمایاں اور ناقابل انکار دکھائی دیتی ہے کہ اس نے تمام ملکوں میں اور تمام صوبوں میں اپنی واضح انفرادیت کو برقرار رکھا اگرچہ اس کہ ماخذ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اس میں کچھ ایسی بات پائی جاتی تھی جو صناعی کی مقامی مکاتیب کے کام سے جو فنی طور پر اس کو عالم وجود میں لانے کا باعث ہوتا تھا، اسے امتیاز بخشتی تھی۔

اپنی انفرادی خصوصیت رکھنے والی ایک دوسرے سے مختلف بے شمار طرزوں کی تعمیر کاریوں کو ایک دوسرے میں کھپانے اور انہیں گھلا ملا کر ایک طرز ایجاد کرنے والا عامل غالباً دین اسلام تھا کیونکہ عربوں نے اپنے ابتدائی دنوں میں جو عمارتیں بنائیں وہ بڑی حد تک مسجدیں اور محل تھے اور بعد کی صدیوں کا بہت سا اہم تعمیری کام مسجدوں اور دوسری مذہبی عمارتوں پر مشتمل رہا جیسے مدرسے اور خانقاہیں جن کے ساتھ مسجدیں بھی ہوتی تھیں، عربوں کی مخصوص اور اہم ترین عمارت مسجد تھی۔ مختلف مقامات کے لحاظ سے اس کی شکل و صورت میں تھوڑا بہت اختلاف ضرور پایا جاتا تھا لیکن اس کی اہم خصوصیات ہمیشہ برقرار رہتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مکہ میں اسلامی دنیا کے تمام حصوں سے آنے والے حاجیوں کے اجتماع نے مسجد کی شکل کو معیاری بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے کیونکہ اپنے طویل سفر میں حاجی جن جن شہروں سے گزرتا وہاں کی مقامی مسجدوں میں نماز ضرور ادا کرتا، اور اگر وہ کوئی تعمیر کار صناع یا معمار ہوتا تو ان کے نقشوں پر ضرور دھیان دیتا۔

۶۲۲ء میں محمدؐ نے مدینہ میں جو اولین مسجد بنوائی وہی بعد کی تمام مسجدوں کے لیے نمونہ بنی۔ یہ عمارت ایک مربع احاطہ تھی اور اسے اینٹ اور پتھر کی دیواروں سے گھیر اگیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ غالباً شمالی حصہ تھا، اور جہاں رسول اللہؐ نماز کی قیادت فرماتے تھے، مسقف تھا یہ چھت غالباً کھجور کی ٹہنیوں کے ہوتے تھے ان پر مٹی ڈالی جاتی تھی اور انہیں کھجور کے تنوں سے سہارا دیا جاتا

---

[1] جے اسٹرائزی گووسکی، نصرانی کلیسا کے آرٹ کی ابتداء، (آکسفورڈ ۱۹۲۳ء۔ ص ۶۴)

تھا۔ نمازیوں کی جماعت شمال کی طرف منہ کر کے بیت المقدس کے جبرک شہر کی سمت میں سجدہ ریز ہوتی تھی اور اس قبلہ گاہ کی کسی نہ کسی طرح نشاندہی کی گئی تھی۔ ۶۲۲ء میں نماز کی سمت بیت المقدس کی جگہ مکہ کی طرف پھیر دی گئی یعنی سمت (مدینہ کی صورت میں) شمال سے جنوب ہو گئی۔ ایسی ابتدائی عمارت کے لیے کہیں اور سے تعمیری خصوصیات کے مستعار لینے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کے لیے کسی قسم کی تعمیری خصوصیات سرے سے درکار ہی نہ تھیں۔

اس کے بعد دوسری مسجد عراق (مسوپٹیا) کے علاقے میں بمقام کوفہ ۶۳۹ء کے لگ بھگ تعمیر ہوئی۔ اس کا چھت مرمر کے ستونوں پر اٹھایا گیا۔ یہ ستون حیرہ میں ایرانی بادشاہوں کے ایک پچھلے محل سے لائے گئے تھے۔ یہ مسجد بھی مربع تھی۔ لیکن اسے دیوار کی جگہ خندق سے گھیرا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی مسجد عمر ابن عاص نے فسطاط (قاہرہ) میں ۶۴۲ء کے لگ بھگ تعمیر کرائی تھی۔ اس کا نقشہ بھی مربع تھا اور کہتے ہیں کہ اس میں صحن نہ تھا۔ اس میں ایک نیا عنصر بھی داخل کیا گیا تھا۔ یہ ایک اونچا سا منبر تھا۔ پھر چند سالوں کے بعد امام کو مجمع سے محفوظ رکھنے کے لیے مقصورہ بنایا گیا۔ کہتے ہیں مینار اسی صدی کے ختم پر نمودار ہوئے۔ اور قبلہ نما محراب اس کے کچھ دنوں بعد نمودار ہوئے، اس طرح نو دس سالوں کے اندر اندر مدینہ کی پہلی مسجد کی عمارت سے جامع مسجد کی تمام لازمی خصوصیات نے ارتقا پایا۔ جزئی اضافے ایوانات (واحد ایوان) تھے یہ ایوانات سایہ دار دالان اور چھتے تھے جو صحن کو گھیرے ہوئے تھے اور لوگوں کو دھوپ سے بچاتے اور وضو کے لیے سہولت بخشتے تھے۔ اس مختصر سی فہرست میں تمام عہدوں کی مسجد کے دینی فرائض کے لوازم آگئے ہیں۔

جن عمارتوں کا اوپر ذکر ہوا ان میں سے اب ایک بھی اپنی اصلی شکل وصورت پر قایم نہیں۔ اب تو مسلسل تبدیلیوں کی وجہ سے ان کے نقشے تک بدل گئے ہیں لیکن نقشہ ہی اصل چیز ہے کیونکہ ابتدائی مسجد مشکل سے عمارت کہلا سکتی تھی اور جن معنی میں ہم تعمیری کام بولتے ہیں اس کا اطلاق تو کسی طرح بھی اس پر نہ ہوتا تھا تاہم ایم۔ فان۔ برچم کا خیال ہے[1] کہ اس ابتدائی مسجد کے نقشے کی اصل بھی ابتدائی نصرانی کلیسا ہی نے سجھائی تھی اس کا صحن رومی عمارتوں کے وسطی بے چھت صحن سے لیا گیا، مرکزی ایوان کلیسا کی اصل عمارت سے لیا گیا، مقصورہ کلیسا کے مشرقی حصے

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مقالہ فن نمبر

سے لیا گیا، جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے اور جس کے گرد کٹہرا بھی ہوتا ہے اور محراب گرجا کی نیم قوسی طاق سے لی گئی ہے اور مینار کلیسا کے مینار سے لیا گیا ہے لیکن مشکل ہی سے یہ خیال ضروری یا درست معلوم ہوتا ہے جب تک عربوں نے اس مذہبی احاطے یا پناہ گاہ کو فن تعمیر کا نمونہ نہیں بنایا اس وقت تک اس کے ماخذوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سادی سیدھی احتیاج سے لے کر شان و شکوہ کے حصول تک کا عبوری دور بہت گریز پا رہا۔ دین اسلام کی سخت گیری اور اس کے بہت سے پیروؤں کی سخت کوش مجاہدانہ زندگی کو پیش نظر رکھیے تو یہ سرعت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بیس سال کے اندر ہی مدینہ میں خود آپ کی مسجد دیواروں اور گھڑے ہوئے پتھروں کے پایوں کے ساتھ نئے سرے سے تعمیر کی گئی اور ساتویں صدی کے آخری سالوں میں بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ۶۳۹ء میں شہر کی فتح کے بعد بنوائی ہوئی معمولی سی مسجد کے قریب (قبۃ الصخراء) کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی۔ اس عمارت کا حجم اثر آفریں تھا۔ یہ یادگاری قسم کی عمارت تھی اور اسے خوب ہی سجایا گیا تھا بس یہیں سے ہم اس شدید اختلافات کے چکر میں پڑ جاتے ہیں جو اسلامی فن تعمیر کے ماخذ کے بارے میں اب تک چلا آ رہا ہے۔ (جاری ہے)

سر سید کی والدہ بہت ہی صابر و شاکر، عبادت گزار اور ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی رہنے والی خاتون تھیں۔ سر سید نے ان کا ایک لائق تقلید و مثالی واقعہ بیان کیا ہے:

"میرے بڑے بھائی آگرہ میں منصف اور جوان العمر تھے، ان کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے پر ہی بیٹھی رہیں۔ انہی دنوں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا۔ صرف پانچ دن عقد میں باقی تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گزرا تو ان لوگوں نے دستور کے مطابق شادی ملتوی کرنی چاہی۔ میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعے کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا "میں شادی میں آئی ہوں۔ ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہو گا۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں، تو اور [illegible]"

ادبیات

غزل

از جناب استاد الشعرا مفتی امیر احمد صریرؔ

کیا ہے خیرہ نظر کو اپنی جمال انور دکھا دکھا کر!
بنایا بیخود ہمیں کسی نے شرابِ وحدت پلا پلا کر

وہ اپنی حکمت کو آپ جانے وہ اپنے رازوں کو آپ سمجھے!!
فنا کا ساغر پلایا ہم کو مزے بقا کے چکھا چکھا کر

یقین کہتا ہے ہم سے اپنا وہ بن گئے ہیں وہ سنور گئے ہیں
جو راہ مولیٰ میں مٹ گئے ہیں گھروں کو اپنے لٹا لٹا کر

کہیں وہ رنگ چمن بنے ہیں کہیں وہ غنچوں میں بس گئے ہیں
کیا ہے عاشق جہاں کو اپنا عجب کرشمے دکھا دکھا کر

صبا مدینے تو مجھ کو لے چل کہوں گا آقا سے اپنے رو کر!!
فلک نے مارا ہے آہ مجھ کو جہانیں در در پھرا پھرا کر

انہیں کے عاشق میں عرش والے انہیں کے شیدا میں فرش والے
جنہیں سلاتی تھیں روز حوریں جہانیں جھولا جھلا جھلا کر

جہانیں آکر صریرؔ ہم نے عجب قدرت کا کھیل دیکھا!
ہزاروں پتلے بگاڑ ڈالے ہیں اس نے دم میں بنا بنا کر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجلس ادارت اعزازی

سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۲ — مارچ ۱۹۹۸ء — شمارہ: ۳

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ بُرہان

4136 - اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔ 110006 * فون نمبر 3262815

زرِ تعاون
فی پرچہ: ۶ روپے
سالانہ: ۷۲ روپے

کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISION

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

۱۹۹۸ء کے پارلیمنٹری انتخابات کے نتائج سامنے آنے کے بعد ہندوستان کی زمام اقتدار بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت میں ۱۸ جماعتوں کے متحدہ محاذ مورچہ نے سنبھال لی ہے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے بانی ممبر جناب اٹل بہاری واجپئی ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہوگئے ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی سابق جن سنگھ ایک عرصہ سے مرکزی حکومت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھی، اس کے لیے اس نے بہت جوڑ توڑ کیے۔ ۱۹۷۷ء میں اندرا گاندھی کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد کانگریس مخالف جماعتوں کو جن سنگھ نے کمال ہوشیاری کے ساتھ ایک جگہ جمع کر کے کانگریس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا بظاہر نہ سمجھ میں آنے والا پلان تشکیل دیا اور پھر جن سنگھ کو ختم کر کے جنتا پارٹی کے نام سے ایک جماعت قایم کی گئی جس میں تمام مخالف کانگریس جماعتوں کو اپنے علیحدہ وجود کو ختم کر کے اس میں شامل ہونے کی ترغیب و تحریک کی گئی۔ جس میں اسے اس قدر کامیابی ملی کہ کمیونسٹ پارٹی تک جنتا پارٹی کی حمایت کرنے پر خوشی خوشی تیار ہوگئی۔ اور ۱۹۷۷ء میں جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کے دوران میں الیکشن کرانے کا اعلان کیا تو ہندوستان کے عوام کو کانگریس کا اس قدر مخالف بنادیا گیا کہ عوام نے انتخاب میں جنتا پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیاب کردیا کہ مرکز میں اس کی حکومت قایم ہوگئی۔ اس انتخاب کی یہ خصوصیت تھی کہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہوتے ہوئے بھی حزب اختلاف کے ایک بڑبولے وزیر اعظم راج نرائن کے مقابلے شکست سے دوچار ہوگئیں۔ اس وقت ہندوستان ہی میں نہیں پوری دنیا میں ہندوستان کی پارلیمنٹ کے انتخاب کے نتیجہ کو حیرت کی نظر

[illegible] کی چاپلوسی کے ساتھ جن سنگھ نے جنتا پارٹی میں اپنا دبدبہ قائم رکھا اور مستقبل کے حالات کو [illegible] میں رکھتے ہوئے اس نے اتنی قربانی بھی اس وقت دی کہ سب سے زیادہ سیٹیں ہونے کے باوجود وزارت عظمیٰ پر اپنے آدمی کو بٹھانے کے بجائے مرارجی ڈیسائی کو بیٹھنے دیا۔ مگر اس نے اس کے [illegible] وزارت کے دیگر اہم قلمدان اپنے ہی لوگوں میں تقسیم کرائے۔ اندر ہی اندر کیا ہوتا رہا یہ تو خدا ہی جانتا ہے مگر ظاہر تو یہ سمجھ میں آیا کہ جن سنگھ نے اس وقت کو نظر انداز کر کے مستقبل کے حالات پر اپنے شاندار مستقبل کی تعمیر کا پلان بنایا ہوا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد جنتا پارٹی میں اس بنیاد پر بغاوت ہو گئی کہ آر آر ایس حکومت کے کاموں میں مخل ہے چنانچہ چودھری چرن سنگھ اور راج نرائن نے اس وقت اعلان کیا کہ جنتا پارٹی میں دوغلی ممبر شپ یا دہری وفاداری نہیں چلے گی۔ ایک طرف آر آر ایس سے وفاداری ہے تو دوسری طرف جنتا پارٹی میں بھی کوئی وفاداری کی بات کرے تو یہ بات برداشت سے باہر ہے۔ چرن سنگھ نے اس وقت کانگریس سے حمایت لے کر جنتا پارٹی کی حکومت گرا کر اپنی قیادت میں حکومت تشکیل کی جو پارلیمنٹ کا سامنا کیے بغیر ہی چار ماہ سے زیادہ مدت بھی پوری نہیں کر پائی اور پارلیمنٹ کے نئے انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ چرن سنگھ نگراں حکومت کے وزیر اعظم رہے۔ جن سنگھ کے جو ممبران وقتی طور پر جنتا پارٹی میں شامل تھے انہوں نے صرف پارٹی کا نام بدلا تھا اپنے خیالات اور اپنی تخصیص کا کبھی خاتمہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اپنے دل و دماغ پر جبر کر کے اور مستقبل کے حالات کو سمجھنے کے مقصد سے اسی جنتا پارٹی کے تحت الیکشن لڑا جس میں سے چرن سنگھ گروپ بغاوت کر کے الگ ہو چکا تھا۔ مگر الیکشن کے نتائج نے یہ بات عیاں کر دی کہ اب جنتا پارٹی کے ساکھ عوام کی نظروں میں گر چکی ہے۔ کانگریس دوبارہ بر سر اقتدار آگئی اور اندرا گاندھی دوبارہ ملک کی وزیر اعظم بن گئیں۔ جن سنگھ کے ممبران نے اب اپنی الگ پہچان کو دوبارہ بنانے کی کوشش کی، جنتا پارٹی سے اسے جتنا کام لینا تھا وہ اس نے لے لیا۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہ تھی جن سنگھ ختم ہو چکی تھی چنانچہ انہوں نے الیکشن کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کے نام سے ایک علیحدہ جماعت کا اعلان کیا اور اس کے جھنڈے کے نیچے وہ سارے جن سنگھی اکٹھے ہو گئے جو جنتا پارٹی میں موجود تھے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے ۱۹۸۴ء کا پارلیمنٹری انتخاب لڑا اور اس میں چونکہ اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے عوام میں کانگریس کے تئیں ہمدردی کی لہر تھی اور پھر نوجوان قائد راجیو گاندھی کی قیادت میں ملک کو آگے بڑھانے کا خواب ان کے دل میں موجیں مار رہا تھا اس لیے کانگریس کو عوام نے بہت زبردست اکثریت سے منتخب کیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو پورے

ہندوستان میں صرف اور صرف ۲ ہی سیٹیں ملیں۔ یعنی ۱۹۷۷ء میں جنتا پارٹی کے بینر تلے جن سنگھ کے ۹۵ ممبر منتخب ہوئے پھر ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں پارلیمنٹ کی دس سیٹیں نصیب ہوئیں۔ ان الیکشن نتائج نے سابق جن سنگھ کے کرتا دھرتاؤں کو بیدار و مستعد کر دیا انہوں نے اپنی ان ناکامیوں کو چیلنج سمجھا اور پھر وہ مصروف ہوگئے ــــ ان کانگریس مخالف سیکولر جماعت کے ممبران کو اکٹھا کرنے میں۔ اور پھر وی پی سنگھ کو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بٹھا کر ۱۹۸۹ء میں آئندہ کے لیے مرکزی حکومت پر بیٹھنے کے لیے جگہ بھی تیار کری اور اس کے لیے فضا اور زمین بھی۔ سیکولر نام کی جاپ کرنے کے لیے خواب غفلت میں صرف وقتی کرسی پر بیٹھنے ہی میں اپنی شان دوبالا کیے بیٹھے رہے۔ اور یہ لوگ مستقبل کے لیے راہ ہموار کرنے میں جٹے رہے۔ ہندوستان کے عوام کے جذبات و خیالات کے پیش نظر کتنے ہی پروگرام ترتیب دیئے اور انھیں بروئے کار لائے۔ بابری مسجد کا انہدام اور رام مندر کی تعمیر کی تحریک اسی ایک پروگرام کی کڑی تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۹۶ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی پارلیمنٹری انتخابات میں سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری اور اب ۱۹۹۸ء کے پارلیمنٹری انتخاب میں بھارتیہ جنتا پارٹی اپنے جوڑ توڑ اور عقلمندی کے ساتھ اس پوزیشن میں آگئی کہ بڑی شان کے ساتھ مرکزی حکومت پر قابض ہوگئی اور اس کے سب سے بڑے و اہم ستون لیڈر اٹل بہاری واجپئی ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء میں کانگریس مخالف لیڈروں کو اکٹھا کر کے اس نے مرکزی حکومت تو بنوالی مگر اپنا وزیر اعظم کسی مصلحت سے نہ بنایا۔ مگر ۱۹۹۸ء میں اس نے ایسا جال بنا کہ اپنے آپ ہی وزارت عظمیٰ کی کرسی اس کے پاس آگئی ــــ اسے کہتے ہیں کمال ہوشیاری، چابکدستی اور دور اندیشی۔

سیکولر نام کی مالا جپنے والے سب منہ تاکتے رہ گئے اور اپنی اپنی ڈفلی بجانے میں پھر مشغول ہوگئے ہیں۔ آنے والا وقت شاید ان کے لیے ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ ہندوستان کے نقشے پر ان کا وجود ہی باقی نہ رہے گا اور بھارتیہ جنتا پارٹی آج کچھ پارٹیوں کو ساتھ لے کر چلنے پر مجبور ہے تو کل وہ کسی بھی پارٹی کے بغیر ہندوستان کی مرکزی حکومت پر اکیلے ہی قابض دکھائی دے گی۔ یہ ہمارا یقین بھرا اندازہ ہے۔

ہندوستان کی سیاست کے ماہرین کا خیال ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایک راشٹر ایجنڈا تشکیل دے کر حکومت چلانے کا جو پروگرام بنایا ہے اور جس میں اس نے اپنے بنیادی مقاصد جیسے دفعہ ۳۷۰ کا خاتمہ، یکساں سول کوڈ اور بابری مسجد کی جگہ رام مندر تعمیر کرنے سے جو پہلو تہی اختیار کی ہے وہ دور اندیشانہ

[illegible] کا تقاضہ ہے۔ اسے اپنے مذکورہ بالا پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابھی اور پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور اگر اس میں انہیں اپنی طرف سے کچھ قربانی بھی دینی پڑے گی تو اس سے وہ دریغ نہ کریں گے۔ مگر سیکولرزم کی مالا جپنے والے تو صرف کرسی نہ ملنے سے مایوس ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ ان کے لیے [illegible] آگے کے راستے بند ہی ہو جائیں گے ایسا ہمارا خیال ہے۔

کانگریس اپنے اصولوں سے کس قدر ہٹ چکی ہے اور اس کا سیکولرزم کا اصول یا نعرہ صرف اقتدار کی کرسی ہتھیانے کا زینہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اسی لیے کانگریس کی شکست سے کانگریس کے قدیم چاہنے والوں کو کوئی ملال نہیں ہے۔ جو اقتدار کا بھوکا ہوتا ہے یا جو مفاد پرست ہوتا ہے اس کی شکست سے کسی اور کو کیا لینا دینا ہے کوئی رنج کرے تو کیوں۔۔۔ ؟

اب راجیو گاندھی کی بیوہ شریمتی سونیا گاندھی کانگریس میں نئی جان پھونکنے کے لیے کانگریس کی صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہیں تو اس سے اب ہمیں نہ کوئی خوشی ہے اور نہ ہی غم۔ جب کانگریس کے پاس سے اپنے بنیادی اصول ہی رخصت ہو چکے ہیں تو پھر کسی دوسرے کے لیے کانگریس کی کشش ختم ہو گئی ہے۔ اب کانگریس کتنے دن زندہ رہے گی یا وہ پھر ہندوستان کی سیاست کے نقشے پر چھائے گی ایسے کسی سوال و جواب کی اہمیت ان ہی لوگوں کے لیے اہمیت کا باعث ہو سکتی ہے جو اقتدار کے متلاشی ہیں۔ جنہیں اصول دل و جان سے عزیز ہیں ان کے لیے بنیادی اصولوں سے مبرا کانگریس سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک اس بات کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے کہ شریمتی سونیا گاندھی انڈین نیشنل کانگریس کی صدر منتخب ہو گئی ہیں۔

خدا کرے جناب اٹل بہاری واجپئی کی وزارت عظمیٰ کے زیر سایہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی حلیف پارٹیوں کی مرکزی حکومت ہندوستان سے بیروزگاری بدعنوانیوں اور رشوت خوری کے خاتمہ کے لیے کچھ کر سکے۔ غریبی دور ہو، ہر شخص اطمینان اور سکون کے ساتھ ہندوستان میں جی سکے اسی بات کی دل سے دعا نکل رہی ہے۔ بار بار انتخابات سے عوام پر جو مالی بوجھ پڑ رہا ہے وہ دور ہو۔ یہ حکومت بُری یا بھلی جیسی بھی ہو پانچ سال تک اپنی پوری مدت طے کرے۔ ایسی ہماری خواہش ہے۔ اسی کے ساتھ ہم ہندوستان کے نئے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسری قسط

مغربی فن تعمیر پر اسلامی فن تعمیر کے اثرات

از مارٹن۔ ایس۔ برگس

ترجمہ: جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے

قبۃ الصخراء پتھر کی ایک وسیع عمارت تھی در حقیقت یہ ایک مشہد (جائے شہادت) تھا، جس میں زائرین اس چٹان کا طواف کرتے تھے جس کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ حضرت محمدؐ اسی کے اوپر سے اپنے آسمانی سفر معراج کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں یہ عمارت بالکل منفرد رہی اور کم سے کم چار صدیوں تک صحن کے ساتھ جامع مسجد کے عام مربع نقشے میں کسی طرح کی کوئی اہم تبدیلی کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لیے یہ فرض کر لیا گیا اور بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ فرض کر لیا گیا کہ قبۃ الصخراء محض رومی یا بازنطینی قسم کی عمارت ہے، بت پرستوں یا نصرانیوں کی بنائی ہوئی اس سے پہلے کی عمارتوں کی نقل ہے، اسے شروع سے آخر تک نصرانی معماروں نے بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے فن تعمیر کا کارنامہ ہے اور عرب آرٹ کے اصل دھارے سے بالکل الگ کھڑا ہے۔ اس نقطۂ نظر میں ایک حد تک صداقت ضرور پائی جاتی ہے اور بظاہر اس میں کچھ معقولیت بھی نظر آتی ہے،

تھی اسے اپنی حد سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے۔

گول دالانوں والی اس قسم کی مقدس عمارت کے بنانے میں عربوں کے سامنے ایک قطعی مقصد موجود تھا۔ وہ بیت المقدس کی 'مقدس چٹان' (صخرا) پر جو یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک ایک مقدس چیز تھی، ایک پر شکوہ عمارت بنانا چاہتے تھے اور وہ ایک ایسی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے جو اس سے قریب ہی بنے ہوئے ضریح مسیح کے مشہور کلیسا کی حریف ہو اور شان و شکوہ میں اس پر سبقت لے جائے۔ یہ نیا مشہد، اس وسیع چٹانی سطح مرتفع کے وسطی حصے میں جو 'حرم شریف' کہلاتا تھا، ایک بڑا سا چبوترہ یا کرسی دے کر بنایا گیا۔ (اس کی سیدھ میں نقشہ کے مرکزی محور پر اس سے پہلے سے ایک مسجد بنی ہوئی تھی جو مسجد اقصیٰ کہلاتی تھی یہ ایک قدیم عمارت تھی۔ اس کی تاریخ اتنی مبہم اور پیچیدہ ہے کہ اس کا یہاں بیان کرنا لا حاصل ہے اپنی عبادت گاہ کی نمایاں خصوصیت کے طور پر گنبد یا زیادہ صحیح معنوں میں، حلقہ نما مدوّر ہال کا انتخاب کر کے عربوں نے بڑی دانائی کا ثبوت دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اسی طرح گنبد کو کسی مقبرے یا کسی مقدس مقام کی چھت کے طور پر اس کے سب سے اونچے اور پوری عمارت کو قابو میں رکھنے والے عنصر کی حیثیت سے عربوں سے پہلے رومی اور باز نطینی دونوں استعمال کر چکے تھے لیکن یہی قومیں کرۂ ارض پر گنبد بنانے والی اکیلی قومیں نہ تھیں۔ اسٹر از گو دسکی، جو ایرانی تصورات کے بڑے مداح ہیں، کہتے ہیں کہ گنبد کی مشرقی طرز کی ابتداء ایشائے کوچک یا مشرق بعید میں ہوئی، یہی طرز آرمینیا کے ذریعہ باز نطینیوں کے ہاتھ آئی، اور پھر ان سے بلقان کے علاقوں اور یونانی کلیساء کی سرپرستی میں روس میں پھیلی۔ اس طرح اگرچہ عربوں نے یہاں پہلی بار گنبد استعمال کیا لیکن وہ ایک ایسی چیز اختیار کر رہے تھے جو نہ تو بالکلیہ نصرانیوں کی تھی اور نہ ہی بالکلیہ رومیوں کی تھی۔ غالبًا انہوں نے مشہور کینستہ القیامتہ (Anestasio) کے گنبد کی نقل کی تھی جو اس سے قریب ہی تھا، اور ٹھیک اس کے حجم کا تھا۔ یقیناً شام اور آرمینیا میں گنبد والے کلیسا ساتویں صدی سے بہت پہلے سے موجود تھے اور قبتہ الصخراء قسم کے کلیسا یعنی ایک مثمن کے اندر مدوّر ہال والے کلیسا فلسطین میں پہلے سے موجود تھے۔ باقی چیزوں میں دیواریں ٹھوس پتھر کی ہیں، اندرونی چھتوں اور دریچوں کے موکھوں کی کمانیں نیم قوسی ہیں اور دونوں چھتوں میں جتنے

ستون استعمال ہوئے ہیں ان میں سے صرف دو قدیم زمانے کے ہیں اور بت پرستوں یا نصرانیوں کی پچھلی عمارتوں سے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح ان ستونوں کے دھرے اور نہ ہی ان کے سر ستون طرز میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں کمانوں کی جست کے اطراف زبردست چوبی شہتیروں کے جوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ جوڑ غالباً زلزلوں کے جھٹکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دیئے گئے ہیں جو اس علاقے میں عام ہیں یا پھر اس لیے دیئے گئے ہیں کہ معماروں کو محض کمانوں پر بھروسہ نہ تھا۔ ایسی ہی حفاظتی تدبیریں بازنطینی عمارتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ خود گنبد دہرا ہے اور پورے کا پورا لکڑی سے بنایا گیا ہے باہر کی طرف اس پر سیسہ اور اندر کی طرف منقوش اور رنگین پلاستر چڑھایا گیا ہے۔ لیکن یہ قدیم اصلی حصہ نہیں ہے۔ پچی کاری کا بیشتر کام اصلی ہے۔ لیکن باقی تزئینی کام کا بیشتر حصہ بعد کے زمانے کا ہے۔ اس طرح ہم قبۃ الصخراء میں یہ دیکھتے ہیں کہ گنبدی نقشہ، نیم قوسی کمانوں کا استعمال، چوبی جوڑ، اور غالباً پچی کاری نئی جدتیں ہیں۔ نیم قوسی کمان قطعی طور پر عربوں کی ایجاد نہ تھی، چوبی جوڑں کی اصل مشتبہ ہے، اور پچی کاری کا قدیم ترین استعمال اسلام سے پہلے کی چیز ہے۔

قبۃ الصخراء کے بعد ترتیب زمانی کے لحاظ سے دوسری اہم اسلامی عمارت دمشق کی جامع کبیر ہے جو آٹھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں تعمیر ہوئی۔ اس کا صدر ایوان یا حرم ایک شاندار کمرہ سا ہے۔ جس میں اسے صحن سے الگ کرنے والی کمانوں کے اندر دروازے یا جالیاں بنی ہوئی ہیں۔ صحن کی باقی تین سمتوں کو بھی چھتے دار برآمدے گھیرے ہوئے ہیں۔ صدر دالان کے ساتھ تین بغلی دالان ہیں، عرضی حصے کے ختم پر یعنی صدر دالان کی شمالی دیوار کے وسط میں محراب ہے جو قبلہ یا سمت کعبہ کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مرکزی صحن کو گھیری ہوئی کچھ کمانیں پایوں پر اور کچھ کمانیں ستونوں پر اٹھائی گئی ہیں۔ یہ کمانیں گھڑ نعلی شکل کی ہیں۔ کمانوں کی یہی گھڑ نعلی شکل آگے چل کر مغربی اسلامی فن تعمیر کی خصوصیت بننے والی تھی جس کے اسباب کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں۔ مگر گھڑ نعلی کمان مدوّر یا سرے پر نوکدار ہوتی ہے لیکن بہر صورت اس کا جماؤ جست کے خط کے نیچے ہی ہوتا ہے۔ دمشق میں مدوّر گھڑ نعلی کمان استعمال کی گئی ہے صدر چھتے کے اوپر پورے صحن کے اطراف نیم

قوسی محرابوں والے دریچے ہر کمان پر دو دو کے حساب سے بنائے گئے ہیں جس رومی معبد کے احاطے (TEMENOS) کے چار گوشوں کے اندر یہ مسجد بنائی گئی ہے اس کے ہر گوشے پر ایک برج بنا ہوا تھا۔ ان ہی برجوں کو عربوں نے میناروں کی طرح استعمال کیا۔ اب ان چار برجوں میں سے صرف ایک برج (شمالی مغربی گوشے پر) باقی رہ گیا ہے دوسرے مینار بعد کے زمانے کے ہیں۔ عمارت کا اندرونی حصہ مرمر پچی کاری اور رنگین شیشوں کے بڑے بڑے دریچوں سے سجایا گیا تھا۔ مسجد کے عام نقشوں سے اس مسجد کا نقشہ غالباً اس لیے الگ ہے کہ یہ مسجد میں تبدیل کیے ہوئے شامی کلیساؤں سے متاثر ہے۔ کلیسا کی طرح اس میں عرضی حصے کا داخل کرنا اور حرم کے وسط میں گنبد کا بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے مقصود قبلہ کی اہمیت کو واضح کرنا تھا، اور یہ قبلہ نما تیسری بار ایک محراب کی صورت میں بنایا گیا ہے۔ محراب ممکن ہے خود عربوں کی اپنی ایجاد ہے۔ دنیا کے ایک ایسے حصے میں جہاں آنکھوں کی بیماریاں بہت عام ہیں، جیسا کہ ایک بوڑھے شیخ نے مجھ سے ایک بار کہا تھا، محراب کو مجوف صورت میں اس لیے بنایا گیا کہ دیواروں کو چھو چھو کر اپنا راستہ طے کرنے والا اندھا آدمی فوراً اسے پہچان لے۔ یا ممکن ہے محراب نصرانی نیم توسی طاق (Ajisc) سے لی گئی ہو۔ گھڑ نعلی کمان قبل اسلام عمارتوں میں پائی گئی ہے جو پتھر میں تراشی گئی ہے لیکن دمشق میں اس کا ظہور ان اولین مثالوں میں سے ایک ہے جہاں یہ حقیقی تعمیری مقصد کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ مینار کا مقصد بالکل واضح ہے۔ اس سے مؤذن کے لیے ایک ایسی اونچی جگہ مہیا کرنا تھا جہاں سے وہ مومنوں کو نماز کے لیے بلا سکے۔ یہ صد اعبادت گذاروں کو بلانے کے لیے لوہے کا ٹکڑا پیٹ کر آواز بلند کرنے (گھنٹے بجانے کی رسم شروع ہونے سے پہلے) کی نصرانی رسم اور یہودیوں کے بوق بجانے کے رواج کے مقابل ارادتاً ایجاد کی گئی ہے۔ اس مینار کے استعمال کی پہلی مثال دمشق میں نظر آتی ہے۔

قدیم ترین باقی ماندہ مینار تونس سے قریب قیروان کی جامع کبیر کا مینار ہے اور تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ مینار خلیفہ ہشام (۷۲۴ء - ۷۴۳ء) کے عہد میں بنا ہے۔ یہ ایک زبردست اور بھاری بھر کم عمارت ہے اور اوپر کی طرف قدرے گاؤدم ہوتی گئی ہے۔ سب سے اوپر گھڑ نجیا برجیاں بنائی گئی ہیں اس پر دو منزلیں ہیں، جن میں سے ایک بعد کے عہد

کی ہے اگر یہ بھی درست ہو کہ دمشق کے چاروں مربع مینار پہلے مینار تھے جو اس مقصد کے لیے استعمال ہوئے تب بھی قیروان کے مینار کی بالکل سیدھی سادی سی عمارت کی اصل کو شام یا کسی اور خاص مقام سے منسوب کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی یہ ایک مذہبی ضرورت کی ایک مثال ہے جو کسی بناؤ کے بغیر نہایت سیدھے سادے انداز میں پوری کی گئی ہے اس کے سوا قیروان کی مسجد جامع مسجد طرز کی ہے۔ اس میں اکثر ردوبدل ہوئے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے اس کی وہی صورت برقرار رکھی گئی جیسی کہ وہ نویں صدی کے آخر میں بنائی گئی تھی تونس کی جامع الزیتونیہ جو ۷۳۲ء میں بنی ہے جامع مسجد طرز کی ایک اور ابتدائی اور دلچسپ مثال ہے۔ یہ مسجد ایسے چھتوں سے بنائی گئی ہے جس کی کمانیں ناخوشگوار قسم کی ہیں اور ان کمانوں کو عہد قدیم کے ستون اٹھائے ہوئے ہیں۔ کمانوں کے سرِدلوں کے اوپر چوبی کندے یا پر کالے ہیں جو جوڑ دینے والی چوبی شہتیروں سے مربوط ہیں۔ اس تدبیر نے بہت سی ابتدائی اسلامی عمارتوں کے حسن و خوبی کو متاثر کر دیا ہے۔ اسپین میں قرطبہ کی جامع مسجد ۷۸۶ء میں بنی شروع ہوئی وہ اسی سلسلے کی ایک عمارت ہے۔ اس کا رقبہ دسویں صدی میں پہلے رقبہ سے دُگنے سے بھی زیادہ کر دیا گیا۔ لیکن اس کی اصلی شکل اب بھی اس کی موجودہ عمارت کے بغور مطالعہ سے پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ ایک جامع مسجد تھی اس کا حرم بہت گہرا بنایا گیا تھا۔ حرم میں گیارہ بغلی دالان تھے جنہیں چھتے دے کر ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تھا اور ہر چھتے میں بیس ستون تھے۔ یہ ستون مذکورہ بالا صورتوں کی طرح قدیم رومی عمارتوں سے حاصل کیے گئے تھے۔ حرم کے زبردست حجم کی وجہ سے اس کے لیے متوازن بلندی کی چھت بنانا ضروری ہو گیا تھا۔ حقیقت میں اس کے لیے اس سے بھی اونچی چھت بنانا ضروری ہو گیا تھا جتنی کہ قابل حصول معمولی ستونوں پر بنی ہوئی گھڑ نعلی کمانیں اٹھا سکتی تھیں۔ اس لیے کمانوں کا ایک اور سلسلہ بلند تر سطح پر بنایا گیا۔ اس کی وجہ سے ایک گنجلک اور مضطرب سا اثر پیدا ہو گیا۔ جو کچھ خوشگوار نہیں۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہلے سے بنے ہوئے قدیم ستونوں کے استعمال نے قیروان اور قرطبہ دونوں جگہ چھتے کی صورت گری کو متعین کر دیا۔ اس کے برخلاف اگر یہاں اینٹ یا پتھر کے پائے استعمال کیے جاتے یا عمارت کے لیے خاص طور پر بنائے ہوئے بلند تر ستونوں سے کام لیا جاتا

تعمیر کار کے لیے اس ناخوشگوار صورت سے اپنا دامن بچالینا ممکن ہوتا۔ قرطبہ کی پوری مسجد کو ایک اونچی پختہ دیوار سے گھیر اگیا تھااور پورے صحن کے اطراف چھتے تھے۔

اب ہمیں عراق (مسوپٹمیا) کی طرف لوٹ چلنا چاہیے جہاں اینٹ چونے میں کئی مسجدیں بنائی گئی ہیں۔ مسجدوں کا یہ سلسلہ اس ملک کی روایتی طرز میں بنا ہے۔ اسی سلسلہ کے ایک سرے پر مدینہ کی اولین مسجد ہے اور آخر میں قاہرہ کی مشہور جامع ابن طولون ان درمیانی مسجدوں کی مثالوں میں قابل لحاظ اخیضر، رقہ، ابودلف اور سامرہ کی مسجدیں ہیں۔ ان میں سے پہلی دو مسجدوں کے بارے میں اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی کے آخر کی ہیں اور آخر الذکر مسجدیں نویں صدی کے وسط کی ہیں۔ ان تمام مسجدوں میں ساسانی تعمیر کاری کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان سب کو جامع مسجد کے نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اخیضر کی مسجد جس کا حال بڑے دلکش انداز میں آں جہانی گر ٹروڈبل نے اپنی عالمانہ کتاب میں بیان کیا ہے۔[1] ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہیں نکیلی کمان اپنی اولین صورت میں ملتی ہے۔ یہی نکیلی کمان آگے چل کر مغربی گوتھک فن تعمیر کی نمایاں ترین خصوصیت بننے والی تھی۔ ساسانیوں کی مخصوص کمان نیم قوسی کمان ہے، لیکن کبھی کبھار نکیلی کمانوں کے ابتدائی نمونے بھی نظر آجاتے ہیں۔ گھڑ نعلی کمانیں غالباً اس سے پہلے عراق (مسوپٹمیا) میں استعمال ہوئی ہیں۔ ایسی بہت سی کمانیں شاہی کلیساؤں میں (مثلاً قصر ابن وردان کے کلیسا میں) موجود ہیں اور اطالیہ کے شہر چیوزی Chiusi میں تو واقعتاً یونانی کمانوں کی ایک مثال دکھائی دیتی ہے۔ اخیضر کی کمانیں بیضوی نکیلی اور قدرے اونچے ستون دے کر بنائی گئی ہیں، سامرہ کے قریب ابودلف میں وہ خم اختیار کرلیا ہے جو بعد کے اسلامی فن تعمیر کی خصوصیت بن گئی اور یہی شکل آٹھویں صدی کے آخر تک عراق (مسوپٹمیا) میں کمانوں کی تمام شکلوں کی جگہ لینے لگی اس سے بہت پہلے کی نکیلی کمانیں کہیں کہیں ہندوستان میں ٹھوس پتھر میں کٹی ہوئی ملتی ہیں لیکن یہ پتھر میں کٹی ہوئی ہیں اس لیے حقیقت میں وہ کمانیں بالکل نہیں ہیں۔ (جاری ہے)

---

[1] جی۔ ایل۔ بل "اخیضر کا قصر اور مسجد" (آکسفورڈ ۱۹۱۴ء)

تیسری قسط

زمینداری اور جاگیرداری کا
تاریخی پس منظر

از جناب مولوی تقی الدین صاحب بہاری

زمانۂ خلافت کے اہل قطائع

ذیل میں چند ان لوگوں کے نام دیئے جاتے ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین نے قطائع دئے تھے۔

(۱) رسول اللہؐ نے ابو بکرؓ و عمرؓ کو قطیعہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۲) حضرت علقمہؓ کو حضر موت میں ایک زمین دی تھی (ترمذی)

(۳) حضرت زبیرؓ کو زمین کا ایک بڑا حصہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۴) حضرت بلال بن حارث کو "وادی عقیق" عطا کیا تھا (الاموال)

(۵) فرات بن حیان عجلیؓ کو "یمامہ" میں ایک زمین دی تھی (الاموال)

(۶) یمامہ کے بعض دوسرے لوگوں کو بھی بنجر زمین دی تھی (الاموال)

(۷) عبداللہ بن مسعودؓ کو مدینہ میں مکان دیئے تھے۔ (مشکوٰۃ)

(۸) ابو رافع کے خاندان کو بنجر زمین کا ایک بڑا حصہ دیا تھا (الخراج لابی یوسف)

(۹) انصار میں سے ایک شخص سلیطؓ نامی کو زمین دی تھی (الاموال)

(۱۰) عبدالرحمن بن عوفؓ کو زمین دی تھی (مسند امام احمد)
بنجر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لئے رسول اللہ نے عام اعلان کر دیا تھا کہ زمین اللہ کی ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں جو شخص بھی بنجر زمین کو زیر کاشت لا سکتا ہے لائے وہ زمین اسی کی ملک ہو گی (نصب الرایہ والخراج لابی یوسف)
رسول اللہ کے بعد خلفاء راشدین نے بھی اس سلسلہ کو قایم رکھا اور متعدد صحابہ مثلاً سعد بن وقاصؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، نافعؓ، خبابؓ، زبیرؓ، اسامہ بن زیدؓ، عمار بن یاسرؓ، سعد بن مالکؓ وغیرہ کو قطائع دیئے۔ اور عام اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی بنجر زمین کو آباد کرے گا وہ اس کی ہو جائے گی (بخاری والاموال والخراجین)
زمانۂ خلافت میں اس طرح بہت سی بنجر زمینیں لوگوں کے استعمال میں آ گئی تھیں اس سلسلہ میں مزید سہولتوں کا پتہ حسب ذیل تصریحات سے چلتا ہے۔
حضرت عمرؓ نے بصرہ کے گورنر ابو موسیٰؓ اشعری کو "قطائع" کے بارے میں جو فرمان لکھا تھا اس کی دفعات یہ ہیں۔
(۱) "قطائع" دینے میں کسی کا نقصان نہ ہو۔
(۲) خراجی زمین نہ ہو (جو بالعموم کاشتکاروں کی ملکیت ہوتی تھی)
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنر کے نام یہ فرمان لکھا تھا۔

" جتنی خالصہ (سرکاری) آراضی ہیں لوگوں میں تقسیم کر دو اور پیداوار کی حیثیت کے مطابق خلافت کو جتنا بھی وہ ٹیکس ادا کر سکیں اس کو منظور کر لو۔ اگر زمین زیادہ خراب ہے تو مفت دے دو۔ اور اگر آبادکاری کے لئے کوئی شخص نہ تیار ہو تو سرکاری خزانے کے اخراجات سے کاشت کراؤ۔ مگر زمین خالی نہ رہنے دو[۱] "

تاریخ کے طلباء پر یہ بات واضح ہے کہ جن بزرگوں کے نام قطائع کے سلسلہ میں درج کیے گئے وہ سب خدمت خلق کے لئے وقف تھے۔ ان کے علاوہ اہلِ قطائع کاشتکار ہوتے جو خود کاشت کر کے خود بھی منتفع ہوتے اور سرکاری ٹیکس کی ادائیگی کے ذریعہ مفادِ عامہ کی بھی خدمت کرتے تھے۔

---

[۱] الخراج لیحیٰی ص ۶۳

تاریخ خلافت میں ایک نظیر بھی اس کے خلاف نہیں پیش کی جاسکتی کہ قطعات کسی کے پاس عیش و آرام کے سامان بنے ہوں۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف زمانۂ خلافت کے تمام قطائع کے متعلق یہ کلیہ بیان کرتے ہیں۔

"بہت سی روایتیں اس بات کے ثبوت کے لئے موجود ہیں کہ رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفاء نے لوگوں کو قطائع دیئے تھے، رسول اللہ نے تالیف قلوب کے لئے آراضی کو قابل کاشت بنانے کے لئے قطائع دیئے تھے۔ ایسے ہی خلفاء نے جن لوگوں کو قطائع دیئے وہ وہی لوگ تھے جن کا اسلام میں کوئی فائدہ تھا اور وہ قیام امن وامان پر مامور تھے۔ رسول اللہ اور خلفاء نے اسی میں ملک و قوم کی بہتری سمجھی تھی اگر یہ بات نہ ہوتی تو کسی کو کسی کا حق دینے کا سوال ہی نہ تھا۔[1]"

الغرض قطائع ان لوگوں کو اس لئے نہ دیئے گئے تھے کہ اس کے ذریعہ وہ عیش و آرام کرسکیں بلکہ یہ قطعات ان کو معاش کی فکر سے آزاد کرکے خدمت خلق کے لئے وقف ہوجانے کا سامان کردیتے تھے۔ (جاری ہے)

---

[1] الخراج ص ۶۲ الاموال ص ۲۷۹

میرزا جلال اسیر اصفہانی

ڈاکٹر وجیہہ الدین، لیکچرر شعبۂ فارسی، دانش گاہ مہاراجہ سایا جی راؤ، بڑودہ گجرات

مرزا محمد جلال الدین المتخلص بہ اسیر ستر ہویں صدی کا یہ ناز شاعر ہے حالانکہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا لیکن اس نے ہندوستان کے متعدد شعرا کو متاثر کیا مرزا غالب بھی اس سے متاثر معلوم ہوتے ہیں (۱) صاحبانِ تذکرہ ہیشہ بہار (۲) تذکرہ حسینی (۳) نے شاعر کا نام مرزا جلال اسیر لکھا ہے کلمات الشعرا (۴) تذکرہ منتخب اللطائف (۵) نتائج الافکار (۶) نے شاعر کا نام مرزا جلال اسیر لکھا ہے۔ لیکن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق شاعر کا نام مرزا جلال الدین محمد ہے (۷) اور گنج سخن کے مصنف نے میرزا سید جلال الدین اسیر اصفہانی لکھا ہے (۸) تذکرۃ الشعرا میں اس کا نام میرزا جلال الدین تحریر ہے (۹) صائب اصفہانی نے جو جلال اسیر کا ہم عصر ہے اس کی شعر گوئی کی پیروی میں یقین رکھتے ہوئے اس کا نام میرزا جلال تحریر کیا ہے

خوشا کسی کہ چو صائب ز صاحبان سخن
تتبع سخن میرزا جلال کند۔ (۱۰)

اسی طرح ابو طالب کلیم نے جو جلال اسیر کا معاصر ہے اس کی استادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا نام میرزا جلال الدین رقم کیا ہے۔

میرزای ما جلال الدین بس است | از سخن سنجاں طلب گار سخن
راستی طبعش استاد من است | کج نہم بر فرق دستار سخن (۱۱)

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعر کا نام میرزا جلال الدین محمد تھا یہ ایک سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا در اصل میرزا امیرزادہ کا مخفف ہے جس کی نسبت سیدوں سے ہے۔ اور مرزا تیموریوں کے لئے لکھا جاتا تھا۔

عربک اینڈ پرشن مینسکرپٹ ان دی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کے کیٹلاگ کا مؤلف صحف ابراہیم کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "شاہ صفی کے زمانے میں (۱۶۲۹ – ۴۲ ۱۶ ۱۰۳۸ – ۱۰۵۲ ہجری) جلال اسیر کو کچھ عرصہ کے لئے قید میں رکھا گیا تھا اسی وجہ سے اس نے اپنا تخلص اسیر رکھا لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ (۱۲) جلال الدین اسیر اپنے تخلص کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔

من تخلص میکنم چوں دل اسیر
تاگرہ از زلف عنبر سا کشود (۱۳)

جہاں تک جلال اسیر کی تاریخ پیدائش کا تعلق ہے تو عام طور پر تذکرہ نگار اس کے متعلق خاموش ہیں اس کی کلیات میں بھی اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ البتہ کچھ تاریخی کتابوں اور تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ذبیح اللہ صفا نے اپنی کتاب گنج سخن میں جلال اسیر کی تاریخ پیدائش ۱۰۲۹ ہجری / ۱۶۱۹ عیسوی (۱۴)۔ عربک اینڈ پرشن مینسکرپٹ ان دی اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کیٹلاگ کے مصنف نے اس سلسلہ میں دلچسپ بحث کی ہے۔ "ہمیشہ بہار کا مصنف اور مراۃ عالم کا مصنف شاعر کی وفات ۱۰۴۰ ہجری / ۱۶۳۰ عیسوی لکھتے ہیں۔ لیکن جلال اسیر کے دیوان میں ۱۰۴۴ ہجری اور ۱۰۴۵ ہجری کے تاریخی واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن صحف ابراہیم کے مصنف کا خیال ہے کہ اسیر چالیس سال کی عمر میں ۱۰۶۹ ہجری ۱۶۵۸ عیسوی میں انتقال ہوا اگر صحف ابراہیم کے مصنف کی رائے تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جلال اسیر شاہ عباس اول کی وفات کے وقت جو ۱۰۳۸ ہجری / ۱۶۲۸ عیسوی میں

بیکسی اشک بہ تنہائی سخن دارد اسیر
کہ بعالم پدری یا پسری نیست مرا (۱۹)

جلال اسیر مرزا فصیح ہروی کا شاگرد تھا جن کا تعلق ہرات سے تھا جو خواجہ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری الہروی کے خاندان سے تھے مرزا فصیح ہروی کے دو شاگرد تھے جلال اسیر اور درویش والہ ہروی جلال اسیر اپنے استاد کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

آنانکہ مست فیض بہارند چون اسیر
تہ جرعۂ ز بزم فصیحی چشیدہ اند (۲۰)

کہتی از چمن فیض فصیحست اسیر
کہ ز ہر زمزمہ گلزار مقالی وارد (۲۱)

جہاں تک جلال اسیر کے اعتقاد کا تعلق ہے وہ اثنا عشری تھا۔ حضرت امام رضا سے اس کو خاص عقیدت تھی جس کا ذکر اس نے اپنے اشعار میں کیا ہے اور وہ خود حضرت امام رضا کے روضہ کا متولی بھی تھا۔ (۲۲)

ایمان ناقصی کہ ندارم بیا بہ بین
تسبیح را رشتۂ زنار ما مکن
ایمان محمد و علی و یازدہ امام
گفتم اسیر اینہمہ آزار ما مکن (۲۳)

فزون باد التفات شاہ بر ما آنقدر یارب
کہ گویندش اسیران صد مبارکباد ہر ساعت (۲۴)

مستی دارم مخموری نمیداند اسیر
ساغر از میخانہ شاہ خراسان میزنم (۲۵)

جلال اسیر کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف رائے ہے۔ گنج سخن کے مصنف ڈاکٹر ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا اسیر کی وفات ۱۰۶۹ ہجری/۱۶۵۸ عیسوی لکھتے ہیں۔(۲۶) جبکہ قاموس المشاہیر(۲۷) اور تذکرہ ہمیشہ بہار(۲۸) کے مطابق ۱۰۴۰ ہجری/۱۶۳۰ عیسوی ہے۔

تذکرۃ الشعراء (۲۹)، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (۳۰)، تذکرہ نتائج الافکار (۳۱)۔
۱۰۴۹ ہجری / ۴۰-۱۶۳۹ عیسوی بتاتے ہیں۔ تذکرہ ہمیشہ بہار کی اطلاع کے مطابق جلال اسیر شاہ عباس ثانی کے زمانے میں حیات تھا جو اس عبارت سے واضح ہے۔
"میرزا طاہر وحید بخدمت داروغلی اصطبل شاہ عباس ثانی (۱۰۷۷-۱۰۵۲ ہجری / ۱۶۶۷-۱۶۴۲ عیسوی) در اصطلاح آن ولایت میر آخور می نامند ما مور بود آخر بخدمت والا پائیگی دیوان رسید۔ چنانچہ میرزا جلال اسیر درین معنی گفتہ":

طاہر ما وزیر دیوان شد
رفتہ رفتہ قشو قلمدان شد (۳۲)

جلال اسیر کی کلیات میں مختلف تاریخی قطعات درج ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۴۵ ہجری / ۱۶۳۵ عیسوی تک حیات تھا اس لئے ہم کو اس کا سنہ وفات ۱۰۴۹ ہجری / ۱۶۳۹ عیسوی تسلیم کرنا چاہیئے اگر وہ اس کے بعد حیات ہوتا تو ممکن ہے کہ کچھ اور تاریخی قطعات لکھتا۔
تذکرہ ہمیشہ بہار کا مصنف لکھتا ہے کہ جلال اسیر شراب کا دلدادہ تھا (۳۳) اور کیونکہ اس کی وفات کم عمری میں ہوئی ممکن ہے شراب کی زیادتی اس کا سبب ہو۔
زلالی خوانساری (وفات ۱۰۳۱ ہجری) جو شاہ عباس کا ملک الشعراء تھا۔ جلال اسیر کا شاگرد تھا۔ (۳۴) تمام تذکرہ نگار جلال اسیر کو سبک ہندی کا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ جلال اسیر نے اپنے کلام میں نئے استعارات نئی نئی تشبیہات اور نئے نئے خیالات اچھوتے انداز میں پیش کئے ہیں۔ شبلی نعمانی اور امیر شیر علی خاں لودھی (۳۵) اس کو خیال بندی کا بنیاد گزار بتاتے ہیں، جو سبک ہندی کا خاصہ ہے۔ جلال اسیر کے ہم عصر شعراء میں نظیری نیشاپوری، صائب تبریزی، ابو طالب کلیم، طالب آملی، حکیم شفائی، والہ ہروی

ملا محسن فیض کاشانی [illegible] کے نام قابل [illegible]

کلیات جلال اسیر ۱۳۰۷ ہجری میں مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ جس پر تقریظ خواجہ عزیز الدین لکھنوی نے لکھی تھی۔ لیکن اس میں جلال اسیر کے حالات زندگی سے متعلق کسی قسم کی تفصیل نہیں ملتی اور نہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس نسخہ کی مدد سے کلیات چھپی ہے اور وہ کہاں دستیاب ہے۔ اس کلیات میں قصائد، قطعات، مثنوی، غزلیات مخمسات، رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں جلال اسیر نے اتنی ضخیم کلیات چھوڑی ہے اس سے اس کی پر گوئی اور نادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ اسیر اپنی زندگی میں کبھی بھی ہندوستان نہیں آیا لیکن بیرون ایران خاص کر ہندوستان میں اس کی کلیات کے نسخے تقریباً ہر بڑی لائبریری میں موجود ہیں مثلاً مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور پٹنہ، ملا فیروز لائبریری بمبئی، آصفیہ لائبریری حیدر آباد، نیشنل میوزیم نئی دہلی، عربک پرشن انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان، ہندوستان کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور پاکستان، ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری ڈھاکہ بنگلہ دیش وغیرہ میں کلیات جلال اسیر کے نسخے موجود ہیں جس سے اس کی ایران سے باہر شہرت کا پتہ چلتا ہے نمونہ کے طور پر جلال اسیر کی چند غزلیں پیش ہیں۔

(۱)

دوش ساز نالہ با آہنگ بود | با زمین و آسمان در جنگ بود
بادۂ نازک کہ بی تو پر نکرد | شیشۂ ما خانہ زاد سنگ بود
در گلستان دیدمش نشناختم | بر تنش پیراہن گل تنگ بود
این دو رنگیہا ز رشتیہای ماست | نور و ظلمت پیش ازین یکرنگ بود

با شور کعبه جوئیها اسیر
جنبش مژگان بده فرسنگ بود

۲

مستی کرد میکدهٔ عید کشاید | صد رنگ گل از توبهٔ جاوید کشاید
رنگین صفِ حیرت. تمنای نگاهی | مژگانِ تو خون از رگ امید کشاید
برداشتهٔ جلوهٔ سرویست غبارم | از شبنم انجم گلِ خورشید کشاید
گلزار محبت چقدر شوخ بهارست | از گلبن کثرت گل توحید کشاید
خار و گل حسرت نشود کام دو عالم | بر اوی چه مطلب در امید کشاید

جائیکه اسیر تو کند باده گساری
حسرت گره از خاتم جمشید کشاید

۳

مستم و آن چشم شهلا در نظر | شوخ میر قصد تماشا در نظر
بستهٔ آئین گریهٔ مژگان مرا | قطرهٔ خونیست دریا در نظر
مشقِ باران میکند مژگانِ من | کاغذ ابریست صحرا در نظر
پیچ بر پیچست خون خواب و خمار ، | حسن رنگ آمیز دیبا در نظر

جلوهٔ سر کرده می ریزد اسیر
برگِ گل از خار آن پا در نظر

۴

شوقِ تو خریدار چرا جان نفروشم | هستی چه متاعیست که ارزان نفروشم

حیرت بسلیم نیخرد از یاد نگاہی — چون سرمۂ حیرت بسلیمان نفروشم
بابی پر و بالان نکنم دعویٔ پرواز — خاشاک بایں شعلہ سواران نفروشم
رفتم چہ دعا کار بیاران نفرستم — داغ چہ چمنہا بخیابان نفروشم
غمنامۂ دردت بمسیحا ننویسم
بی برگیٔ داغت بگلستان نفروشم

(۵)

بسویم آمدی شیدای خویشم ساختی رفتی — بایں روزم نشاندی بیوفا انداختی رفتی
چہ رنگی کشتم از تاراج شوخی فریں بادا — زدی بستی و کشتی سوختی پرداختی رفتی
چہ رحمست این چہ انصافست ظالم اختراع این — زدی صیدی بخاک رہ فگندی تاختی رفتی
مروت اینچنیں عاجز نوازی اینچنیں باید
زپا افتادۂ دیدی و قد افراختی رفتی

منابع

(۱) خورشید الاسلام۔ غالب، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی ۱۹۷۵، اشاعت دوم صفحہ ۲۸، ۲۹۔

(۲) کشن چند اخلاص مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، انجمن ترقی اردو۔ پاکستان، صفحہ ۶، ۱۹۷۳ء

(۳) میر حسین دوست، منشی نولکشور، لکھنؤ ۱۸۷۵، صفحہ ۴۱

(۴) محمد افضل سرخوش، بتصحیح صادق علی دلاوری، لاہور ۱۹۴۲، صفحہ ۳

(۵) رحیم علی خان امام، بتصحیح سید محمد رضا جلالی نائینی و سید امیر حسن عابدی، ایران ۱۳۴۹ شمسی، صفحہ ۶۳۔

(۶) مولانا محمد قدرت اللہ گوپاموی، بمبئی، ۱۳۳۶ ہجری، صفحہ ۴۷۔

(۷) (New edition) Vol. I (A-B) Netherland, 1960, P. 707

(۸) ذبیح اللہ صفا، جلد سوم، تہران، ۱۳۴۰ شمسی، صفحہ ۱۰۲

(۹) مولانا عبدالغنی خاں، تصحیح محمد مقتدا خاں شیروانی، علی گڑھ، ۱۹۱۶، صفحہ ۱۳

(۱۰) مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام (سرو آزاد) بتصحیح عبداللہ خاں (فصل دوم) لاہور ۱۹۱۳، صفحہ ۵۳ -

(۱۱) ایضاً -

(۱۲) Moulavi Abdul Muqtadir Khan, Vol. III London, 1912, P. 65

(۱۳) کلیات میرزا جلال اسیر نسخہ خطی (ا یونیورسٹی گلشن نمبر ۲۸، فارسیہ نمبر ا نظم) مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ -

(۱۴) جلد سوم، صفحہ ۱۰۲ -

(۱۵) مولوی عبدالمقتدر خاں، جلد سوم صفحہ ۶۶ - ۶۵ -

(۱۶) کلیات مرزا جلال اسیر (مطبوعہ منشی نول کشور) لکھنؤ ۱۲۹۰ ہجری، صفحہ ۳۳ -

(۱۷) محمد طاہر نصرآبادی، تذکرہ نصرآبادی، بتصحیح وحید دستگردی (تاریخ طبع ندارد) دہلی یونیورسٹی لائبریری نمبر 2 K45. 17، 0164، صفحہ ۹۵ -

(۱۸) نصراللہ فلسفی، زندگانی شاہ عباس اول، جلد دوم، تہران ۱۳۴۷ شمسی ص ۲۰۲ -

(۱۹) کلیات مرزا جلال اسیر مطبوعہ نول کشور، صفحہ ۱۵۰

(۲۰) کلیات میرزا جلال اسیر (نسخہ خطی ذاتی) ورق ۱۵۵ - الف

(۲۱) کلیات مرزا جلال اسیر، مطبوعہ نول کشور، صفحہ ۲۸

(۲۲) نصراللہ فلسفی، ایضاً، صفحہ ۲۰۲ -

(۲۳) کلیات مرزا جلال اسیر، مطبوعہ نول کشور، صفحہ ۳۶۲ - ۳۶۱ -

(۲۴) ایضاً صفحہ ۲۱۸ -

(۲۵) کلیات میرزا جلال اسیر (نسخہ خطی ذاتی) ورق ۲۳۲-ب
(۲۶) جلد سوم صفحہ ۱۰۳
(۲۷) مرثیہ نگاری بدایونی، جلد اول، بدایوں، ۱۹۲۴، صفحہ ۸۲ -
(۲۸) کشن چند اخلاص، صفحہ ۷-۶ -
(۲۹) مولانا عبدالغنی خاں، صفحہ ۱۳ -
(۳۰) جلد اول، صفحہ ۷۰۷ -
(۳۱) مولانا محمد قدرت اللہ گوپاموی، صفحہ ۷۴ -
(۳۲) کشن چند اخلاص، صفحہ ۷ -
(۳۳) کشن چند اخلاص صفحہ ۶ -
(۳۴) امیر شیر علی خاں لودھی تذکرہ مراۃ الخیال ۱۳۲۴ ہجری بمبئی صفحہ ۷۷
(۳۵) شعر العجم جلد ۳ نجم اعظم گڈھ ۱۹۵۷، صفحہ ۶۵ و تذکرہ مراۃ الخیال صفحہ ۷۶

صفحہ ۳۰ کا بقیہ

(۶۹) النووی۔ المجموع، ج ۱ ص ۵۴۔ ابن القیم۔ الاعلام، ج ۴ ص ۱۸۳-۱۸۸
(۷۰) الاعلام۔ لابن القیم۔ ج ۱ ص ۱۶۴
(۷۱) ایضاً ــــ ج ۴، ص ۱۹۶-۱۹۷
(۷۲) ایضاً ــــ ج ۴۔ ص ۱۹۷

(چوتھی قسط)

اسلامی دار الافتاء اور منصب مفتی

ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز ——— (کراچی یونیورسٹی)

مفتی کہ ان امور میں ضعف کے باعث اسے تخریج سے منع کیا جائے۔ مفتی کیلئے ممکن ہے کہ اگر وہ تخریج اور ترجیح کا اہل نہ ہو تو وہ ان ائمہ کے ذاتی اوصاف میں غور کر کے یہ نتیجہ نکالے کہ ان میں کس کی رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے۔ پھر ان میں سے بڑے عالم، متقی اور عمر رسیدہ کی رائے کو ترجیح دے۔ اور اگر تمام ایک دوسرے سے بعض اوصاف کے اعتبار سے ممتاز ہوں تو پھر ترجیح اس کو دے جو زیادہ صائب الرائے ہو، ایسا بڑا عالم مقدم ہوگا جو متقی بھی زیادہ ہو بہ نسبت اس زیادہ متقی کے جو عالم ہو۔ ترجیح کا یہ اصول اسی طرح ہے جس طرح احادیث میں راویوں کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں اس وقت کیا جاتا ہے جب تعارض روایات پیش آئے۔ (۶۴)

مفتی مقلد اپنے مذہب کی کن کتب پر اعتماد کرے؛

مفتی کو چاہیئے کہ وہ ایسی کتابوں سے فتویٰ نہ دے جو غیر مشہور و گمنام ہوں یا جن کے مندرجات کی صحت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اسی طرح ایسی نئی کتابیں جن میں منقول عبارات کا کتب معتبرہ سے منقول ہونا ثابت نہ ہو یا جن کے مصنفین کی عدالت و ثقاہت کا یقین نہ ہو۔ اسی طرح اگر نفس حکم ان کتب کے حواشی یا تعلیقات سے ثابت ہو اور وہ بھی نامعلوم

اصل سے منقول ہوں اور امہات الکتب میں وہ حکم نہ پایا جائے نہ ان کے حوالہ جات مذکور ہوں نہ وہ واضح خط سے تحریر کردہ ہوں تو ایسی عبارات سے فتاوٰی میں استدلال درست نہیں۔

تاہم ایسی کتب مشہورہ جو علماء کے ہاں معروف ہوں اور جن کے بارے میں علماء کی تصدیق موجود ہو کہ ان میں کوئی تحریف یا رد و بدل نہیں ہوا ہے تو ایسی کتب سے فتوٰی دینا جائز ہے اگرچہ اصول تو یہ ہے کہ فتوٰی ایسی کتب سے دیا جائے جن کو ثقہ اور عادل علماء نے روایت کیا ہو اور ان سے اس مجتہد نے اکتساب کیا جس کا یہ مفتی مقلد ہے تاکہ اس کے لئے ان کتب کی صحت ایسی بے غبار ہو جائے جیسے مجتہد کے لئے احادیث کی۔ کیونکہ ہر دو صورتوں میں اللہ کے دین کو نقل کرنا مقصود ہے مگر لوگوں نے اس معاملہ میں وسعت پیدا کر لی ہے اور متقدمین کی ایسی کتب مشہورہ سے اخذ کو جائز قرار دیا ہے جن میں رواۃ کا سلسلہ اگرچہ مذکور نہ ہو، جیساکہ نحو اور عربی زبان کی کتابوں میں سند اور رواۃ کا سلسلہ متروک ہو چکا حالانکہ عربی کی کتابیں ہی کتاب و سنت کی اساس ہیں۔ اسی طرح فقہ کی کتابوں میں بھی سلسلہ رواۃ کا ذکر اب غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ اطمینان ہو چکا ہے کہ ان میں کوئی تحریف ہوئی ہے اور نہ رد و بدل۔ (۶۵)

علامہ عزالدین ابن عبدالسلام سے مفتیٔ مقلد کے بارے میں پوچھا گیا جو ایسے قول سے فتوٰی دیتا ہو جس کی نسبت اس کے امام مذہب کی طرف ہے اور اس مفتی نے روایت کے اصولوں کے مطابق یہ قول اپنے امام مذہب سے نہیں لیا بلکہ صرف امام مذہب کی کتب کے مطالعہ سے حاصل کیا ہے تو کیا یہ ایسے قول کو فتوٰی میں پیش کر سکتا ہے۔؟ اس کے جواب میں علامہ نے کہا: فقہ کی صحیح کتب پر اعتماد کرنا جن کی توثیق ہو چکی، علماء عصر کے ہاں متفق علیہ ہے کیونکہ ان کتابوں کو ایسی ہی ثقاہت حاصل ہو چکی ہے جیسی سند

و روایت کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں نے نحو، لغت، طب اور دیگر تمام علوم کی مشہور کتابوں پر اعتماد کیا ہے کیونکہ انہیں بھی ثقاہت و اعتماد کی سند مل چکی اور ان میں رد و بدل کا خدشہ بعید از قیاس قرار پا چکا۔ اب جو کوئی یہ سمجھے کہ لوگوں نے ان کتابوں پر اعتماد کر کے غلطی کی ہے تو وہ خود غلطی پر ہے کیونکہ اگر اس اعتماد کا جواز نہ ہو تو بہت سے معاملات جن کا تعلق طب، نحو اور عربی زبان کے حوالہ سے شریعت سے ہے وہ سب معطل ہو کر رہ جائیں۔ شریعت بہت سی صورتوں میں الجبار کے اقوال سے رجوع کرتی ہے جبکہ طب کی زیادہ تر کتابوں کا تعلق قوم کفار سے ہے لیکن جب ان کتابوں میں دنبع و تدلیس کا امکان نہیں اور ان پر اعتماد ہو چکا جیسا کہ اشعار میں۔ کہ عرب کے کافر شعراء کے کلام پر اعتماد کیا گیا، اسی طرح ان پر بھی اعتماد کا معاملہ ہے (۶۶)

الزرکشی نے ابو اسحاق اسفرائنی سے نقل کیا ہے (۶۷) کہ انہوں نے معتمد کتابوں سے نقل کرنے کے جواز پر اجماع بیان کیا ہے اور اس میں مؤلف تک اتصال سند کی شرط بھی عائد نہیں کی۔ ابن الصلاح نے کہا ہے کہ اگر کسی کتاب کے کسی نسخہ کی صحت کا یقین ہو تو یوں کہنا چاہیئے "فلاں نے یوں کہا ہے" ورنہ کسی کے قول کو یونہی لفظ یقین کے ساتھ بیان نہ کرنا چاہیئے۔ امام سیوطی نے اس کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"آجکل لوگ کتب سے نقل کرتے ہیں اور منقولہ عبارات کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف ظاہر کرتے ہیں" (۶۸)

اس طرح کسی بھی فقہی مذہب کی کتب معتمدہ سے فتویٰ دینے کے جواز پر اتفاق ہے۔ اگرچہ براہِ راست ان کے مصنفین سے روایت نہ بھی لی گئی ہو۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام، شہاب الدین القرافی، برہان الدین ابن فرحون، بدرالدین الزرکشی، جلال الدین السیوطی اور ابو اسحاق اسفرائینی نے اس پر اجماع بیان کیا ہے۔

عامی کا عامی کو فتویٰ دینا:

کیا کسی عام آدمی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی عام آدمی کو ان معلومات کی بنار پر فتویٰ دے دے جو اس نے علمار سے سنی یا حاصل کی ہوں؟ یہ سوال ایک سے زائد علمار اور کبار فقہار نے چند مسائل کے حل کے سلسلہ میں اٹھایا ہے اور اس کے جواب میں جو اقوال سامنے آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

پہلا قول:۔ یہ مکمل ممانعت کا قول ہے صاحب "الحاوی" کی رائے میں یہی صحیح تر ہے کیونکہ عام آدمی میں استدلال کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ اسے شرائط استدلال کا علم ہوتا ہے اور وہ کسی ایسی بات کو دلیل خیال کرتا ہے جو کہ دراصل دلیل نہیں ہوتی ہے۔

دوسرا قول: یہ جواز کا قول ہے۔ بشرطیکہ مسئلہ کی دلیل قرآن وسنت سے ہو اور اگر ان دونوں کے علاوہ دلیل ہو تو جائز نہیں کیونکہ کتاب وسنت کے مخاطب تو سبھی لوگ ہیں، تو جس طرح ایک شخص پر لازم ہے کہ اسے کتاب وسنت کا جو پہونچا ہو وہ اس پر عمل کرے اس طرح کسی دوسرے کو قرآن وسنت سے رہنمائی فراہم کرنا اور اس سے آگاہ کرنا بھی اس کے لئے جائز ہے۔

قول ثالث:۔ یہ جواز مطلق کا ہے۔ کیونکہ عام آدمی کے پاس بھی علم اس واقعہ کی دلیل کے ساتھ اسی طرح پہنچا ہے جس طرح کہ ایک عالم کے پاس۔ اگر کوئی عالم اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اس کے پاس علمی مہارت و ملکہ ہے جس کی بنار پر وہ کسی دلیل پر قائم رہتا اور دلیل مخالف کو رد کر سکتا ہے تو عامی آدمی کے پاس بھی تو دلیل اور علم ہی ہے۔ اس کی تائید میں ابن القیم کہتے ہیں "یہ تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام پہنچانے کا سلسلہ ہے پس جو کوئی بھی یہ کام کرے اسلام

بنے اللہ اسکو مجذلے خیر دے۔ اگرچہ ایک کلمہ خیر ہی کی تبلیغ کیوں نہ ہو!! انہوں نے اس مسئلہ میں اپنی تعلیق ان الفاظ پر ختم کی ہے " کسی عام آدمی کو ایسا شرعی مسئلہ بتانے سے روکنا جو وہ جانتا ہے۔ خطائے محض ہے۔ اللہ توفیق بخشے"! (۶۹)

مفتی کی ادبی اور مادی ذمہ داریاں:

مفتی کی اخلاقی اور ادبی ذمہ داری سے کسی کو اختلاف نہیں کیونکہ فتویٰ دراصل اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تبلیغ پیغام ہے۔ اس سلسلہ میں مفتی کی ذمہ داری انتہائی اہم ہے۔ کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بولتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ نے یوں حکم دیا ہے یا اس طرح منع کیا ہے۔ یا اللہ نے یوں واجب قرار دیا ہے اور یوں حرام ٹھہرایا ہے (۷۰) اسی بنیاد پر ابن القیم نے اپنی معروف کتاب فتویٰ و قضاء کا نام " اعلام الموقعین عن رب العالمین" رکھا ہے۔

مفتی کی ادبی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ مادی ذمہ داری بھی مفتی پر عائد ہوتی ہے اور وہ یوں کہ امام یا حاکم مفتی سے کوئی فتویٰ لے کر اس کے مطابق کوئی حکم نافذ کرتا ہے اور اگر بعد میں یہ معلوم ہو کہ مفتی سے فتویٰ میں سہو ہو گیا تو اس صورت میں اس فتویٰ پر عمل کے نتیجہ میں اگر کوئی مالی نقصان ہو تو مفتی اس کا ضامن ہوگا۔ اور اگر فتویٰ حکم حاکم یا امام کی بناء پر نہ دیا گیا ہو اور اس سے کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے تو پھر دیکھا یہ جائے گا کہ فتویٰ دینے والا مفتی، فتویٰ دینے کا مجاز تھا یا نہیں؟ اگر وہ مجاز اور اہل تھا تو اس صورت میں ضمان مستفتی (سائل) پر ہے کیونکہ اسے اختیار تھا کہ وہ مفتی کے فتویٰ پر عمل کرے یا نہ کرے وہ مفتی کے فتویٰ پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہ تھا۔ اور اگر مفتی غیر مجاز اور نااہل تھا تو ضمان اسی پر ہوگی نہ کہ مستفتی پر یہ مسئلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی روشنی میں ہے کہ " جو کوئی علم طلب نہ

جانتا ہو اور طبیب بن بیٹھے تو وہ کسی بھی نقصان کا ذمہ دار (ضامن) ہوگا (۶۱) یہ حدیث سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں موجود ہے۔

ابراہیم اللقانی کی کتاب اصول فتویٰ میں "ضمان المفتی" کے عنوان سے لکھا ہے:
"ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر مفتی کے فتویٰ سے کسی کا مال تلف ہوگیا اور مفتی مجتہد تھا تو اس پر کوئی غبار نہیں اور اگر مجتہد نہ تھا تو وہ نقصان کا ضامن ہے۔"

المازری نے کہا ہے کہ "مفتی کے فتویٰ سے (جبکہ وہ مجتہد نہ ہو) اگر کوئی نقصان ہوجائے تو حاکم کو چاہیئے کہ وہ اس کو تنبیہ کرے اور وہ نقصان کا ضامن بھی ہوگا۔ پھر اگر تنبیہ کے بعد وہ اہلیت فتویٰ حاصل کرے تو اسے سزا نہ دی جائے اور اگر وہ پھر بھی اہلیت حاصل نہ کرے تو اسے فتویٰ دینے سے منع کردیا جائے۔ (۶۲)

علامہ محمد مکی الناصری کی اس تحریر سے یہ بات واضح ہو چکی کہ فتویٰ نویس ہر کیدو مہد کا کام نہیں بلکہ یہ انتہائی ذمہ دارانہ منصب ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے ملک میں نہ تو مفتی کی اہلیت سے متعلق کوئی جانتا ہے نہ اس منصب کی نزاکت سے کوئی واقف و آگاہ ہے بلکہ جس کا جی چاہے مفتی ہونے کا اعلان کردے اور راتوں رات مفتی بن بیٹھے۔ علماء کرام کو بالخصوص اہل علم و دانش کو چاہیئے کہ وہ کوئی ایسا نظام قائم کریں جس کے تحت مفتی کا منصب صرف قابل اور اہل لوگوں ہی کے لئے مختص ہوسکے اور ملک میں خود ساختہ مفتیوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی مسلکی انارکی کا خاتمہ ممکن ہو۔

(ختم شد)

---

(۶۴) ابن الصلاح بحوالہ ابن فرحون، البقرہ ج ۱ ص ۵۰، ۵۱
(۶۵) القرافی، الاحکام فی تمیز الفتاویٰ عن الاحکام، ص ۲۶۱، ۲۶۲
(۶۶) ابن فرحون، التبصرۃ، ج ۱ ص ۵۳، ۵۴ السیوطی، الاشباہ والنظائر ص ۲۴۷
(۶۷، ۶۸) السیوطی، الاشباہ والنظائر، ص ۳۴۶

بقیہ صفحہ ۲۴ پر

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کی وفات حسرت آیات

دینی و مذہبی اور علمی دنیا کا ایک اور چراغ بجھ گیا۔ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری ۹۴ سال کی عمر میں مختصر سی علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۲۴ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۹۸ء کو حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کا انتقال ہوا۔ جیسے ہی یہ خبر دفتر برہان میں پہنچی سب ہی رنج و غم میں ڈوب گئے۔ کیونکہ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کا تعلق، واسطہ اور رابطہ ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان سے روز اول ہی سے رہا۔ ادارہ کے بانی مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے حضرت مولانا کا بھائیوں سے بھی بڑھ کر قلبی تعلق رہا۔ ایک تو ہم سبق ہونے کی وجہ سے اور دوسرے استاد محترم حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے چونکہ مولانا احمد رضا داماد تھے اس لیے استاد کے داماد ظاہر ہے بھائی اور بہنوئی ٹھہرے۔

اسی وجہ سے حضرت مفتی صاحبؒ مولانا احمد رضا کو بہت ہی چاہتے تھے ان سے قلبی محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ اور اسی رشتہ سے حضرت مولانا احمد رضا بھی حضرت مفتی صاحبؒ کو بڑے بھائی کی حیثیت سے سمجھتے تھے۔ ہر معاملے میں ان کی رہنمائی کو اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا احمد رضا بجنوری عربی زبان کے زبردست عالم تھے۔ عربی پر خداداد عبور حاصل تھا اور اسی طرح اردو زبان پر بھی انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی عربی زبان اور اردو زبان میں زبردست تصانیف ہیں۔ ان کی مشہور و معروف کتاب انوار الباری (کئی ضخیم جلدوں میں) اعلیٰ درجہ کی علمی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے بلند پایہ تصانیف قلم بند کی ہیں۔ جسے زبردست علمی ذخیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

ادارہ ندوۃ المصنفین اور رسالہ برہان حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کے انتقال پُرملال پر اظہار تعزیت کرتا ہے اور بارگاہ عالی میں دعاگو ہے کہ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کی مغفرت فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین! ثم آمین۔ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری کے پانچ صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں جو ماشاءاللہ حیات ہیں اور دین و مذہب اور ملت اسلامیہ کی مختلف راہوں سے خدمت میں مصروف عمل ہیں۔

یان ملکیت و تفصیلات

متعلقہ برہان دہلی
فارم چہارم قاعدہ ۸

مقام اشاعت	:	۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
وقفۂ اشاعت	:	ماہانہ
طابع کا نام	:	عمیدالرحمٰن عثمانی
قومیت	:	ہندوستانی
ناشر کا نام	:	عمیدالرحمٰن عثمانی
سکونت	:	۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
ایڈیٹر کا نام	:	عمیدالرحمٰن عثمانی
قومیت	:	ہندوستانی
سکونت	:	۱۴۱۵، اردو بازار دہلی ۶
ملکیت	:	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمیدالرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط طابع و ناشر)

عمیدالرحمٰن عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلد ۱۲۲ — اپریل۔ مئی ۱۹۹۸ء — شمارہ : ۵۔۴

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ برہان

4136 - اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ 110006 * فون نمبر 3262815

زر تعاون

فی پرچہ ۶ روپے
سالانہ ۷۲ روپے

کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISION

[illegible] عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

بیانِ ملکیت و تفصیلات

متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم قاعدہ ۸

مقام اشاعت : ۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

وقفۂ اشاعت : ماہانہ

طابع کا نام : عمید الرحمن عثمانی

قومیت : ہندوستانی

ناشر کا نام : عمید الرحمن عثمانی

سکونت : ۴۱۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ایڈیٹر کا نام : عمید الرحمن عثمانی

قومیت : ہندوستانی

سکونت : ۴۱۱۵، اردو بازار دہلی ۶

ملکیت : ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

(دستخط طابع و ناشر)

عمید الرحمن عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دھلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجلس ادارت اعزازی

سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۲ | اپریل۔ مئی ۱۹۹۸ء | شمارہ: ۵۔۴

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ برہان

4136 - اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔110006 * فون نمبر 3262815

زرِ تعاون

فی پرچہ ۶ روپے

سالانہ ۷۲ روپے

کمپیوٹر کتابت

CREATIVE VISION

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپواکر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

۱۱ر مئی ۱۹۹۸ء کی تاریخ اور پیر کا دن ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لیے قابل فخر وانبساط اور یادگار بن گیا ہے اس لیے کہ نیوکلیائی پروگرام کو ترک کرنے کے لیے ڈالے جارہے مغربی دباؤ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے راجستھان کے ریگستانی علاقہ پوکھران رینج میں زیرزمین نیوکلیائی تجربات کرکے پوری دنیا میں اپنی نیوکلیائی طاقت وقوت کی دھاک جمادی۔ اور پھر اس کے دو دن بعد ہی دو اور نیوکلیائی تجربات کیے گئے تو ساری دنیا ہائیں! ہائیں! کرتی رہ گئی اور بھارتی سائنسدانوں وانجینیروں کی صلاحیتوں کا لوہا ماننے پر مجبور ہوگئی۔ اس سے پہلے مئی ۱۹۷۴ء میں جب ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی تھیں تو اس وقت بھی راجستھان کے اس مقام پوکھران پر ایک ایٹمی تجربہ کیا گیا تھا مگر اس کی گونج اتنی نہیں تھی جتنی اس بار کے پانچ دھماکوں پر مچی ہے۔

ان نیوکلیائی تجربات کے بعد بھارت بھی نیوکلیائی کلب میں داخل ہوگیا ہے اور اس کا شمار دنیا کی پانچ ایٹمی طاقتوں میں ہوگیا ہے۔ اور یہ بات ہندوستان کے ہر باشندہ کے لیے فخر ومسرت کی بات ہے۔ پرمانو بم کی طاقت اور اس کے اثرات کے بارے میں مقامی معاصر نے بڑی تفصیل سے کچھ دلچسپ معلومات شائع کی ہیں جس میں سے کچھ حصہ یہاں شائع کرکے ہم اپنے ناظرین کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرنے کے جو تباہ کن نتائج ہوئے وہ دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اس لیے لوگوں کی دلچسپی ان معاملات میں کافی ہے عام لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ بم اتنی

خوفناک تباہی کیسے کر سکتا ہے۔عام لوگوں کو پرمانو بم کی پراسرار طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ کسی وقت سمجھا جاتا تھا کہ ایٹم بم دنیا کا سب سے چھوٹا ذرہ ہے لیکن بعد میں سائنسدانوں نے یہ کہا کہ اس ذرے کو بھی توڑا جا سکتا ہے۔اور اس کے ٹوٹنے پر جو انرجی نکلتی ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ سائنسدانوں نے پتہ کیا کہ کئی ایسے ذرے ہیں جن میں ناقابل تصور توانائی ہوتی ہے اور جب انھیں توڑا جاتا ہے تو اس میں سے جو حرارت نکلتی ہے وہ صرف سائنسداں ہی سمجھ سکتے ہیں۔اب پتہ چلا ہے کہ ان ذروں سے بھی چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں جو اس وقت نظر آتے ہیں جب آپ کمرے کا دروازہ بند کریں اور اس کمرے میں سورج کی شعاع کسی چھید سے گذر کر آئے تو یہ ذرات اس میں نظر آتے ہیں لیکن سائنسداں ان کے وجود کی گہرائی میں جاتے ہوئے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر یہ ہیں کیا اور کہ ان میں ایسی بے پناہ طاقت کہاں سے آجاتی ہے۔ایٹم بم نے یہ بتادیا ہے کہ یورینیم نام کی دھات کے ایٹم میں دوسرے دھاتوں کے ایٹموں کے مقابلے سب سے زیادہ قوت ہے اور جو ایٹم بم بنائے جارہے ہیں وہ سینکڑوں ایٹموں کو جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور پھر خاص آلات سے ان کو توڑا جاتا ہے جب ایک ایٹم ٹوٹتا ہے تو اس سے جو توانائی خارج ہوتی ہے وہ دوسروں کو توڑتی ہے اور اس طرح دیکھتے دیکھتے سارے ایٹم ٹوٹ جاتے ہیں اور ان سے یہ بے پناہ حرارت جاری ہوتی ہے جو پھیلتے ہوئے اپنی راہ میں آنے والی ہر شے کو تباہ کر دیتی ہے۔ کوئی وقت تھا جب یورینیم کے ایٹم کو سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا پھر ہائیڈروجن بم کے بعد پلاٹینیم بم کا ذکر ہوا جو ہائیڈروجن بم سے زیادہ زوردار سمجھا جاتا ہے اس کے بعد بھی کوئی بم آئے گا یہ ابھی دیکھنے کی بات ہے حق تو یہ ہے کہ قدرت نے جو کچھ بنایا ہے اس کا ہم لوگوں کو ابھی بہت کم علم ہے۔ آخر خلا میں جو کچھ ہے کسے کل تک اس کا پتہ تھا ہم لوگ یہی سمجھتے تھے کہ زمین آسمان چاند اور سورج ایک ہی ہیں لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا ایک ہی نہیں بلکہ کئی دنیائیں ہیں۔ کیا ہم سوچ بھی سکتے تھے کہ فضاء میں بھی کوئی دنیا لٹک سکتی ہے۔ آخر چاند بھی تو سینکڑوں ہیں۔ یہ اشارہ بھی ہو رہا ہے کہ سورج نو(۹) ہیں۔ معمولی دماغ تو یہ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ کائنات لامحدود ہے پچھلے دنوں یہ خبر آئی کہ چودہ ارب نوری سال (لائٹ ایئرز) سے سگنل آرہے ہیں۔ جب میں نے یہ سنا تو کاغذ پینسل لے کر یہ جاننے کی کوشش شروع کی کہ یہ فاصلہ کتنا ہے۔ نوری سال سے مراد سورج کی روشنی کی رفتار ہے۔ماہرین کا کہنا ہے کہ سورج کی کرنیں ایک سیکنڈ میں دو

لاکھ کے قریب میل طے کر سکتی ہیں۔ اس پر اندازہ کیجئے کہ مذکورہ سگنل کتنی دور سے آیا ہے۔ اگر ایک سیکنڈ میں سورج کی روشنی نے دو لاکھ میل طے کرنے ہیں تو اس کے بعد اسے ۶۰ سے ضرب دینے پر ایک گھنٹہ بنے گا اسے چوبیس سے ضرب دیں تو ایک دن بنے گا۔ اسے ۳۶۵ سے ضرب دیں تو ایک سال بنے گا اس سب کو چودہ ارب سے ضرب دیجیے تو پھر کہیں جا کر آپ کو پتہ چلے گا کہ یہ سگنل کہاں سے آتے ہیں۔ اور پھر کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان چودہ ارب سے آگے اور کچھ نہیں ہے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سائنسداں جب ان مسائل پر غور کرتے ہیں تو وہ اس دنیا کے نہیں رہتے کیونکہ معمولی انسان کا دماغ یہ سب کچھ سوچ نہیں سکتا اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ سائنسداں نیم پاگل ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہیں کہ ان کی دنیا ہماری دنیا نہیں ہے وہ اپنی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنی ہی طرح سوچتے ہیں۔ ایٹم بم سے متعلق ان دلچسپ معلومات کے بعد اتنا اور سن لیجئے کہ بھارت کے ایٹمی تجربہ سے امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان اور یہاں تک کہ کوریا بھی سب بھارت کی مذمت کرنے میں پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ عالمی بینک ۹۸ء کے سال کے لیے ہندوستان کو جو تین ارب ڈالر کا قرض دینے والا تھا شاید وہ روک دے ۶۰ لاکھ کروڑ ڈالر کی مدد دینی تھی وہ بھی رک جائے گی اور دیگر ممالک نے بھی بھارت کو امداد دینی بند کرنے کی بات کہی ہے اس کے باوجود بھارت نے ایٹمی تجربہ کر کے غیر معمولی ہمت و جرات کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ قابل تعریف و لائق صد تحسین و مبارکباد ہے۔ اور اس کے لیے وزیر اعظم ہندوستان جناب اٹل بہاری واجپئی کے لیے تمام ہندوستانیوں کی طرف سے آفریں صد آفریں!

ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی طرف سے ہندوستانیوں کے نام تیسرا اعلان بریلی میں شائع ہوا تھا ۔ اس میں انہوں نے کہا تھا ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں ! اٹھو بھائیو! خدا نے جتنی برکتیں انسان کو عطا کی ہیں ان میں سب سے قیمتی برکت آزادی ہے۔" ہمیں بہر صورت اپنی آزادی عزیز ہے امریکہ، برطانیہ، روس یا کسی دیگر ملک کی ناراضگی کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے!

سب ہی کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ کوئی وقت تھا جب غریب دال روٹی اپنی تقدیر سمجھتا تھا آج اوسط درجہ کے لوگوں کے لیے دال روٹی کی فراہمی بھی ایک مشکل مرحلہ بن گیا ہے۔ غریب و مزدور کے بس میں دال روٹی نہیں۔ درمیانہ طبقہ کے لوگوں کے لیے جب دال روٹی ملنا محال ہوتا جارہا ہے پھر یہ مہنگائی کی مار اس سائنسی دور کے انسان کو کہاں لے جاکر پٹخے گی یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ارباب حل وعقد کے لیے ضروری ہے کہ مہنگائی کے مسئلے کو ہر زاویہ نگاہ سے اوّلیت دیں اور اسے حل کریں۔ مہنگائی کو ختم کرنا تو مشکل ہے مگر مہنگائی کی تیز رفتاری پر تولگام دیا ہی جاسکتا ہے اور ہم ان صفحات میں مہنگائی کی رفتار پر لگام دینے کے لیے حکومت ہند سے مؤدبانہ گذارش کریں گے۔

تیسری قسط

مغربی فن تعمیر پر

اسلامی فن تعمیر

کے اثرات

از مارٹن۔ ایس۔ برگس

ترجمہ: جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے

سامرہ کی جامع کبیر بہت وسیع و عریض عمارت ہے اور کافی تاریخی اہمیت کی حامل ہے اس میں ایک صحن ہے مکہ کی سمت میں ایک وسیع حرم ہے اور صحن کی مابقی سمتوں میں کافی وسیع برآمدے ہیں۔ احاطہ کی زبردست دیوار میں چاروں گوشوں پر ایک مدوّر برج اور ان برجوں کے درمیان نیم مدوّر برج ہیں۔ حرم کی شمالی دیوار میں چھوٹے دریچوں کی ایک قطار ہے ان دریچوں کے سرے نعل دار یا کثیر برگی ہیں۔ یہ نمایاں خصوصیت قرطبہ میں بھی دکھائی دیتی ہے اس کے بارے میں ہاول کا خیال ہے کہ اس کی اصل شکل نے بدھ متی عہد کے ہندوستان میں جنم لیا تھا۔[۱]

[۱] ای بی ہاول، ہندوستانی فن تعمیر، (دوسرا ایڈیشن۔ لندن ۱۹۲۷ء) ص ص ۸۵،۸۶۔

F.B HAVELL,(Indian Architecture) ہاول نے یہ خیال اجنتہ کے غاروں میں کٹی ہوئی ایک کمان کو دیکھ کر ظاہر کیا تھا لیکن اجنتہ کی اس کمان کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اصل میں یہ بانس کی بنی ہوئی جھونپڑی کی شکل ہے اور اس کی نقل یہاں پتھر میں بنائی گئی۔ اس طرح ایسی اور نہ کسی اور

اگر ہاول کا خیال غلط ہے تو پھر مغربی فن تعمیر میں ایسی کمان اور اس کے تمام متعلقات مسلمانوں کا عطیہ ٹھہرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اہم چیز قدیم عمارتوں کے ستونوں کے استعمال کا ترک کرنا ہے جیسے کہ یہ ستون چھتوں کو اٹھانے کے لیے قرطبہ اور دوسری جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان قدیم ستونوں کی جگہ اینٹ کے پایوں نے لے لی ہے۔ یہ پائے ایک مربع بنیاد دے کر ہشت پہل بنائے گئے ہیں اور ہر پائے میں چار مدور یا ہشت پہل سنگ مرمر کے دہرے لگائے گئے ہیں۔ یہ ایک اور چیز ہے جو مغربی فن تعمیر میں داخل ہوئی ہے سامرہ اور اس کے بعد جامع ابن طولون میں جو عجیب وغریب چکر کھاتا مینار بنایا گیا ہے ویسا مینار پھر آئے کہیں نہیں بنایا گیا۔

قاہرہ کی جامع ابن طولون ۸۷۶ء میں بنی شروع ہوئی بہت سے مصنفوں نے اس مسجد کا حال تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔[1] لیکن اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں اس کی اہمیت کچھ گھٹ سی گئی ہے جب سے کہ ہمیں اس کی بعض نمایاں ترین خصوصیتیں عراق (مسوپٹمیا) میں اس سے بھی قدیم تر عمارتوں میں مل گئی ہیں۔ یہ ایک وسیع جامع مسجد ہے۔ اس کا نقشہ تقریباً مربع ہے اور اس کا صحن تمام سمتوں سے چھتے دار برآمدوں سے گھرا ہوا ہے، حرم کا ایوان دوسرے ایوانوں کی بہ نسبت زیادہ عمیق ہے۔ مسجد کی اصل دیواروں کے باہر چار دیواری سے گھرا ہوا ایک احاطہ (زیادہ) ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو اس سے پہلے کی مسجدوں میں کہیں نہیں ملتی۔ بیرونی دیواریں بہت دبیز ہیں۔ اور ان کے اوپر تزئینی کھڑ کج لگائے گئے ہیں۔ یہی کھڑ کج، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے گوتھک فن تعمیر کے جالی دار اور چوٹیوں والی منڈیروں کے لیے نمونہ بنے (ہر قسم کے کھڑ کج آشوریہ میں آٹھویں صدی قبل مسیح میں اور مصر میں اس سے بھی پہلے مستعمل تھے) کھڑ کج کے نیچے نکیلے دریچوں کے موکھوں کی قطار ہے جن کے اندر پلاستر میں کٹی ہوئی جالیاں بٹھائی گئی ہیں اور پھر ان کے بیچ بیچ یکے بعد دیگرے نکیلی محرابیں ہیں جن کے سرے کثیر برگی یا نعل دار ہیں،

قسم کی کمان کے ہندوستان میں پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مدت ہوئی ہاول کا خیال غلط ثابت ہو چکا۔

[1] دیکھیے میری کتاب (اسلامی فن تعمیر، آکسفورڈ ۱۹۲۴ء) کا تیسرا باب (مترجم)
(Mohammadan Architecture)

چھتے اینٹ کے زبردست پایوں پر مشتمل ہیں اور گوشوں میں دیوار سے لگے ہوئے خشتی دھرے دیئے گئے ہیں ان کے اوپر نکیلی کمانیں ہیں اور سطح جست کے پاس ان کا گھڑ نعلی خماؤ' بس یوں ہی محسوس ہوتا ہے۔ اس طرح عمارت کا پورا ڈھانچہ چوبی چھت کی سطح تک خشتی ہے اور اس پر سادہ یا تزئینی سنگستر لگایا گیا ہے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسجد ہر لحاظ سے عراقی (مسوپٹیمیائی) طرز کی مسجد ہے اور سامرہ اور بغداد کی مسجدوں کے نمونوں پر بنائی گئی ہے جن سے اس مسجد کا بانی ابن طولون اپنے عہد جوانی میں خوب واقف تھا، مذکورہ خصوصیات کے سوا دوسری جدتوں میں لکڑی میں کندہ کیے ہوئے کوفی کتبے بھی ہیں (تزئینی اغراض کے لیے حروف تہجی کا یہ استعمال نہایت درجہ ماہرانہ ہے) ان کے سوا رنگ میں عملاً تمام نمایاں سطحوں پر تزئین کاری ہے جو زیادہ تر سفید سنگستر سے بنائی گئی ہے اور چھت کی چوبی شہتیروں پر بھی یہ کام کیا گیا ہے۔ قبلہ نما محراب کا نقشہ بہت واضح بنایا گیا تھا، جو اب بدل دیا گیا ہے اس کے صحن کے وسط میں ایک فوارہ بھی ہے (یہ وہ اصلی عمارت نہیں جس کے اوپر ایک گنبد بھی تھا) نئی چیزوں میں چھت سے لٹکتے ہوئے شاندار جھاڑ فانوس بھی ہیں۔

نویں صدی کے آخر سے لے کر بارہویں صدی کے ختم تک کی باقی ماندہ اسلامی عبادت گاہوں یعنی مسجدوں کی گنتی زیادہ نہیں ہے اس عرصے میں کافی فوجی عمارتیں بنتی رہیں۔ اور یہ بات تو اب تسلیم کر لی گئی ہے کہ صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں نے شام اور مصر کے قلعوں سے بہت سی چیزیں حاصل کی تھیں۔ کیونکہ شام اور آرمینیا میں صدیوں پہلے سے سنگی تعمیر بہت اونچے درجے پر پہنچ چکی تھی۔ مثال کے طور پر اہل یورپ نے مشربیات[1] (Machiolation فصیل میں روزن) کا استعمال اسی واسطے سے سیکھا ہے۔

---

[1] Machiolation بڑے بڑے چھجوں یا توڑوں کی ایسی ترتیب جس میں چھجے یا توڑے نزدیک نزدیک اور منڈیر کی دیوار کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ چھجے کے ہر جوڑے کے درمیان ایک موکھا (اس کے لیے فرانسیسی زبان میں Machioules کا لفظ آتا ہے) ہوتا ہے اس موکھے میں فرشی دروازہ لگا ہوتا ہے۔ اس سے کھولتا ہوا تیل یا پانی اور دوسری ناخوشگوار چیزیں نیچے دیواروں میں سرنگ لگانے کی کوشش کرنے والے محاصرین کے سروں پر پھینکی جا سکتی ہیں۔ ایسے روزنوں والے چوبی چھجے جو

قاہرہ کے قلعہ پر مسٹر کے۔اے۔سی۔ کرسول نے جو مضمون لکھا ہے اس کے ایک ضمیمہ میں انھوں نے مشربیات کا جائزہ لیا ہے [1] انہوں نے بتایا ہے کہ شام میں اس کی جو ابتدائی چھ سات مثالیں گنائی جاتی ہیں وہ حقیقت میں باہر کو نکلے ہوئے اسی طرز کے چھوٹے سے پاخانے ہیں جن کا رواج حالیہ زمانے تک عام تھا جزیرہ جرسی (Jersy) کے شہر جوری (Gorey) میں ایک پائے پر بنا ہوا ایسا ہی ایک پاخانہ اب بھی زیر استعمال ہے۔ باقی تین مثالوں میں سب سے قدیم مثال چھٹی صدی عیسوی کے وسط کی ہے اور یہ مشربیات بلندی سے پتھر وغیرہ پھینکنے کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے یہ معنی ہوئے کہ یہ مثالیں اسلام کے آغاز سے پہلے کی ہیں۔ ان مثالوں پر مسٹر کرسول کے مضمون لکھنے کے بعد شام کے علاقے میں رصافہ کے مقام پر قصرالحیر میں ایک اسلامی مثال دریافت ہوئی ہے۔ جو ۷۲۹ء کی ہے ایسی ہی دو مثالیں قاہرہ کے ایک دروازے باب النصر (۱۰۸۷ء) کے اوپر بنی ہوئی ہیں اس دروازے کو آرمینی سنگ راجوں نے بنایا تھا۔ یہ صاف طور پر مشربیات ہیں اور انہیں دروازے کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ مثالیں یورپ کی ایسی اولین مثالوں سے کوئی ایک سو سال پہلے کی ہیں جو چیاتو گلارو [2] (۱۱۸۴)، شالون [3] (۱۱۸۶ء)، ناروچ [4] (۱۱۸۷ء) اور ونچسٹر [5] (۱۱۹۳ء) دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ صلیبی محاربوں نے مسلمانوں سے اس کا خیال لیا ہے نہ کہ مسلمانوں نے صلیبی محاربوں سے۔ فرانس اور انگلستان کے چودھویں صدی کے قلعوں میں یہی مشربیات توڑوں کی قطاروں میں بنائے گئے اور اسی طریقے کو ان ملکوں میں بہت ترقی دی گئی۔

Howrds (Hoardding) یا Breteches (Brattice) کہلاتے ہیں اسی مقصد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

[1] Mr. K.A.C. Creswell, In Builetin De,Wnstiteit Francain D Archeologie,Orientale. Vol.23 (cairo 1924)

[2] Chateau Gaillard

[3] Chatillon

[4] Norwich

[5] Winchestor

فوجی تعمیر کاری کی ایک اور چیز جو مصر اور شام سے اہل یورپ نے لی ہے وہ قلعہ کی فصیل میں زاویہ قائمہ والا، یا بل کھایا ہوا دروازہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے دشمن کو جسے قلعہ کے دروازے تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہو قلعہ کے اندر کا حال دیکھنے یا گولہ باری کرنے سے روکا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے دروازے سے رومی یا بازنطینی فن حرب بے بہرہ تھا۔ رومی اور بازنطینی فن حرب میں تو یکے بعد دیگرے مدافعتی دروازے ایک ہی محور پر بنائے جاتے تھے اور ان کا درمیانی فصل 'پروپگ ناکولم' (-Propugnacu lum) کہلاتا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ایسے بل کھائے ہوئے دروازے بغداد کے مدور شہر (آٹھویں صدی) میں استعمال کیے گئے تھے۔ قاہرہ میں سلطان صلاح الدین کے بنائے ہوئے قلعہ (تعمیر کی ابتداء ۱۱۷۶ء) میں یہ پھر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی سب سے بہترین مثال حلب کے قلعہ میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسے دروازے شاذونادر ہی انگلستان میں دکھائی دیتے ہیں، اگرچہ اس کی ایک عمدہ مثال بیومارس (Beaumaris) میں دکھائی دیتی ہے فرانس میں یہ زیادہ مقبول رہے اور سرکاسونے (Carcassonne) میں یہ بہت نظر آتے ہیں لیکن ان دونوں ملکوں میں مستحکم قلعوں کی فصیلوں کے لیے محرف دروازے زیادہ پسند کیے جاتے تھے۔ پیری فانڈس (Pierrefonds) اور کانوے (Conway) کے قلعے اسی کی مثالیں ہیں۔

ہندوستان میں پرانی دہلی کی عمارتوں سے پہلے کی کوئی اہم اسلامی عمارت موجود نہیں۔ پرانی دہلی کی عمارتیں تیرہویں صدی کے ابتدائی سالوں کی ہیں۔ ایشیائی ترکی میں بھی کوئی قابل ذکر چیز نہیں، یہاں بھی اسی زمانے کے لگ بھگ قونیہ کے مقام پر سلجوقی بادشاہوں کی بنائی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اسپین اور شمالی افریقہ میں فوجی تعمیر کاری سے قطع نظر اہم آثار میں قرطبہ کی جامع مسجد میں بعد کے زمانے کا کام ہے یہاں دسویں صدی کے نصف دوم میں کافی توسیعی کام ہوا ہے۔ ایسے ہی اشبیلیہ (۱۱۷۲ء۔ ۱۱۹۵ء) اور رباط (۱۱۷۸ء۔ ۱۱۸۴ء) کے نفیس مینار ہیں۔[1]

---

[1] اشبیلیہ کا مینار اب جیرالڈ ٹاور (Giralda Tower) کہلاتا ہے۔

یہ دونوں مینار نعل دار چھتوں سے مزین ہیں جو بعد کے کھڑکیوں کے اوپر کے آرائشی گوتھک کام سے مشابہ اور اس طرز کے پیش رو ہیں۔ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے یہ کام بہت دلچسپ ہے۔ اس میں گنبد سازی کا کمال بھی شامل ہے لیکن خود اسپین سے باہر اس کام نے تعمیر کاری کے ارتقا پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ صقلیہ میں پلاٹینا کا کلیسا (Coppella Pilatina) ۱۱۳۲ء میں بنا، مارتورانا کا گرجا (Martorana) ۱۱۳۶ء میں بنا، لازیزا کا قصر ۱۱۵۴ء میں، اور لاکوبا کا قصر (Lacuba) ۱۱۸۰ء میں بنا۔ یہ تمام مسلمہ سنین ہیں اور یہ سب کے سب اس جزیرے پر مسلم اقتدار کی حد کے باہر پڑتے ہیں۔ اس جزیرے کے صدر مقام بلرم (Pabrmo) سے مسلم اقتدار ۱۰۶۰ء میں اور بحیثیت مجموعی پورے جزیرے صقلیہ سے ۱۰۹۰ء میں اٹھ گیا۔ لیکن اگر یہ عمارتیں نارمنوں کی بھی بنائی ہوئی ہیں تب بھی ان میں خالص اسلامی خصوصیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ایسی ہی اسلامی خصوصیات خود اطالیہ میں یعنی امالفی (Amalfi) اور سیالرنو (Salerno) کے شہروں میں بھی دکھائی دیتی ہیں ایران میں اس عہد کی اہم عمارتوں میں اصفہان کی مسجد، مسجد جمعہ، اور موصل کی جامع مسجد (۱۱۴۵ء۔۱۱۵۱ء) ہے یہ دونوں مسجدیں بڑی جامع مسجدیں ہیں۔ اول الذکر مسجد میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایرانی مسجدیں اینٹ سے بنتی تھیں۔ اس لیے انہیں سنگتراشی کی منبت کاری اور روغنی ٹائیلوں سے سجایا جاتا تھا۔ روغنی ٹائیلیں لگانے کا شوق تو اتنا بڑھا کہ آگے چل کر شام اور مصر جیسے ملکوں میں اب تک جہاں پتھر استعمال ہوتا تھا، ان ٹائیلوں کو استعمال کیا جانے لگا۔ ایرانی مسجدوں میں مینار عام طور پر جوڑی میں بنائے جاتے تھے۔ یہ مینار استوانی شکل کے ہوتے تھے اور اوپر کو قدرے گاؤدم ہوتے جاتے تھے اور رنگین روغنی ٹائیلوں سے پٹے ہوتے تھے۔

(جاری ہے)

دنیا میں ہمیشہ غلط کار لوگوں کا یہ خاصہ رہا ہے کہ غلط کاروں کی پوری تاریخ ان کے سامنے ہوتی ہے مگر وہ اس سے سبق نہیں لیتے، حتیٰ کہ اپنے پیش رو غلط کاروں کا جو انجام خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ہو چکا ہوتا ہے اس سے بھی انہیں عبرت حاصل نہیں ہوتی، وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا قانون مکافات دوسروں ہی کے لیے تھا، ان کے لیے اس قانون میں ترمیم کر دی گئی ہے۔

سید مودودی

چوتھی اور آخری قسط

زمینداری اور جاگیرداری کا

تاریخی پس منظر

از جناب مولوی تقی الدین صاحب بہاری

خلیفہ کے اختیارات

حکومتِ الٰہی میں زمین و جائداد ذاتی وقار اور اقتدار بڑھانے کے لئے نہ ہوتی تھی بلکہ عام مفاد اور خدمتِ خلق کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی جب تک مفادِ خلق کی خدمت ہوتی رہتی خلافت کو کوئی دخل دینے کی ضرورت نہ تھی اگر اس کی خلاف ورزی ہوتی تو خلافت ہر قانون اور ہر تصرف کی مجاز تھی۔

قوم جبیلہ سے "قطائع" واپس لے لینا اور بلال بن حارثؓ مزنی کے قبضہ سے غیر آباد آراضی نکال لینا اور اس قسم کے جتنے واقعات اوپر مذکور ہو چکے ہیں اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اور اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

لنا رقاب الارض [1]　　　زمینیں دراصل ہماری (خلافت کی) ہیں

[1] الاموال ص ۲۷۹

اور حضرت علیؓ نے ایک شخص کے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا۔

ان ارضك فلنا [۱] بے شک تیری زمین ہماری (خلافت کی) ہے

انہی تصریحات کے پیش نظر ابو بکر حصاصؒ کہتے ہیں۔

ہر وہ زمین جس کی آبادکاری سے لوگ عاجز رہیں اور حقوق عامہ پائمال ہوں تو اس کے انتظام کے بارے میں خلافت کو پورا اختیار ہے۔ [۲]

اور قاضی ابویوسف کہتے ہیں۔

ولا يخرج من يده من ذلك شيئا الا بحق يجب له عليه فيا خذه بذلك الذى وجب له [۳] اہل قطائع کو خلیفہ (بلاوجہ) بے دخل نہ کرے، ہاں اگر حقوق واجبہ کی ادائیگی نہ ہو رہی ہو تو بے دخل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جملہ "الا بحق يجب له عليه" قابل غور ہے اپنے عموم مفہوم کی بناء پر حقوقِ عامہ ہر جائز حق اور خلیفہ کے ہر جائز تصرف کو شامل ہے۔

امام ابو حنیفہ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ان نواحي دار الاسلام تحت يدامام المسلمين [۴] دارالاسلام کے جملہ اطراف خلیفۃ المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں

علامہ عینی ایک موقع پر کہتے ہیں

ان حكم الاراضى الى الا مام [۵] دراصل زمین کا معاملہ خلیفہ کے سپرد ہے

اسی لئے خلیفہ کو مفادِ عامہ کے پیش نظر موقوفہ آراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز ہے۔ چنانچہ آراضی موقوفہ کی بحث میں فقہ کی یہ تصریح ہے:

---

[۱] الاحکام القرآن (ج ۳) ص ۵۳۳

[۲] حوالہ بالا [۳] الخراج ص ۶۰

[۴] مبسوط (ج ۱) ص ۱۹۳ از اسلام کے معاشی نظریے [۵] عینی (ج ۶) ص ۲۹

لان اصلها لبیت المال [1] اس لئے کہ زمینیں حقیقتاً بیت المال (حکومت) کی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ حکومت الٰہی میں زمین جائیداد پر کسی کے قبضہ ہونے کا صرف یہ مطلب تھا کہ قابض کو بحیثیت امین اس کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ امانت اس کے قبضہ میں اسی وقت تک باقی رکھی جاتی جب تک وہ خلق اللہ کے مفاد میں خلافت کا ہاتھ بٹا سکتا اور ایسی فضاء پیدا کرنے میں مددگار بنتا جو مخلوق کی خوشحالی اور ترقی کی ضامن ہو۔ جب اس کی خلاف ورزی ہوتی اور امانت میں خیانت کا اندیشہ ہوتا تو خلیفہ بلا پس و پیش اسے آراضی سے بے دخل کر دیتا یا جو بہتر صورت مناسب ہوتی عمل میں لاتا تھا۔

خلیفہ کے اس اقدام میں نہ حقوقِ ملکیت کا "گورکھ دھندا" حائل ہوتا اور نہ جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی تھیں چونکہ خلافت کے لئے ہر شخص کے ذاتی مفاد کا خیال رکھنا بھی ناگزیر تھا اس لئے ہر تصرف اور ہر فیصلہ میں اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔

صاحب زمین کے اختیارات

زمانۂ خلافت میں صاحب زمین کو مندرجہ ذیل اختیارات حاصل تھے:

وقف : وقف کا دستور قرن اول میں بکثرت پایا جاتا ہے اسلام میں سب سے پہلے واقف حضرت عمرؓ نے اپنا خیبر کا حصہ جو فوجیوں میں تقسیم کے وقت آپ کو ملا تھا فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا۔ [2]

حضرت طلحہؓ نے اپنا محبوب ترین باغ اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔ [3]

حضرت علیؓ نے مصر میں زمین اور مکان وقف کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے مکہ اور مدینہ کے مکانات وقف کیے حضرت سعدؓ نے ایک مکان مدینہ میں اور ایک مکان مصر میں وقف کیا۔ حضرت ارقمؓ نے اپنا وہ مکان وقف کر دیا جس میں رسول اللہؐ نے قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت زبیرؓ بن العوام نے اپنے مکہ کے مکان وقف کیے۔ فاروق اعظمؓ نے مکہ میں مروہ کے پاس کا مکان وقف کیا ان کے علاوہ بکثرت اوقاف متعدد احادیث سے

[1] در المختار (ج ۱) [2] بخاری و مسلم [3] بخاری کتاب التفسیر

ثابت ہیں[1]

ایک شخص نے اپنی ماں کے انتقال کے بعد ایک باغ صدقہ کر دیا تھا۔[2]

عینی شارح بخاری کہتے ہیں۔

وقف اور صدقہ دونوں قریب المعنی اور دونوں کا ایک حکم ہے[3]

وقف کی صحت کے بعد واقف کو مالکانہ تصرف کا حق نہ رہتا بلکہ اس کا پورا انتظام خلافت کے ذمہ ہو جاتا تھا۔

رسول اللہ نے موقوفہ زمین کے متعلق فرمایا

لاتباع ولا توھب ولا نورث[4] نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے نہ وراثت جاری ہو

چونکہ آراضی کا اصل تعلق خلیفہ اور بیت المال سے ہوتا تھا اس لئے خلافت کو عام مفاد کے پیش نظر واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت کا بھی حق حاصل تھا۔

اس بارے میں فقہ کی یہ تصریح ہے۔

ان السلطان یجوز له مخالفة الشرط اذاکان غالب جهات الوقف قری ومزارع فیعمل بامره وان غایر شرط الواقف لان اصلها لبیت المال[5]

جب وقف کی اکثر جہات گاؤں اور مزروعہ زمین ہو تو خلیفہ کا حکم نافذ العمل ہوگا اگرچہ واقف کی شرائط کے خلاف ہو کیونکہ گاؤں اور زمینیں دراصل بیت المال کی ہیں۔

ہبہ : جائداد وغیر منقولہ زمین، مکانات، باغات کا ہبہ قانوناً صحیح مانا جاتا تھا کلام عرب میں اس کے ہبہ کے لئے کئی لفظ مستعمل تھے، مثلاً

عمریٰ : قرآن کریم میں اس کا مادہ یہ ہے

واستعمرکم فیها پ۱۲ اللہ نے تم کو زمین میں بسایا

محدثین و فقہا کے اقوال اور اہل زبان کے محاورہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے

[1] نصب الرایہ [2] عینی (ج ۶) ص ۵۱۴ [3] حوالہ بالا [4] بخاری و مسلم [5] درالمختار (ج ۱)

کہ عمریٰ کے معنی "زمین، باغ، مکان کسی کو پوری زندگی کے لئے دے دینا" کے ہوتے تھے۔[1]

زمانۂ خلافت میں اس قسم کے عطیات عموماً تین طرح دیئے جاتے تھے۔

(۱) زمین یا مکان رہنے اور کاشتکاری کے لئے کسی کو دے دیا اور یہ بات بھی صاف کردی کہ تو اس کا مالک ہے اور تیرے بعد تیرے ورثہ مالک ہوں گے۔

(۲) صرف اتنا کہا کہ یہ تجھ کو دیتا ہوں مرنے کے بعد کا کچھ ذکر نہ کیا۔

(۳) دیتے وقت یہ شرط کرلی کہ ترے مرنے کے بعد میری طرف یا میرے ورثہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

ان تین صورتوں میں موہوب لہ (جس کو دی گئی ہے) موہوبہ شے کا مالک ہو جاتا اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کی طرف منتقل ہو جاتی، دینے والے کا کوئی حق نہ رہ جاتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں رسول اللہ کا فرمان یہ ہے۔

"عمریٰ اس شخص کی ملک ہے جس کو دیا گیا پھر اس کے بعد اس کے ورثہ پر منتقل ہو جائے گا۔[2]

عام طور پر لوگ دیتے وقت واپسی کی شرط کرلیا کرتے رسول اللہ نے شرط کو باطل قرار دیا اور اصل ہبہ کو جائز رکھا تھا۔[3]

بعض حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملات میں شرطوں کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے اور عمریٰ میں شرط باطل قرار دی جاتی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حدیثوں میں وہی شرطیں مراد تھیں جن کے جواز میں نص صریح ہو یا کم از کم شارعؑ کے اقوال وافعال سے اس کی تردید نہ ہوتی ہو رہ گئیں وہ شرطیں جو اصولاً لغو اور باطل ہوتیں یا باہمی نزاع اور فساد پر مبنی ہوتیں تو ان کے جواز کی یا باقی رکھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی جیسا کہ بعض روایتوں میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔[4]

جن بعض حدیثوں میں اس قسم کے عطایا سے ممانعت آتی ہے اس کی دو وجہ ہیں۔

---

[1] احکام القرآن (ج ۳) ص ۲۰۳ [2] بخاری و مسلم وغیرہ [3] مسلم (ج ۲) باب العمریٰ نیز عینی (ج ٦) ص ۳۱۰ واحکام القرآن (ج ۳) ص ۲۰۳ [4] شرح معانی الآثار اور نووی شرح مسلم (ج ۲) ص ۳۸

(۱) عام طور سے انہیں شرائط کے ساتھ عطیہ دیئے جاتے جو جاہلیت میں رائج تھے۔[۱] اور وہ عموماً باہمی نزاع اور فساد پر مبنی ہوتیں۔

(۲) رسول اللہ بحیثیت خلیفہ اس قسم کے تصرفات سے محض اس بناء پر روک دیتے کہ آپ کو لوگوں کی ضرورتوں کا علم تھا ابتداءً کسی شے کا دے دینا آسان ہوتا ہے بعد میں اس کا خمیازہ بھگتنا مشکل ہوتا ہے۔

چنانچہ عینیؒ کہتے ہیں۔

رسول اللہ کو اصل مالکوں کی ضرورت اور صبر نہ کر سکنے کا علم تھا اس بناء پر آپ نے منع فرمادیا تھا۔[۲]

اور علامہ نوویؒ کہتے ہیں۔

اس ممانعت سے رسول اللہ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو صحیح حقیقت حال سے آگاہ کر دیں کہ اس قسم کے عطایا اسلامی اصول کے مطابق تمہاری ملکیت سے نکل جائیں گے اس لئے جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو اب ایسا نہ ہو گا کہ دینے کے بعد پھر واپس لے لو جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔[۳]

حاصل یہ ہے کہ زمانۂ خلافت میں عمریٰ اسی وقت قابل تسلیم تھا جب کہ دینے والے کے حالات اس کی اجازت دیتے ہوں ورنہ خلافت کو روک دینے کا حق حاصل تھا۔

رقبیٰ

رقبیٰ کی ایک یہ صورت منقول ہے کہ

کوئی شخص کسی سے کہتا کہ میں نے اپنا گھر یا زمین تجھ کو دے دیا اگر میں پہلے مروں گا تو تیرے پاس رہے گا اور تو مرے گا تو میرا ہو جائے گا۔[۴]

اس صورت میں تملیک مرنے کے بعد معلق رہتی تھی۔

رقبیٰ کی ایک صورت یہ بیان کی جاتی ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے کہ

میں نے تجھ کو مالک بنا دیا اس شرط پر کہ اگر تو پہلے مرے تو میری طرف واپس آئے گا۔

---

[۱] عینی (ج ۶) ص ۳۰۹ [۲] حوالہ بالا [۳] نووی (ج ۲) ص ۳۸ [۴] عینی (ج ۶) ص ۳۰۹

اور میں پہلے مروں تو تیرے ہی پاس رہے گا۔[1]

اس صورت میں انتظار رجوع اور عدمِ رجوع کے متعلق ہوتا تھا اور تملیک فی الحال ہو جاتی تھی، رقبیٰ کے حکم کے بارے میں امام نسائی نے ابن عباس سے موقوفاً یہ روایت نقل کی ہے۔

العمریٰ والرقبیٰ سواء[2]	عمریٰ اور رقبیٰ دونوں برابر ہیں

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں رقبیٰ کی جو صورت رائج تھی وہ عمریٰ سے زیادہ مختلف نہ تھی اسی لئے دونوں کا یکساں حکم بیان کیا گیا۔ اگر ایک میں فی الحال تملیک پائی جاتی اور دوسرے میں معلق رہتی تو یکسانیت کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔

کیونکہ لغوی اعتبار سے عمریٰ کے معنی آباد کرنا اور رقبیٰ کے معنی انتظار کرنے کے ہیں اسی لئے محققین کے نزدیک رقبیٰ کی دوسری تعریف صحیح سمجھی جاتی ہے اور زمانۂ خلافت میں رقبیٰ کی جو صورت رائج تھی اس کا حکم عمریٰ جیسا بیان کیا جاتا ہے۔

اس باب میں ممانعت کی حدیثوں کا وہی جواب ہے جو عمریٰ میں مذکور ہو چکا ہے اور ائمہ قانون کے اختلاف کی شکل حکمی اور حقیقی نہیں ہے بلکہ عرف اور رواج کی بناء پر ہے۔

یعنی جس صورت میں فی الحال تملیک نہ پائی جائے بالاتفاق ناجائز ہے اور جس میں فی الحال تملیک پائی جاتی ہو اس کو سب ائمہ جائز کہتے ہیں۔[3]

منحة : رسول اللہ نے فرمایا

من کانت له ارض فلیزرعها اولیمنحها اخاه (مسلم ابو داؤد)	جس کے پاس زمین ہو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے۔

ابن بطال کہتے ہیں۔

" منحة " جس میں منافع کا مالک بنایا جائے ذات کا نہیں۔[1]

---

[1] المختصر از فیض الباری للعلامہ انورؒ [2] عمدۃ القاری (ج ٦) ص ۳۰۸ [3] حاشیہ شرح وقایہ وکنز الدقائق وتقریر ترمذی للشیخ الہند وفیض الباری (ج ۳) وعمدۃ القاری (ج ٦) ص ۳۰۸

نوویؒ کہتے ہیں۔

"منحة" عاریۃ ہے۔[2]

انور شاہؒ کہتے ہیں۔

کسی کو انتفاع کے لئے زمین مفت دے دینا۔[3]

منجد میں ہے۔

"المنحة العطية"

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام عرب میں ایسے موقع پر منحۃ کے معنی کسی کو کاشت کے لئے مفت زمین دے دینے کے ہوتے تھے۔

زمانۂ خلافت میں امداد باہمی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ کاشت کے لئے مفت زمین دے دی جاتی۔ کاشتکار اپنے اخراجات سے کاشت کرتا اور پوری پیداوار اسی کی ہوتی۔

اس قسم کی زمین کا حکم یہ تھا کہ کاشتکار جب اس سے مستغنی ہو جاتا یا جتنی مدت کے لئے زمین دی گئی ہے وہ مدت ختم ہو جاتی تو زمین اصل مالکوں کے حوالہ کی جاتی تھی۔

رسول اللہ نے کھجور کا پھلدار درخت اس سے مستغنی ہو جانے کے بعد ام انسؓ کو واپس کر دیا تھا اور مہاجرین نے انصار کے بہت سے عطایا واپس کر دیئے تھے۔[4]

حق شفعہ : شفعہ دراصل ایک حق ہے جو جائداد غیر منقولہ کی بیع کے وقت شریک کو اگر وہ نہ ہوتا تو پڑوسی کو پہنچتا تھا۔

اس بارے میں رسول اللہؐ کا یہ فرمان ہے۔

"شریک بہ نسبت پڑوسی کے زیادہ حقدار ہے اور پڑوسی بہ نسبت غیر کے زیادہ مستحق ہے۔[5]

دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔

"شریک زیادہ حقدار ہے اگر شریک نہ ہو تو پھر پڑوسی۔[6]

حکومتِ الٰہی میں اس حق کا یہاں تک لحاظ کیا گیا تھا کہ شریک کی موجودگی میں بغیر اس کو

---

[1] عینی (ج ٦) ص ٣١٦ [2] نووی (ج ٢) ص ١٢ [3] فیض الباری (ج ٣) ص ٣٠٢ [4] عینی (ج ٦) ص ٣١٦
[5] مصنف عبدالرزاق از نصب الرایہ و عینی [6] مصنف ابن ابی شیبہ از نصب الرایہ

اطلاع دیئے اور اگر شریک نہ ہو تو پڑوسی کو اطلاع دیئے بغیر بیچنا جائز نہ تھا۔

چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا۔

"بغیر شریک کی اطلاع دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا حلال نہیں شریک چاہے تو لے لے ورنہ چھوڑ دے اگر اطلاع دیئے بغیر فروخت کردیا تو شریک کو اختیار ہے کہ بیع فسخ کر کے خود خرید ے۔[1]

پڑوسی کے متعلق آپ نے فرمایا۔

"پڑوسی زیادہ حقدار ہے اگر موجود نہ ہو تو اس کا انتظار کیا جائے۔[2]

حق وراثت: صاحب زمین کے انتقال کے بعد اس کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ حسب دستور شریعت اس کے ورثہ میں تقسیم کردی جاتی تھی۔ اس قانون وراثت کے ذریعہ ایک شخص کے پاس اتنی زیادہ زمین نہ رہنے پاتی جو دوسرے کی حق تلفی کی باعث بنتی یا دوسروں کی محنت سے خود عیشی کے سامان پیدا ہو سکیں کیونکہ اسلامی قانون کے مطابق جائداد صرف بڑے بیٹے ہی کو نہیں ملتی بلکہ سب بیٹوں اور بیٹیوں اور بیویوں میں تقسیم ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ پ ٤. ٣٢	مردوں کے لئے حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں عورتوں کے لئے بھی حصہ ہے جو ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار چھوڑ جائیں خواہ ترکہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

چونکہ ایسی صورت میں اس بات کا امکان تھا کہ ترکہ میں زمین تقسیم ہوتے ہوتے گزوں اور انچوں تک نوبت پہنچ جائے اور بہت سی وہ چیزیں تقسیم کرنی پڑیں جن کے تقسیم ہونے کے بعد پھر ان سے انتفاع کی شکل باقی نہ رہے مثلاً گھر وغیرہ تو اس کے لئے وقف علی الاولاد کی شکل نکالی گئی تھی جس سے صرف اس کا منافع تقسیم ہوتا اور شے اپنی جگہ پر

---

[1] مسلم و دار قطنی فی القضاء [2] نصب الرایہ ص ۱۲۷

بدستور قائم رہتی تھی اور قانونِ شفعہ مقرر کیا گیا تھا جس کے ذریعہ پڑوسی اور شریک کو دوسروں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہوتی تھی۔

بیع وشراء : زمانۂ خلافت میں متعدد صحابہ سے زمین کی خرید وفروخت ثابت ہے۔ ابو رافع ؓ صحابی نے رسول اللہ کے دیئے ہوئے قطائع فروخت کر دئے تھے۔[1] عبداللہ بن مسعود، عتبہ بن فرقد، حسن ؓ، حسین ؓ خباب بن ارت وغیرہ نے خراجی زمینیں خریدی تھیں۔[2]

اسی بنا پر صاحب ہدایہ کہتے ہیں

وقد صح ان الصحابة اشتروا اراضی الخراج[3]	یہ بات صحت کو پہنچ چکی ہے کہ صحابہ کرام نے خراجی زمینیں خریدی تھیں۔

رہ گئے وہ اقوال و آثار جن سے بظاہر خراجی زمین خریدنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ عموماً فاتح قومیں مفتوحین کے ساتھ ہر معاملہ میں ظلم وزیادتی کیا کرتی ہیں، اسلام نے اس معاملہ میں یہاں تک احتیاط برتی کہ محض احتمال کی بناء پر اس جائز حق کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اعلان کر دیا کہ خراجی زمینیں خریدنا مناسب نہیں ہے البتہ جہاں اس کا اندیشہ نہیں تھا مفتوحین کی آزادی رائے کو برقرار رکھنے کے لئے خرید وفروخت کی اجازت تھی جیسا کہ متعدد صحابیوں کا خریدنا مذکور ہو چکا ہے۔

الغرض زمانۂ خلافت میں صاحب زمین کو اپنی زمین پر پورے اختیارات حاصل تھے تاکہ ہر شخص آزادانہ روزی کما کر اپنے ضمیر کا استقلال باقی رکھ سکے۔

ایک شبہ کا دفعیہ : ممکن ہے بعض حضرات کو ان اقوال سے شبہ ہو جن سے بظاہر صاحب زمین کے اختیارات نہیں ثابت ہوتے ہیں مثلاً یہ روایت ہے کہ

"عتبہ بن فرقد نے فرات کے کنارے کچھ زمین خریدی حضرت عمر ؓ کو جب اس کا پتہ چلا تو "عتبہ" سے پوچھا کہ یہ زمین تم نے کس سے خریدی ہے "کہا، زمین والوں سے" عمر ؓ نے مہاجرین اور انصار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ زمین والے تو یہ لوگ ہیں

[1] الخراج لابی یوسف ص ۶۱ [2] الخراج لیحیی ص ۵۷ و ۵۸ [3] ہدایہ (ج ۱)

کیا ان سے خریدی ہے عرض کیا "نہیں" فرمایا جس سے خریدی ہے واپس کر کے اس کی قیمت لے لو۔[1]

اور جیسا کہ حضرت علیؓ نے عراق کے ایک پرانے باشندے سے اسلام قبول کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ تری زمین خراجی ہی رہے گی کیونکہ ہماری ہے "ان ارضك فلنا"[2]

حقیقت یہ ہے کہ عتبہ بن فرقد کا واقعہ زیادہ صحیح سند کے ساتھ اس کے خلاف منقول ہے چنانچہ "زیلعی" نے بیہقی کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

قال لعمر انی اشتریت ارضمن ارض السواد فقال عمر انت فیها مثل صاحبها	عتبہؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں نے سواد میں ایک زمین خریدی ہے آپ نے فرمایا کہ خراج کے معاملہ میں تم سابق صاحب زمین جیسے ہو (وہ ادا کرتا تھا تم بھی ادا کرو)

ان دونوں روایتوں میں عتبہؓ سے روایت کرنے والے شعبی ہیں جن کا نام عامر ہے اور شعبی سے روایت کرنے والے پہلی روایت میں "بکیر" ہیں جو شعبی کے صاحبزادہ ہیں اور جن کی کنیت ابو اسماعیل ہے۔ دوسری روایت میں شعبی سے روایت کرنے والے مجالد بن سعید ہیں اصول روایت کے لحاظ سے بکیر ضعیف اور مجالد قوی ہے[3] اس لئے پہلی روایت دوسری کے مقابلہ میں قابل اعتبار نہ ہو گی۔

رہ گئی حضرت علیؓ کی مذکورہ روایت تو اس کی تشریح و توضیح ذیل کی روایت سے ہوتی ہے۔

ایک دہقانی (زمیندار) نے اسلام قبول کیا حضرت علیؓ نے اس سے فرمایا کہ اگر تم اپنی زمین پر قایم رہو گے تو حفاظت کا معاوضہ (جزیہ) ہٹادیں گے اور اس کا بدل زمین سے وصول کریں گے اور اگر زمین چھوڑ دو گے تو اس کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔

بعینہٖ امیرؓ کے الفاظ یہ ہیں۔

وان تحولت عنها فحق احق بها[4]	اگر تو نے زمین چھوڑ دی تو اس کے ہم زیادہ حقدار ہیں

[1] الاموال ص ۷۴-۷۷ [2] حوالہ بالا [3] حاشیہ کتاب الخراج لیلی ص ۵۷ [4] احکام القراان (ج ۳)

ابو بکر جصاصؒ ان الفاظ کی یہ تشریح کرتے ہیں کہ

اگر تم زمین کی آبادی سے عاجز رہو گے تو ہم آباد کرائیں گے تاکہ حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں پائمال نہ ہوں۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں

یہ قانون مفتوحین ہی کی زمین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تمام زمینیں جن کی آبادی سے لوگ عاجز رہیں ان کا انتظام و بند و بست خلیفہ کے ذمہ ہے۔[1]

حاصل یہ ہے کہ مذکورہ اقوال سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی کہ آراضیِ مفتوحہ میں اصل باشندوں کو اور اہل قطائع کو تصرفات میں آزادی حاصل نہ تھی بشرطیکہ وہ تصرفات اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہوتے، ورنہ خلافت کو روک دینے کا حق حاصل تھا۔

نیز اسلامی جنگوں میں مفتوحہ زمین کے باشندے غلام نہ قرار دیئے جاتے تھے کیونکہ اسلام تو غلامی کا طوق گردن سے اتار پھینکنے کے لئے آیا ہے نہ کہ اس کو قایم رکھنے اور رواج دینے کے لئے، یہ دوسری بات ہے کہ بعض سیاسی و معاشی حالات کی مجبوری کی وجہ سے ابتداءً ممانعت کا قانون نہ نافذ کر سکا اور بتدریج اس کے ختم کرنے کی راہیں نکالیں۔[2]

جب اسلامی قبضہ کے بعد مفتوحین اپنی فطری حریت پر باقی رہتے تو آراضی اور ان کی تمام اشیاء پر فطری آزادی بر قرار رہنی لازمی تھی تاکہ ہر لحاظ سے مصئون و مامون ہو کر خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کر سکیں اور اسلام ہر طرح سے ان کے لئے رحمت ثابت ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ ساری زمینیں حقیقتاً اللہ کی ملک ہوتیں اور خلافت کے انتظام و نگرانی میں رہتی تھیں کاشتکار و صاحب زمین کی حیثیت محض امین کی ہوتی تھی۔

جب تک مقصد (خلق اللہ کا عام مفاد) پورا ہوتا رہتا نہ خلافت کو بے دخل کرنے کی ضرورت پڑتی اور نہ تصرفات کو محدود کرنے کی حاجت ہوتی اور جب یہ مقصد پائمال ہونے لگتا یا حقوق عامہ جو زمین سے متعلق ہیں ان کے فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا تو بلا تخصیص و ترجیح فاتح و مفتوح مسلم و غیر مسلم صاحب زمین کو بے دخل کر دینے یا اس کے تصرفات کو محدود کرنے کا پورا اختیار ہوتا تھا۔

---

[1] حوالہ بالا [2] احکام القرآن للجصاصؒ (ج ۳) ص ۱۲

قسط ۱

وحدتِ ادیان

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز، کراچی یونیورسٹی، پاکستان

" وحدت ادیان" ایک ایسا پرفریب نعرہ ہے جس کا شکار وہ لوگ تیزی سے ہو رہے ہیں جنہیں ہمارے ہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ یا مراعات یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ اور صرف ہمارے ہاں یعنی پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام ترقی پذیر اور خصوصاً اسلامی ممالک میں یہ اصطلاح تیزی سے اس طبقے میں پھیلائی جا رہی ہے جو اپنے مالی، کاروباری، سیاسی یا عہدوں کے ساتھ ساتھ ڈپلومیٹک (Diplomatic) سفارتی) اسٹاف اور فارن مشنز (Foreign Missions) میں کام کرنے والے لوگوں میں بھی اس کا چرچا عام ہے۔ بعض ممالک میں بعض تنظیموں نے چند قدم آگے بڑھ کر اس حوالہ سے کانفرنسوں اور سیمینارز کا اہتمام بھی کیا ہے اس اصطلاح کے موجدوں اور اس کے ترویج و اشاعت کے ذمہ داروں کا اگلا ہدف یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہیں۔ جہاں تعلیمی کیڈر سے تعلق رکھنے والے آزاد خیال لوگوں کو بطور ایجنٹ استعمال کرنے اور اس مکروہ نعرہ کو مقبول عام بنانے کے لئے کام شروع کر دیا گیا ہے اور بعض ملکوں میں (بشمول پاکستان کے بعض شہر) اندر ہی اندر یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ اب اساتذہ اور پڑھے لوگ پبلک مقامات (Public Places) اور انٹر یونیورسٹی (اندرون جامعات) ہونے والی تقاریب میں مل بیٹھنے اور چائے و ریفرشمنٹ کے وقفوں میں اس پر گفتگو کرنے لگے ہیں یوں تو وحدت ادیان پر گزشتہ نصف صدی سے وقتاً فوقتاً مختلف

مالک میں شوشے چھوڑے جارہے ہیں مگر نئے انداز سے "وحدت ادیان" کا تصور اس نیو ورلڈ آرڈر کا پیش کردہ ہے جسے اس صدی کا بدنام زمانہ منصوبہ کہا جانا چاہیئے۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے دو باتوں کو بطور خاص پیش کیا جارہا ہے اور وہ دو باتیں بظاہر بڑی سادہ ہیں مگر ان کے پیچھے موجود کفر وضلالت کا ایک طوفان ہے جو بہت جلد اہل اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے کر ملیا میٹ کرنا چاہتا ہے۔

بین الاقوامی پریس میں اس موضوع پر آئے دن مضامین و مقالات شائع ہورہے ہیں جن کو پڑھ کر ایک عام مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا اکیسویں صدی ایک نئے مذہب کی صدی ہوگی جو اسلام، یہودیت اور نصرانیت کا ملغوبہ ہوگا؟ وہ دو باتیں جن کی طرف لوگوں کو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ متوجہ کیا جارہا ہے وہ ہیں۔

(۱) مشترکہ عبادت گاہوں کی تعمیر (۲) مشترکہ کتاب مقدس کی اشاعت۔

پہلی اسکیم یا منصوبہ یہ ہے کہ تمام ممالک میں اور خصوصاً اسلامی ممالک میں اب بڑی بڑی مساجد کی بجائے ایسے ہال تعمیر کئے جائیں جن کا ایک حصہ مسلمانوں کے لئے ایک یہودیوں کے لئے اور ایک عیسائیوں کے لئے مخصوص کردیا جائے جہاں وہ اپنے اپنے مذاہب کے مطابق عبادت کرسکیں اور اس ہال یا عمارت کو مشترکہ عبادت گاہ کا نام دیا جائے جو وحدت ادیان کی علامت بن کر ابھرے۔ آگے چل کر اس ہال کے تین حصوں کو ایک ہی بنانے اور اس میں ہر تین مذاہب کے لوگوں کو آزادانہ شانہ بشانہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق دینا ہے۔ ابتدائی طور پر جہاں ایسے مشترکہ ہال تعمیر کرنے میں دشواری ہو وہاں مستقبل کی رہائشی اسکیموں میں عبادت گاہوں کے نام سے پلاٹ اس طرح مخصوص کیے جائیں کہ جب ان پلاٹوں پر مسجد تعمیر ہو تو اسی کے ساتھ ایک طرف چرچ اور دوسری طرف ٹیمپل (یہودی عبادت گاہ) بھی تعمیر کی جائے۔

قسط ۱

وحدتِ ادیان

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز، کراچی یونیورسٹی، پاکستان

" وحدت ادیان" ایک ایسا پرفریب نعرہ ہے جس کا شکار وہ لوگ تیزی سے ہو رہے ہیں جنہیں ہمارے ہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ یا مراعات یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ اور صرف ہمارے ہاں یعنی پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام ترقی پذیر اور خصوصاً اسلامی ممالک میں یہ اصطلاح تیزی سے اس طبقے میں پھیلائی جا رہی ہے جو اپنے مالی، کاروباری، سیاسی یا بیوروکے ساتھ ساتھ ڈپلومیٹک (Diplomatic) سفارتی) اسٹاف اور فارن مشنز (Foreign Missions) میں کام کرنے والے لوگوں میں بھی اس کا چرچا عام ہے۔ بعض ممالک میں بعض تنظیموں نے چند قدم آگے بڑھ کر اس حوالہ سے کانفرنسوں اور سیمینارز کا اہتمام بھی کیا ہے اس اصطلاح کے موجدوں اور اس کے ترویج و اشاعت کے ذمہ داروں کا اگلا ہدف یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہیں۔ جہاں تعلیمی کیڈر سے تعلق رکھنے والے آزاد خیال لوگوں کو بطور ایجنٹ استعمال کرنے اور اس مکروہ نعرہ کو مقبول عام بنانے کے لئے کام شروع کر دیا گیا ہے اور بعض ملکوں میں (بشمول پاکستان کے بعض شہر) اندر ہی اندر یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ اب اساتذہ اور پڑھے لوگ پبلک مقامات (Public Places) اور انٹر یونیورسٹی (اندرون جامعات) ہونے والی تقاریب میں مل بیٹھنے اور چائے و ریفرشمنٹ کے وقفوں میں اس پر گفتگو کرنے لگے ہیں یوں تو وحدت ادیان پر گزشتہ نصف صدی سے وقتاً فوقتاً مختلف

ممالک میں شوشے چھوڑے جارہے ہیں مگر نئے انداز سے "وحدت ادیان" کا تصور اس نیو ورلڈ آرڈر کا پیش کردہ ہے جسے اس صدی کا بدنام زمانہ منصوبہ کہا جانا چاہیئے۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے دو باتوں کو بطور خاص پیش کیا جارہا ہے اور وہ دو باتیں بظاہر بڑی سادہ ہیں مگر ان کے پیچھے موجود کفر وضلالت کا ایک طوفان ہے جو بہت جلد اہل اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے کر ملیا میٹ کرنا چاہتا ہے۔

بین الاقوامی پریس میں اس موضوع پر آئے دن مضامین و مقالات شائع ہو رہے ہیں جنہیں پڑھ کر ایک عام مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا اکیسویں صدی ایک نئے مذہب کی صدی ہوگی جو اسلام، یہودیت اور نصرانیت کا ملغوبہ ہوگا؟ وہ دو باتیں جن کی طرف لوگوں کو انتہائی مکاری کے ساتھ متوجہ کیا جارہا ہے وہ ہیں۔

۱۔ مشترکہ عبادت گاہوں کی تعمیر (۲) مشترکہ کتاب مقدس کی اشاعت۔

پہلی اسکیم یا منصوبہ یہ ہے کہ تمام ممالک میں اور خصوصاً اسلامی ممالک میں اب بڑی بڑی مساجد کی بجائے ایسے ہال تعمیر کئے جائیں جن کا ایک حصہ مسلمانوں کے لئے ایک یہودیوں کے لئے اور ایک عیسائیوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے جہاں وہ اپنے اپنے مذاہب کے مطابق عبادت کرسکیں اور اس ہال یا عمارت کو مشترکہ عبادت گاہ کا نام دیا جائے جو وحدت ادیان کی علامت بن کر ابھرے۔ آگے چل کر اس ہال کے تین حصوں کو ایک ہی بنانے اور اس میں ہر تین مذاہب کے لوگوں کو آزادانہ شانہ بشانہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کا حق دینا ہے۔ ابتدائی طور پر جہاں ایسے مشترکہ ہال تعمیر کرنے میں دشواری ہو وہاں مستقبل کی رہائشی اسکیموں میں عبادت گاہوں کے نام سے پلاٹ اس طرح مخصوص کیے جائیں کہ جب ان پلاٹوں پر مسجد تعمیر ہو تو اسی کے ساتھ ایک طرف چرچ اور دوسری طرف ٹیمپل (یہود کی عبادت گاہ) بھی تعمیر کی جائے۔

اس طرح کی مشترکہ عبادت گاہیں، فوری طور پر بین الاقوامی ہوائی اڈوں، جامعات اور عوامی مقامات پر تعمیر کرنے کا پروگرام ہے۔

دوسری اسکیم یا منصوبہ "مشترکہ کتاب مقدس" کی اشاعت ہے یعنی قرآن اور بائیبل (تورات وانجیل) اس طرح اکٹھے شائع کیے جائیں کہ وہ ایک ہی جلد میں مجلد ہوں اور تینوں مذاہب (اسلام، یہودیت ونصرانیت) کی مشترکہ عبادت گاہوں میں رکھے جائیں۔

ایسے ممالک جہاں ان دو منصوبوں پر کام شروع ہو چکا ہے وہاں آباد مسلمانوں میں سخت غم وغصہ وتشویش پائی جاتی ہے اور وہ علماء اسلام سے اس سلسلہ میں رجوع کر رہے ہیں۔ مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور جامعہ الازہر (مصر) کے رئیس وشیخ الجامعہ کو اس سلسلہ میں روزانہ خطوط موصول ہو رہے ہیں، سعودی عرب کی گرینڈ علماء کونسل کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہو چکا ہے اور اللجنۃ الدائمہ للبحوث العلمیہ والافتاء (یعنی سعودی عرب کی علمی مسائل ومعاملات اور فتاوی کے سلسلہ میں قائم مستقل کمیٹی) نے اس پر اپنی تفصیلی رائے اخبارات وجرائد کو جاری کی ہے۔

(دیکھئے مجلۃ الدعوۃ الریاض)

اسلام تمام ادیان کا ناسخ ہے:

اسلام کے ان اعتقادی اصولوں کے مطابق جن پر اہل اسلام کا اجماع ہے۔ اسوقت روئے زمین پر اسلام کے سوا کوئی سچا مذہب نہیں پایا جاتا اور اسلام سابقہ تمام ادیان کا ناسخ اور خاتم ہے۔ چنانچہ کرۂ ارض پر اللہ تعالی کی عبادت کا کامل ترین اور جامع ترین طریقہ سوائے اسلام کے اب اور کوئی نہیں اس سلسلہ میں اس ارشاد باری سے بھی رہنمائی ملتی ہے جس میں کہا گیا ہے: " ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو فى الآخرة من الخاسرين " (۱)

(یعنی جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے یا پسند کرے تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام وہ ہے جو آپ لے کر آئے اس کے سوا سب غیر اسلام ہے۔

قرآن سابقہ کتابوں کا ناسخ ہے!

قرآن کریم کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ آخری کتاب ہے اور یہ اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی ناسخ ہے خواہ وہ زبور ہو، تورات ہو یا انجیل۔ چنانچہ آپ قرآن کریم کے سوا کسی اور کتاب کے مطابق اللہ کی عبادت نہیں کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں ارشاد خداوندی ہے۔

" وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق" (۲)

(یعنی (اے نبیؐ) اتاری ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ، تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو اس سے پہلے (کتاب) ہے اور یہ محافظ ہے اس پر تو آپ فیصلہ فرمادیں ان کے درمیان اس سے جو نازل فرمایا اللہ نے اور آپ نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آیا ہے)

تورات وانجیل کے موجودہ نسخے محرف ہیں!

اس نظریہ پر ایمان لانا ضروری ہے کہ تورات وانجیل قرآن سے منسوخ ہو چکیں، پھر ان میں بہت سی تحریف و تبدیلیاں اور کمی بیشی ہو چکی جیسا کہ اس کا ذکر قرآنی آیات میں بھی ہے مثلاً ایک آیت اس سلسلہ میں یوں ہے:

" فبما نقضهم میثاقهم لعناهم وجعلنا قلوبهم قاسیة یحرفون الکلم عن مواضعه ونسوا حظا مما ذکروا به ولا تزال تطلع علی خائنة منهم الا قلیلاً منهم" (۳)

(یعنی بوجہ ان کی عہد شکنی کے ہم نے اپنی رحمت سے انہیں دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ اللہ کے کلام کو اپنی اصل جگہ سے بدل دیتے ہیں اور انہوں نے بھلا دیا بڑا حصہ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی اور آپ ان کی خیانت پر ہمیشہ آگاہ ہوتے رہیں گے بجز ان کے چند آدمیوں کے)۔

ایک اور آیت طیبہ میں ہے " فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیهم ثم یقولون هذا من عند الله لیشتروا به ثمناً قلیلا فویل لهم مما کتبت ایدیهم وویل لهم مما یکسبون " (۴)

(پس ہلاکت ہو ان کے لئے جو خود اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔ تاکہ اس کے بدلے معمولی قیمت وصول کر لیں، پس ہلاکت ہو ان کے لئے ان کے ہاتھوں سے لکھنے کی وجہ سے اور ہلاکت ان کے لئے اس مال کی وجہ سے جو وہ اس طرح کماتے ہیں)

انہی کے بارے میں اللہ رب العزت نے مزید فرمایا " وان منهم لفریقاً یلوون السنتهم بالکتاب لتحسبوه من الکتاب وما هو من الکتاب ویقولون هو من عند الله وما هو من عند الله ویقولون علی الله الکذب وهم یعلمون " (۵)

(بے شک ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ موڑتے ہیں تاکہ تم خیال کرنے لگو کہ یہ بھی اصل کتاب ہی سے ہے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے اترا ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں اترا اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں)۔

ان آیات طیبات سے واضح ہوا کہ اہل کتاب نے اپنی کتابوں میں کس قدر من گھڑت باتیں شامل کرکے طرح طرح کی تبدیلیاں پیدا کیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی اس دھاندلی کا پردہ چاک کردیا اور وضاحت فرمادی کہ ان کتابوں میں بہت کچھ رطب ویابس یہ کہکر شامل کردیا گیا کہ یہ اللہ ہی کا نازل کردہ ہے حالانکہ پروردگار نے اسے نازل نہیں کیا۔ اس وضاحت کے بعد یہ بات ازخود ثابت ہوگئی کہ اب ان کتابوں میں اگر کچھ باتیں اصل باقی بھی ہوں تو وہ نزول قرآن سے منسوخ ٹھہریں اور جو اصل نہیں بعد کی شامل کردہ ہیں وہ ازخود باطل ومردود ہیں۔

تورات وانجیل اب قابل استفادہ نہیں!

نزول قرآن کے بعد تورات وانجیل سے استفادہ کرنا یا انہیں قابل استفادہ سمجھنا ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ مسند احمد بن حنبل اور سنن دارمی وغیرہ کی روایت ہے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا نسخہ دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا اے عمر کیا تم کسی شک میں مبتلا ہو؟ کیا میں تمہارے پاس ایک روشن اور صاف ستھری کتاب نہیں لایا؟ اس وقت اگر میرے بھائی موسیٰ (علیہ السلام) زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا۔ (۶)

[illegible] صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام اقوام وملل کا ایمان لانا ضروری ہے:

[illegible] کے اعتقادی اصولوں میں یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ ہمارے نبی ورسول سیدنا محمد [illegible] علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں جیسا کہ خود رب العزت نے صراحت سے فرمایا۔

[illegible] محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔

(یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ تو اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں۔) چنانچہ نبی آخر الزماں علیہ السّلام کی تشریف آوری کے بعد اور کوئی نبی و رسول قابل اتباع نہیں رہا اور اگر انبیائے سابقین میں سے کوئی زندہ ہوتا تو اسے بھی حضور ہی کی اتباع کرنا لازم ہوتی۔ اس سلسلہ میں ارشاد باری ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہے:

واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علی ذلکم اصری قالوا اقررنا قال فاشھدوا وانا معکم من الشاھدین (۷)

(اور یاد کرو جب اللہ نے انبیاء سے پختہ وعدہ لیا کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو میں تمہیں کتاب و حکمت سے دوں۔ پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کرنے والا ہو ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا (اسکے بعد فرمایا) کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس پر تم نے میرا بھاری ذمہ اٹھا لیا، سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا (اللہ نے فرمایا) تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ جب وہ قیامت کے قریب دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو وہ نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں گے اور حضور ہی کی شریعت کے احکامات کا نفاذ کریں گے۔ اللہ رب العزت کا یہ ارشاد بھی اتباع محمد اور پیروی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید میں نازل ہوا فرمایا:

"الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل" (۸)

(کہ وہ لوگ جو اس نبی امی و رسول کی اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر وہ لکھا ہوا پاتے ہیں

اپنے پاس تورات وانجیل میں)۔

اسلام کے اعتقادی اصولوں میں یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام لوگوں کے لئے عام ہے ارشاد باری ہے۔

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیرا ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ (۹)

(ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بناکر) مگر اکثر لوگ (یہ بات) نہیں جانتے)۔ ایک اور جگہ اسی سلسلہ میں فرمایا قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً (۱۰) (اے نبی آپ فرما دیجئے! اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں) اس طرح اور بھی بہت سی ایسی آیات طیبات ہیں جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت تک کے لئے نبی بنا کر بھیجا جانا اور آپ ہی کی اتباع واجب ہونا ثابت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے والے کافر ہیں:

اسلام کے اعتقادی اصولوں میں یہ بات بھی طے ہے کہ ان تمام لوگوں پر کفر کا حکم لگایا جائے گا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان نہ لائیں خواہ وہ مشرک ہوں یا اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) اور انہیں کافر ہی کہا جائے گا۔ اور انہیں اللہ کے دشمن اللہ کے رسول کے دشمن اور مومنین کے دشمن کہا جائے گا۔ اور وہ جہنمی ہیں۔ اس سلسلہ میں ارشادات خداوندی بڑے واضح ہیں دیکھئے:

لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتی تاتیھم البینۃ (۱۱) (کفر کرنے والے اہل کتاب اور مشرکین اپنے دین کو چھوڑنے والے نہ تھے یہاں تک (ان کے پاس روشن دلیل آجائے) اسی سورت میں دوسری جگہ اہل کتاب کو کافروں میں شمار کرتے ہوئے کہا: ان الذین کفروا من اھل الکتاب

والمشرکین فی نار جھنم خالدین فیھا اولئک ھم شر البریہ (۱۲)
(بے شک وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا اور شرک کرنے والے سب جہنم کی آگ میں ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے وہی ساری مخلوق میں بدتر ہیں)۔
صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ اس امت کے لوگوں میں سے جس کسی نے بھی میرے بارے میں سنا ہو خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی۔ پھر وہ مجھ پر ایمان لائے بغیر مرجائے۔ تو وہ جہنمی ہی ہو کر مرے گا۔ (۱۳)

حواشی وحوالہ جات

(۱) سورہ آل عمران آیت: ۸۵
(۲) سورۂ مائدہ آیت: ۴۵
(۳) سورہ المائدہ آیت: ۱۳
(۴) سورہ البقرہ آیت: ۷۹
(۵) سورہ آل عمران آیت: ۷۸
(۶) سنن دارمی، مسند احمد بن حنبل
(۷) سورہ آل عمران آیت: ۸۱
(۸) سورہ الاعراف: ۱۵۷
(۹) سورہ سبا: ۲۸
(۱۰) سورہ الاعراف: ۱۵۸
(۱۱) البینہ ۱ (۱۲) البینہ ۶ (۱۳) صحیح مسلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرپرست اعلی ندوۃ المصنفین دھلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجلسِ ادارت اعزازی

سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی

نگرانِ اعلی

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۲،۱۲۳ | جون، جولائی ۱۹۹۸ء | شمارہ ۶، ۷

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ بُرہان

4136 - اردو بازار جامع مسجد دہلی۔110006 * فون نمبر 3262815

زرِ تعاون
فی پرچہ ۶ روپے
سالانہ ۷۲ روپے
کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISION

عمیدالرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپواکر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

گھر گھر میں ٹیلی ویژن اور اس پر مار دھاڑ پر مبنی فلموں نے معاشرہ کا اس قدر بُرا حال کر دیا ہے کہ قتل، مار اور چوری، ڈکیتی، زناکاری کے واقعات کی بھرمار نے بیسویں صدی کے انسان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ اور اب اکیسویں صدی آ رہی ہے اس میں ایک سائنسی اندازہ کے مطابق انسانیت سوز حرکات اس قدر عام ہو جائینگی کہ دنیا میں عام آدمی کو زندگی آرام وچین سے بسر کرنے کے لئے صرف خواب وخیال کی دنیا ہی میں گھومنا پڑے گا۔ زندگی اس پر تنگ ہو جائیگی اور اسے دنیا میں ایسی گھٹن محسوس ہوگی کہ جس سے وہ جینے کے بجائے اپنی موت کو ہی ترجیح دینا اپنے لئے بہتر سمجھے گا۔ چنانچہ ترقی یافتہ ماڈرن ممالک میں ابھی سے آسان موت کے لئے دوائیاں اور انجکشن بنانے کی تیاری شروع ہوگئی ہیں۔ آئے دن اخبارات ہیں یہ بات معلوم کر کے کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ اچھے خاصے انسان نے بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو گولی مار کر ختم کر دیا۔ یا پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی اور یا پھر کسی بلند و بالا عمارت سے چھلانگ لگا کر کود کر اپنے آپ کو موت کی دہلیز پر پہنچا دیا ـــــ یہ واقعات اکا دُکا سال دو سال میں پہلے بھی سننے کو ملتے تھے لیکن آج حال یہ ہے کہ کسی بھی شہر یا ملک کے روزانہ اخبار میں ایسی ہی خبریں زیادہ ملیں گی جیسیں خودکشی کے واقعات ہوں۔

جب دنیا میں سائنس دانوں نے ہوائی جہاز ٹی وی ریڈیو ایجاد کئے تو ماڈرن انسان ایسا اترایا کہ جیسے اس نے اپنی فلاح کا راستہ چن لیا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد ماڈرن انسان کو محسوس

ہوا کہ یہ سب ایجادات انسانوں کے لئے جہاں باعث راحت ہیں وہاں انکی وجہ سے برائیاں اور خرابیاں بھی ایسی ہیں کہ انسان کے لئے ان ایجادات کی پھر کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی ہے بلکہ اس کے مضر اثرات سامنے آنیکے بعد تو انسان اس سے پناہ مانگنے ہی پر مجبور ہے۔

خداشناسی، خداپرستی سے ماڈرن انسان جب دور ہوا تو اس نے اپنے آپ کو خود ہی تباہی و بربادی کے غار میں دھکیل دیا۔ اور سائنسی ایجادات پر ایسا اکڑا کہ وہ نظام قدرت کو بھول کر اس پر سوالیہ نشان لگانے لگا لیکن جب ان ایجادات نے اپنی پول کھولدی تو اب انسان جاگا اور اسے حقیقت کا احساس ہوا۔ آج کا "ماڈرن انسان" اب اپنے سکون کے لئے جگہ کا متلاشی بن گیا ہے جنگلوں میں فارم ہاؤس کی شکل میں جگہ بنا کر رہنے پر مجبور ہے جہاں دور دور تک کسی دوسرے انسان کی صورت نظر نہ آئے اور بولی سننے کو نہ ملے۔ یہ ہے خدا سے دور ہونیکی ماڈرن انسان کی بدنصیبی۔ اب خدا کو ڈھونڈھ رہا ہے جسے اس نے پہلے اپنے سے دور کر دیا تھا اب خدا کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔

دن دھاڑے بھیڑ بھاڑ علاقوں میں خون خرابہ چلتے پھرتے آدمیوں کا قتل، نوزائیدہ بچوں کا اغوا ان کو ان کی ماؤں کی گود سے چھین کر لیجانا یہ عام بات ہوتی جارہی ہے۔ اگر اس پر جلد قابو نہ پایا تو پھر ہماری یہ سائنسی ترقیاں کس کام کی رہ جائینگی جس سائنسی ترقی میں انسان کو چین وسکون میسر نہ ہو اسے حاصل کر کے اگر ہم نے اپنا وقت ضائع نہ کیا ہے تو اور کیا کیا ہے؟

خداوند تعالیٰ نے انسان کو الگ الگ فطرت سے نوازا، ہر انسان کو الگ دماغ اور الگ دل دیا۔ لیکن سائنسی ایجادات نے ان سب باتوں سے بے پرواہ ہو کر ہر انسان کو ایک ہی جامہ میں رکھنے کا بیڑہ اٹھایا تو اس کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا جو ہم دیکھ رہے ہیں اور آئے دن روزانہ اخبارات میں پڑھ رہے ہیں۔

آخیر میں ہم یہ کہے بغیر نہ رہیں گے اور جسے اب ماڈرن انسانوں نے بھی اچھی طرح سمجھنا

شروع کردیا ہے کہ انسان کی فلاح وبقاء قانونِ قدرت کی عمل داری ہی میں ہے۔ خداوند تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں بندہ کو اپنے کو کمال عجز وانکساری کے ساتھ حاضر کرکے اسکی چاہت میں اپنی چاہت کو فنا کرکے پھر وہ دیکھے کہ قدرت کی طرف سے اس پر کس قدر رحمت وکرم کی اور انسان کے لئے امن وراحت کے سامان حقیقی کی فراوانی ہوتی ہے۔ انسان کی فلاح وبہبودگی کا انحصار قانونِ قدرت کی عمل داری میں ہی ہے نہ کہ اس سے بغاوت یا لاپرواہی میں۔

جناب اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں حکومت کو تشکیل پائے ہوئے ۱۰۰ روز سے زائد ہو چکے ہیں اس عرصہ میں حکومت کی طرف سے اقلیتوں کے لئے کوئی ایسا خطرہ نہیں پیدا ہوا جس کا اظہار واندیشہ کیا جارہا تھا۔ اور مندر کے معاملے میں جناب باجپئی کا یہ واضح اعلان اخبارات میں آہی چکا ہے کہ بابری مسجد کی جگہ مندر نرمان عدالتی فیصلہ کے بغیر ہرگز نہیں ہونے دیا جائے گا۔ حالانکہ بجرنگ اور وشو ہندو پریشد جیسی انتہا پسند تنظیمیں لگاتار اس کوشش میں ہیں کہ مندر نرمان جلد از جلد ہو جائے۔ آر ایس ایس کے سربراہ رجو بھیا بھی پہلے اعلان کر چکے تھے کہ مندر ہر صورت میں بنے گا لیکن جب جناب باجپئی نے یہ اعلان کیا کہ عدالتی فیصلہ سے پہلے مندر بنانے کی حکومتِ ہند کسی کو بھی اجازت نہیں دیگی۔

وزیر اعظم جناب باجپئی کا یہ اعلان اقلیتوں کے لئے کافی اطمینان بخش ہے اور اس سے جہاں ہندوستان کے سیکولر آئین کی حفاظت ہوگی بلکہ دنیا میں بھی ہندوستان بدنامی کے کلنک سے محفوظ رہے گا۔ جہاں باجپئی حکومت اس لحاظ سے اطمینان بخش ہے وہاں اس لحاظ سے ابھی اسے سخت امتحانات سے گذرنا ہے جو عوام کی روزمرہ کی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج عام آدمی کے لئے ضروریات زندگی گراں سے گراں ہوتی جارہی ہیں اشیائے خورد ونوش مہنگی سے مہنگی ہوتی جارہی ہیں اُنکی قیمتیں

آسمان کو چھو رہی ہیں۔ پانی بجلی سے لوگ ترستے جا رہے ہیں۔ گرمی کے موسم میں پورے ملک کے عوام آئے دن [illegible] پریشان ہو گئے ہیں [illegible] آبادی میں مکانوں کی قلت میں لوگوں کے مکان اب کبوتر خانوں کی طرح بنے ہوئے ہیں اونچی اونچی عمارتوں میں روشنی اور ہوا کا کہیں گذر بسر نہیں ہے اب یہ اشیاء یعنی روشنی اور ہوا صرف مصنوعی طریقہ بجلی کے ذریعہ سے حاصل کیجا سکتی ہیں۔ اور جب یہ بھی ناپید ہو جائے تو ان کبوتر خانہ نما مکانوں اور بلند و بالا عمارتوں میں انسانوں کا دم نہیں گھٹے گا تو اور کیا ہوگا۔ مہنگائی پر قابو اور اشیائے ضروریہ کی فراہمی جیسے مسائل بھی اگر باجپئی سرکار کے ذریعہ حل ہو جائے تو پھر ہم وزیر اعظم باجپئی کو ان کی سرکار کی اعلیٰ کارکردگی پر مبارکباد کے الفاظ ضرور ادا کرنا اپنا صحافی فرض سمجھتے۔ اس وقت ملک میں کاروبار کا سخت مندہ ہے، شیئر بازار کبھی گرتے ہیں اور کبھی تھوڑا بہت چڑھتے بھی ہیں لیکن گراوٹ اس قدر ہوتی ہے کہ جب تھوڑا بہت شیئر بازار اٹھتا ہے تو اس سے کاروباری لوگوں کو کوئی فائدہ ہوتا نظر نہیں آتا ڈالر کے مقابلے روپیہ روز بہ روز گرتا جا رہا ہے ضرورت ہے ان سب پر قابو پانے کی — اگر باجپئی حکومت نے ان سب پر قابو پالیا مہنگائی افراطِ زر ختم ہو جائے تو اس ہندوستان کی عوام کو صحیح معنوں میں امن و چین میسر ہو جائے گا اور باجپئی حکومت انکے دلوں میں گھر کر جائے گی۔ اور جو نیتا اور جماعتیں باجپئی سرکار کو گرانے میں ایک جٹ ہو کر لگی ہیں انکیں یقیناً منہ کی کھانی پڑے گی — انشاء اللہ!

قسط ۲

مغربی فنِ تعمیر پر اسلامی فنِ تعمیر کے اثرات

از

(مارٹن ایس برگس)

مترجمہ: جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔ اے

ایم صلاح الدین نے انھیں کارخانوں کے دو دکشوں سے تشبیہ دے کر ان کے ساتھ کچھ زیادہ انصاف نہیں کیا ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ یہ مینار قاہرہ کے میناروں کے حسن اور ان کی نزاکت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایران نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس عجیب وغریب قلمی آرائش[1] (Stalactites) کی تزئین کا استقبال کیا جس کا حال ہم نے آگے بیان کیا ہے۔

شامی مصری، مکتب تعمیر کی اہم عمارتیں سب کی سب قاہرہ میں پائی جاتی ہیں یہ جامع مسجدیں ہیں۔ ان میں جامع ازہر (سنہ ۹۷۰ء)۔ جامع الحاکم (سنہ ۹۹۰ء تا ۱۰۱۲ء)، چھوٹی سی جامع الاقمر (سنہ ۱۱۲۵ء) اور مقبرہ الجیوشی کی چھوٹی سی لیکن اہم مسجد (سنہ ۱۰۸۵ء) شامل ہے۔ جامع ازہر اور جامع الاقمر میں چھتے قدیم زمانے کے ستونوں پر اٹھائے گئے ہیں۔ اور جامع الحاکم کے چھتے اینٹ کے پایوں پر بنائے گئے ہیں۔ جامع الحاکم میں پتھر استعمال کیا گیا ہے اور قاہرہ کی اسلامی عمارتوں میں پتھر کے استعمال کی

---

[1] پہاڑی سلسلوں کے اندر کہیں کہیں قدرتی غاروں میں کاربونیٹ آف لائم کا تہ نشین مادہ عمودی قلموں کی شکل میں غار کی چھت وغیرہ سے لٹکتا رہتا ہے اور پانی کے رستے سے بنتا ہے عمارتوں کے گوشوں میں جہاں ایسی ہی شکلیں بنائی جاتی رہیں (قلمی آرائش) کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

یہ پہلی مثال ہے حالانکہ اس کے قریب ہی مقطم کی پہاڑیوں میں چونے کا نہایت نفیس پتھر دستیاب ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اب تک قاہرہ نے عراقی (مسوپٹیمیائی) روایتوں ہی کی پوری پوری پیروی کی تھی۔ جامع الجیوشی، مقبرہ کے ساتھ مسجد کی پہلی مثال ہے۔ آگے چل کر اسی طرز کو بہت زیادہ ترقی دی گئی اور اس میں نئی نئی چیزیں بڑھائی گئیں۔ اس مسجد میں مقبرہ اور مسجد کے بانی کی قبر پر ایک گنبد بنایا گیا ہے اور مقبرہ کی جنوبی دیوار میں ایک محراب نکالی گئی ہے اس کا صحن چھوٹا ہے اور مسجد اور مقبرہ کے درمیان ایک چھتّے دار عرضی حصہ ہے۔ مسجد سے لگا ہوا ایک مربع مینار ہے جو تین درجوں میں بنایا گیا ہے جیسے گنبد صقلیہ کے کلیساؤں کے اوپر نظر آتے ہیں۔ اسلامی فن تعمیر کی تاریخ میں گنبد کا ارتقاء حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن مغربی تعمیر کاری پر اسلامی تعمیر کاری کی اس خصوصیت نے کچھ زیادہ اثر نہیں ڈالا ہے۔ اس لئے ہم اس مختصر سے جائزے میں اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی وجوہ کی بنا پر ہم یہاں اس لاجواب خصوصیت پر بحث نہیں کریں گے جو قلمی آرائش کہلاتی ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی گئے ہیں، قلمی آرائش ان کے ساتھ ہر جگہ پہنچی ہے اور ہندوستان سے لیکر اسپین تک یہ ان کی تعمیر کاری کا امتیازی نشان بن گئی ہے غالباً یہ قلمی آرائش عراق (مسوپیٹمیائی) پیداوار ہے اور مستند طور پر پہلی بار جامع الجیوشی کے مینار پر نمودار ہوئی ہے۔ پھر یہ جامع الاقمر کے پیش رخ پر نظر آتی ہے۔ ... یہ تزئین کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ یہاں ایسی محرابیں بھی ہیں جنہیں گھونگے کے خول سے ... یہ تراشا گیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی محراب یقیناً نشاۃ ثانیہ کی جانی پہچانی صدف نما محراب کی پیش رو ہے پیش رخ کے سرے پر اس کے اطراف کوفی خط میں ایک تزئینی کتبہ چلا گیا ہے۔ ... قاہرہ کی مسجدوں میں جو اور تفصیلات ملتی ہیں ان میں آرے کے دانتوں جیسے کھڑ گج ... یہ چیز بھی غالباً عراق (مسوپیٹمیائی) ہی سے لی گئی ہے۔ اس حد بندی نے بھی وینس کے ... لوگوں اور دوسرے لوگوں کے ملکوں کے معماروں کو کافی متاثر کیا ہوگا۔

تیرہویں صدی کے بعد سے ہیں تمام علاقوں میں اسلامی فن تعمیر کے آثار بہت ملتے ہیں، ان علاقوں کی فہرست میں ہندوستان اور ترکی کو شامل اور صقلیہ کو اس سے خارج کرنا چاہیئے، اسپین میں اہم محلات ہیں جو الحمرا اور القصر کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ قصر اپنے چپے چپے کی نازک تزئین کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اسپین میں بعد کے اسلامی دور میں جو عمارتیں بنی ہیں وہ درجہ اول کی نہیں ہیں قاہرہ میں ۱۵۱۷ء تک نفیس ترین مسجدوں اور مقبروں کا ایک سلسلہ ملتا ہے۔ ۱۵۱۷ء میں ترکوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد سے جو چند مسجدیں بنیں ان کے لئے عثمانی ترکوں کی طرز اختیار کر لی گئی۔ اناطولیہ کے علاقے میں قونیہ اور بروسہ کے مقاموں پر تقریباً ۱۲۰۰ء سے لیکر ۱۴۵۳ء تک نہایت دلچسپ مثالوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ ترکی کا دارالحکومت بن گیا۔ اس تاریخ کے بعد سے عثمانی تعمیر کار قاہرہ اور دمشق جیسے دور دست علاقوں میں تک عمارتیں بناتے وقت بازنطینی عمارتوں سے بہت سی چیزیں نہایت آزادی کے ساتھ مستعار لینے لگے۔ ایران ترکستان اور ہندوستان میں بعد کے دوروں کی اسلامی عمارتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ موجود ہے اور ہندوستان میں حالیہ زمانوں تک بھی ان ہی تعمیری روایتوں کو اپنے پیش نظر رکھا گیا ہے، اسلامی تعمیر کاری کے بعد کے پانچ اہم مکاتیب میں واضح مقامی خصوصیات ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہ پانچ مکاتیب حسب ذیل ہیں: شامی مصری مکتب، اندلس کا اسلامی مکتب، ایرانی مکتب، عثمانی ترکوں کا مکتب اور ہندوستانی مکتب۔ ان مکتبوں کے یہ باہمی اختلافات ایک حد تک قابل حصول تعمیری مسالے کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بڑی حد تک ان اختلافات کی بنیاد تعمیری روایتوں پر رکھی ہے۔

قرون وسطیٰ، میں مسجد کے نقشے کے ارتقار میں بڑا تنوع نظر آتا ہے بعض ملکوں میں اب بھی جامع مسجدیں بنتی رہیں۔ مقبرہ کے ساتھ مسجد بنانے کا شوق بہت مقبول ہوا۔ اس فہرست

میں مدرسہ یعنی صلیب نما مدرسہ اور مسجد بھی آجاتی ہے جس کا نقشہ بارہویں صدی میں ایجاد ہوا۔ گنبد اسلامی تعمیر کاری کا ایک محبوب نشان بن گیا۔ قاہرہ میں اس کی شکل اونچی سی ہوتی تھی ایران اور ترکستان میں پھولے ہوئے یا بیضوی گنبد زیادہ پسند کئے جاتے تھے اور ادھر قسطنطنیہ کی مسجدوں میں دبے ہوئے بازنطینی گنبد بنائے جاتے تھے۔ مصر کے سنگی گنبدوں کو باہر کی طرف پندرہویں صدی میں لیس نما نمونوں سے بچایا جاتا تھا۔ ایران میں گنبد تابناک کاشی کاری سے مزین کئے جاتے تھے۔ ان گنبدوں کو قلمی آرائش میں بنے ہوئے گنبد کے کروی حصے سہارتے تھے۔ بے شبہ قلمی آرائش ہر جگہ استعمال ہوتی تھی۔ اکثر تو یہ آرائش ضرورت سے زیادہ ہوتی تھی۔ کبھی تو یہ قلمی آرائش چھت سے اسی طرح آویزاں کی جاتی تھی جس طرح کہ ہماری پنکھا نما انگریزی لاداؤ چھتوں میں آویزے ہوتے ہیں۔ ایک طرف اگر اسلامی گنبدوں نے مغرب کے نشاۃ ثانیہ کے گنبدوں کو بہت کم متاثر کیا ہے تو دوسری طرف یہ بہت ممکن نظر آتا ہے کہ دلکش طرز کے اسلامی میناروں نے اور خاص کر چودھویں اور پندرہویں صدی کی قاہرہ کی عمارتوں میں پائے جانے والے میناروں نے نشاۃ ثانیہ میں اطالیہ کے گھنٹہ گھر (Campanile) اور ایسے ہی مشہور تعمیر کار کرسٹوفرون (C. Wren) کے بنائے ہوئے شہر کے بعض نفیس نکیلے میناروں کو متاثر کیا ہوگا۔ بے شبہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک اسلامی تعمیر کاروں نے گنبد اور مینار کو ایک دوسرے کے مقابل بنانے کے امکانات محسوس کر لئے تھے، بالکل ایسے ہی جیسے کرسٹوفران نے آگے چل کر سینٹ پال کے کلیسا میں گنبد اور میناروں کو نہایت موثر انداز میں ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا۔ ایران کے قدرے بے ڈول سے استوانہ میناروں اور عثمانی ترکوں کے محبوب پنسل نما طرز کے میناروں کو اپنے وطنوں کے باہر کہیں بھی حسن قبول حاصل نہیں ہوا۔

جیسے جیسے اسلامی تعمیر کاری آگے بڑھتی گئی مدوّر گھڑ نعلی کمانوں اور نکیلی گھڑ نعلی کمانوں کا

حسن قبول برقرار رہا۔ نیم مدور یا معمولی نکیلی یا دو مرکزوں والی کمان جس کی سطح جست کا خم و سیدھے خطوط میں تبدیل ہو جاتا ہے، زیادہ تر اپنے وطن میں اور باہر کہیں کہیں استعمال ہوتی رہی۔ یہ کمان کسی قدر ہماری ٹیوڈر (Tudor) کمان سے ملتی جلتی ہے۔ کثیر رگی یا کثیر نعلی کمانیں عام ہو گئیں اور خشتی ڈاٹ کے چھتوں اور خشتی ڈاٹوں کی شکل میں سطح کی تزئین کے لیے استعمال کی جانے لگیں۔ گھڑگم میں کئی شاخیں نکالی جانے لگیں یا انھیں دندانہ نما بنایا جانے لگا۔ کھڑکیوں کے موکھوں میں پتھر کا کٹاؤ کام کیا جاتا رہا یا ان میں جالیاں لگائی جاتی رہیں یہ کام یا تو پتھر میں ہوتا یا سنگستر میں۔ ان میں بھدے رنگ کے شیشے لگائے جاتے تھے اور غالباً اس سے پہلے لگائے جاتے تھے جبکہ مغربی ملکوں میں رنگین شیشوں کا رواج ہوا۔ سطح کی زیبائش کے لئے تزئینی کتبے لگائے جاتے تھے جو یا تو سنگستر میں ڈھالے جاتے تھے یا لکڑی کے اندر کندہ ہوتے تھے اور انکے بیچ بیچ میں ہندسی شکلیں دی جاتی تھیں کیونکہ اسلامی دینیات کی رو سے جانداروں کی شکلیں بنانے کی اجازت نہ تھی۔ کندہ کاری میں نمایاں ابھرواں کام مصر کی اسلامی عمارتوں میں کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے حالانکہ ہندوستان میں ایسا کام بہت دکھائی دیتا ہے، نہایت نازک ہندسی سطحی نمونوں کے آزادانہ استعمال سے اس کو مؤثر بنایا جاتا ہے۔ یہ ہندسی نمونے پتھر سنگستر میں کندہ ہونے کی بہ نسبت گودے ہوئے سے ہوتے ہیں۔ اور آگے مشرق میں خاص کر ایران اور ترکستان میں جہاں اینٹ عام تعمیری مسالہ ہے، روغنی ٹائیلوں سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ایک عرصے تک ان ٹائیلوں کے لئے ہندسی اور بے جان چیزوں کی شکلوں کے نمونے ہی زیادہ پسند کئے جاتے رہے پھر زیادہ فطری انداز اختیار کیا گیا اور گل بوٹوں کے بنانے کا رواج ہوا۔ انگریزی زبان میں (Arabesques) (گل بوٹے) کی اصطلاح جو انگلستان میں کم ابھرواں کام کے لئے ملکۂ الزبتھ کے زمانے سے ابتک استعمال ہوتی چلی آرہی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ اس بارے میں ہم کسی نہ کسی طرح قرون وسطیٰ کے عربوں کے ضرور احسان

مند ہیں۔ تزئین کی ایک اور صورت جو قاہرہ میں عام ہے لیکن اور دوسرے مقاموں پر اتنی عام نہیں، ہلکے اور گہرے رنگ کے پتھروں کا چنائی کے افقی دوروں میں یکے بعد دیگرے استعمال کرنا ہے اس رواج کی اصل روما یا بازنطینہ سے منسوب کی جا سکتی ہے جہاں پتھر کی دیواروں میں خشتی جھالر نما چنائی کے دور وقفے وقفے سے استعمال کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ بات ابھی مشتبہ ہی ہے اسی طرح پیسا (Pisa) جنیوا، سینا (Siena) فلارنس اور اطالیہ کے دوسرے شہروں میں سنگ مرمر کی عمارتوں کے دھاری دار رو کار غالباً قاہرہ ہی سے لئے گئے ہیں، کیونکہ قرون وسطیٰ کے دوران میں قاہرہ سے ان شہروں کے گہرے تجارتی تعلقات قائم تھے ایسے ہی اورگنے (Auvergne) کے قصرے پیو (Le Puy) اور ہمارے وطن کے شہر نارتھ ہامپٹن (Northampton) کے سینٹ پیٹر کلیسا میں مختلف رنگوں کے پتھروں کی تعمیر کاری نظر آتی ہے۔　　(جاری)

لہ ان تمام بحثوں کے لئے میری کتاب مصر اور فلسطین میں اسلامی فن تعمیر، کا دسواں باب اسلامی تزئین کاری کی ماہیت ملاحظہ ہو۔

جامعہ عربیہ اعزاز العلوم کے سالانہ اجلاس کا انعقاد

جامعہ عربیہ اعزاز العلوم قصبہ ویٹ ضلع غازی آباد (یوپی) ۱۸ رمئی ۹۸ء کو سالانہ جلسے کا انعقاد کیا گیا تمام ملک کے محدثین اور علماء دین نے شرکت فرمائی خاص طور پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے استاد مولانا عبدالعلیم فاروقی ندوی نے اپنی بصیرت افروز دو گھنٹے کی تقریر میں مخاطب کیا مفتی قاری شوکت علی صاحب مہتمم جامعہ عربیہ اعزاز العلوم نے اعلیٰ نظم کرکے اس کو باغ و بہار بنا دیا خوشی کی بات ہے کہ قبلہ والد حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی جگہ مجھے ہر پروگرام میں شرکت کے لئے دعوت دیتے ہیں، مجھے مدرسے کی ترقیات دیکھ کر خوشی ہوتی ہے قاری شوکت علی صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

وحدتِ ادیان

قسط نمبر۲

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز، کراچی یونیورسٹی، پاکستان

وحدت ادیان کی دعوت ایک مکروہ چال ہے؛

ان مذکورہ بالا اعتقادی اصولوں اور شرعی حقائق کے پیش نظر "وحدت ادیان" کی دعوت اوران ادیان میں قرب پیدا کرنے اور پھرانہیں ایک دین بنانے کی دعوت دراصل ایک فعل خبیث ہے اور دشمنان اسلام کی ایک مکروہ چال ہے اس دعوت وفکر کا مقصد حق وباطل کے امتیاز کو ختم کرکے انہیں خلط سلط کرنا ہے اوراس طرح اسلام جوایک سچّامذہب اوربعثت مصطفیٰ (علیہ السلام) کے بعد سے واحد سچا مذہب اور واحد قابل اتباع وواجب تعظیم مذہب قرار پایا ہے اس کو نقصان پہنچانے کی یہ ایک گہری سازش ہے۔ یہ ایک طرح کی کفر کی مہم ہی نہیں بلکہ اندر ہی اندر اسلام کے خلاف (گوریلا) جنگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس چال سے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ولایزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔(۱۴)

(اور وہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں گے اگراس کی استطاعت پائیں) لڑائی کے معنیٰ لازمی طور پر یہی نہیں کہ دوبدو لڑا جائے اوراسلحہ کا استعمال ہو بلکہ جنگ کے اور بھی بہت سے انداز ہیں دوست بن کراور دوستی کی دعوت دیکر دھوکہ دینا اور دوستی کے لبادے میں دشمنی کرنا اور

(۱۴) سورہ البقرہ ۲۱۷

جڑیں کاٹنا یہ یہود و نصاریٰ کی پرانی عادت رہی ہے۔ اب بھی یہی کیا جارہا ہے کہ "وحدت ادیان" کا خوشنما نعرہ لگا کر دراصل اسلام کو کمزور اور ختم کرنا مقصود ہے۔

اللہ رب العزت نے اہل اسلام کو طاغوت کی ایسی چالوں سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا ودوالو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء (۱۵) وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کا ارتکاب کرو جیسے انھوں نے کفر کیا تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ) اب اس آیت کریمہ کی روشنی میں "وحدت ادیان" کے اس نعرہ اور دعوت پر غور کیجئے کہ کیا ان کی یہی سازش نہیں کہ وہ اہل اسلام کو بھی اپنے ساتھ ملا کر اپنے جیسا کرلیں اور سب کو برابر درجہ حاصل ہو جائے۔ اب اس دعوت کے نتیجہ میں سب مسلمان تو ہوں گے نہیں۔ ہاں البتہ جو انہیں حق پر اور سچے مذہب پر قائم ملنے گا وہ انہی جیسا کافر ہو جائے گا اور یہی ان کی چال ہے۔

اس دعوت کا مقصد شہادتوں کا زیاں اور جہاد کی نفی ہے:

اس دعوت گناہ کا مقصد اسلام اور کفر کے مابین قائم فرق و امتیاز کو ختم کرنا ہے اور معروف و منکر کا فرق مٹانا ہے اس طرح مسلم و کافر کے مابین قائم ایک آڑ اور حد کو ختم کرنا ہے چنانچہ اس کے نتیجہ میں جہاد اور اللہ کے دین حق کی سربلندی کی خاطر پیش کی جانے والی شہادتوں کا خاتمہ مطلوب ہے اور اللہ کی سرزمین میں اللہ کا نام بلند کرنے والوں کو ایک مکروہ حیلہ کے ذریعہ جہاد سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہر دور کے لئے اور قیامت تک کے لئے اہل اسلام کو یہ ہے کہ: قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن

(۱۵) سورہ النساء: ۸۹

یدٍ وھم صاغرون (۱۶) (جنگ کرو ان سے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں سمجھتے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اور دین حق کو قبول نہیں کرتے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں کتاب دی گئی (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں ذلیل وخوار ہو کر) ۔

اب بتائیے بھلا شراب نوش اور خنزیر خور، زانی ولوطی لوگوں کے ساتھ "وحدت ادیان کے کسی معاہدہ یا معاملہ میں شریک ہوا جا سکتا ہے؟ وہ جن کے نزدیک ہم جنس پرستی سمیت ہر وہ کام جائز ہو جسے عوام اور پارلیمنٹ جائز اور حلال قرار دے دیں اگرچہ اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہو ایسے لوگوں کے ساتھ" وحدت ادیان" کی پینگیں بڑھانا سراسر کفر وارتداد ہے ۔ انہیں تو نیچا دکھانے زیردست رکھنے اور ان سے جنگ کرتے رہنے کا حکم ہے نہ کہ ان کی دعوت وحدت ادیان پر لبیک کہنے اور ان سے دوستی گانٹھنے کا ۔ ارشاد باری ایسے مشرکوں کے بارے میں یوں ہے ۔ وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ واعلموا ان اللہ مع المتقین (۱۷) (جنگ کرو تمام مشرکوں سے جیسے وہ جنگ کرتے ہیں تم سب سے اور جان لو کہ اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے)۔

اس دعوت پر لبیک کہنا ارتداد ہے !

" وحدت ادیان" کی دعوت اگر کوئی مسلمان پیش کرے یا اس پر فریب نعرہ کا پروپیگنڈہ اور اس مقصد کے لئے کام کرے تو وہ مرتد شمار ہوگا اور اسلام سے اس کا تعلق ختم متصور ہوگا کیونکہ یہ دعوت اسلام کے بنیادی اعتقادی اصولوں سے متصادم ہے ۔ ایسی دعوت کا داعی گویا اللہ کے ساتھ کفر کرنے کی دعوت دے رہا ہے اور قرآن کی حقانیت کو باطل کر رہا ہے اسی طرح وہ قرآن کے اس حکم کے خلاف کام کر رہا ہے جس میں سابقہ ادیان ومذاہب اور کتب کو منسوخ قرار دیا گیا ۔ چنانچہ یہ ایک قابل مذمت

(۱۶) سورہ التوبہ : ۲۹ (۱۷) سورہ التوبہ : ۳۶

اقدام ہوگا اور ایسا اقدام کرنے والا ادلہ شرعیہ، قرآن وسنت اور اجماع کے بموجب مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

قابل غور امور:

مذکورہ بالا آٹھ ضروری باتوں کی روشنی میں اہل اسلام کو درج ذیل امور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

● کوئی بھی مسلمان جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی ورسول سمجھتا ہو اسے "وحدت ادیان" کی مکروہ دعوت دینا، اس کے لئے کام کرنا اس پر پسندیدگی کا اظہار کرنا اور مسلمانوں میں اس کا پروپیگنڈہ کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح اس دعوت گناہ کی خاطر کسی قسم کی کانفرنسیں منعقد کرنا، سیمینارز اور اجتماعات کرانا یا ان میں شریک ہونا بھی گناہ ہے۔

● کسی مسلمان کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ تورات وانجیل (بائیبل) کی الگ سے طباعت کرے چہ جائے کہ وہ قرآن کریم کے ساتھ ملا کر ان کو چھاپے، شائع کرے اور ایک ہی جلد میں تینوں کو جمع کرکے ان کی طباعت واشاعت کا اہتمام کرے۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو یہ اس کی گمراہی اور دین سے دوری متصور ہوگی کیونکہ کوئی مسلمان حق اور باطل کو یکجا کرنے کی جرأت وجسارت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ان کتابوں کو جمع کرکے اکٹھے شائع کرنا عین حق (قرآن) اور تحریف شدہ ومنسوخ شدہ حق (تورات وانجیل) کو جمع کرنا ہوگا جو کہ ناجائز اور باعث گناہ ہے۔

● کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ مسجد، چرچ اور یہودی ٹمپل اکٹھے بنائے یا بنانے میں شریک ہو کیونکہ ایسا کرنا در اصل دیگر دو مذہب کو سچا جانتے ہوئے ان کی عبادت گاہ بنانے اور تعمیر کرنے میں شریک ہونا ہے۔ یہ ایک مادی فکر اور گمراہ کن اعتقاد ہے کہ

کے سوا نہ کوئی دوسرا دین اصل حالت میں باقی ہے اور نہ سچا ہے بلکہ تمام ادیان و شرائع قرآن کے آجانے کے بعد منسوخ قرار پا چکیں اور اب کسی کو بھی اپنی مرضی کا دین اختیار کرنے کی اجازت نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق سب کو دین اسلام دین مصطفیٰ کو قبول کرنا اور اس کو اختیار کرنا لازم ہے اور جو کوئی اس سے انحراف کرے گا وہ اللہ کا باغی ہوگا کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ ... (کہ جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہے تو یہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا)

اسی طرح چرچوں یا یہودی عبادت گاہوں کو اللہ کا گھر کہنا بھی جائز نہیں کہ ان میں اب اللہ کے حکم کے مطابق عبادات نہیں کی جاتیں بلکہ اپنی خواہش نفس کے مطابق عبادات ہیں۔ کیونکہ اللہ کا آخری حکم تو یہ ہے کہ عبادات قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق کی جائیں اور وہی عبادات معتبر اور عند اللہ مقبول بھی ہوں گی جو اس کے آخری حکم کے مطابق ہوں۔ اس اصول کی روشنی میں دیکھیے کہ چرچ اور ٹیمپل میں ہونے والی عبادات کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور جب وہ عبادات، عبادات نہیں رہیں تو اس کے لئے بنائے جانے اور تعمیر کئے جانے والے عبادت خانے "بیوت اللہ" اللہ کے گھر کہلانے کے مستحق کیوں کر ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اب ان عبادت خانوں میں اللہ کی عبادت نہیں بلکہ کفر ہو رہا ہے سو یہ "بیوت کفر" کفر گاہیں کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے مجموع الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ لیست البیع والکنائس بیوت اللہ (۱۸) یعنی یہودی عبادت خانے اور چرچ اللہ کے گھر نہیں ہیں۔

۱۸۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد ۲۲، ص ۱۶۲

...کی دعوت دی جائے، انکی دعوت پر لبیک نہ کہا جائے:

کافروں کو دعوت اسلام دینا عموماً اور اہل کتاب کو دعوت اسلام دینا خصوصاً از روئے
نصوص قطعیہ صریحہ مسلمانوں پر واجب ہے۔ مگر اس دعوت کا انداز حکیمانہ ہونا ضروری ہے
البتہ دعوت اسلام کے حکیمانہ انداز میں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ اپنے اصول وضوابط
میں سے کسی سے بھی دستبرداری نہیں کی جائے گی بلکہ دعوت دین کا انداز ایسا ہو کہ دوسرے
... سے اور اگر وہ قائل نہ بھی ہو تو کم از کم حجت تمام ہو جائے تاکہ اس
... ثل ہو کہ لیهلك من هلك عن بینة و یحیی من حی عن
... یعنی ہلاک ہو جائے جسے ہلاک ہونا ہے دلیل سے اور زندہ رہے جسے
... رہنا ہے دلیل سے) اللہ رب العزت نے اہل کتاب کو دعوت دین دینے کے بارے
... امع بیان سکھایا ہے فرمایا۔ قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء
... بینکم ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شیئا ولا یتخذ بعضنا
بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون (۲۰)
(کہہ دیجئے! اے کتاب والو آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک
ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں
اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ روگردانی
کریں تو کہہ دیجئے کہ گواہ رہنا ہم تو مسلمان ہیں۔)
اس انداز میں تو اہل کتاب سے بات ہو سکتی ہے مگر ان کی خواہش کے مطابق ان سے
ڈائیلاگ (DIALOG) کرنا اور ان کے حسب خواہش اپنے وقار سے کم تر درجہ میں
اتر کر ان سے بات کرنا اور ان کی ماننا اور اپنے اصولوں سے اعراض کرنا خود کو گمراہی کے گڑھے

۱۹۔ الانفال/۴۲
۲۰۔ سورہ آل عمران آیت/۶۴

تینوں مذہب (اسلام، یہودیت اور عیسائیت) سچے ہیں اور دنیا میں روئے زمین پر آباد لوگ جس مذہب کو چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ کھلی گمراہی ہے۔ کیونکہ اب اسلام کے سوا نہ کوئی دوسرا دین اصل حالت میں باقی ہے اور نہ سچا ہے بلکہ تمام ادیان و شریعتیں قرآن کے آجانے کے بعد منسوخ قرار پا چکیں اور اب کسی کو بھی اپنی مرضی کا دین اختیار کرنے کی اجازت نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق سب کو دین اسلام دین مصطفیٰ کو قبول کرنا اور اس کو اختیار کرنا لازم ہے اور جو کوئی اس سے انحراف کرے گا وہ اللہ کا باغی ہوگا کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ (کہ جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اختیار کرنا چاہے تو یہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا)

اسی طرح چرچوں یا یہودی عبادت گاہوں کو اللہ کا گھر کہنا بھی جائز نہیں کہ ان میں اب اللہ کے حکم کے مطابق عبادات نہیں کی جاتیں بلکہ اپنی خواہش نفس کے مطابق عبادات ہیں۔ کیونکہ اللہ کا آخری حکم تو یہ ہے کہ عبادات قرآن کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق کی جائیں اور وہی عبادات معتبر اور عند اللہ مقبول بھی ہوں گی جو اس کے آخری حکم کے مطابق ہوں۔ اس اصول کی روشنی میں دیکھ لیجئے کہ چرچ اور ٹمپل میں ہونے والی عبادات کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور جب وہ عبادات، عبادات نہیں رہیں تو اس کے لئے بنائے جانے اور تعمیر کئے جانے والے عبادت خانے "بیوت اللہ" اللہ کے گھر کہلانے کے مستحق کیوں کر ہوں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ اب ان عبادت خانوں میں اللہ کی عبادت نہیں بلکہ کفر ہو رہا ہے سو یہ "بیوت کفر" کفر گاہیں کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے مجموع الفتاوی میں لکھا ہے کہ لیست البیع والکنائس بیوت اللہ (۱۸) یعنی یہودی عبادت خانے اور چرچ اللہ کے گھر نہیں ہیں۔

۱۸۔ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، جلد ۲۲، ص ۱۶۲

اہل کتاب کو اسلام کی دعوت دی جائے، انکی دعوت پر لبیک نہ کہا جائے:

کافروں کو دعوت اسلام دینا عموماً اور اہل کتاب کو دعوت اسلام دینا خصوصاً از روئے نصوص قطعیہ صریحہ مسلمانوں پر واجب ہے۔ مگر اس دعوت کا انداز حکیمانہ ہونا ضروری ہے البتہ دعوت اسلام کے حکیمانہ انداز میں اس بات کا خیال ضروری ہے کہ اپنے اصول وضوابط میں سے کسی سے بھی دستبرداری نہیں کی جائے گی بلکہ دعوت دین کا انداز ایسا ہو کہ دوسرے کو دلیل سے قائل کیا جائے اور اگر وہ قائل نہ بھی ہو تو کم از کم حجت تمام ہو جائے تاکہ اس ارشاد باری پر عمل مکمل ہو کہ لیھلک من ھلک عن بینہ و یحی من حی عن بینہ (۱۹) (یعنی ہلاک ہو جائے جسے ہلاک ہونا ہے دلیل سے اور زندہ رہے جسے زندہ رہنا ہے دلیل سے) اللہ رب العزت نے اہل کتاب کو دعوت دین دینے کے بارے میں کس قدر جامع بیان سکھایا ہے فرمایا۔ قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون (۲۰) (کہہ دیجئے! اے کتاب والو آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ گواہ رہنا ہم تو مسلمان ہیں۔)

اس انداز میں تو اہل کتاب سے بات ہو سکتی ہے مگر ان کی خواہش کے مطابق ان سے ڈائیلاگ (DIALOG) کرنا اور ان کے حسب خواہش اپنے وقار سے کم تر درجہ میں اتر کر ان سے بات کرنا اور ان کی ماننا اور اپنے اصولوں سے اعراض کرنا خود کو گمراہی کے گڑھے

۱۹۔ الانفال/۴۲

۲۰۔ سورہ آل عمران آیت/۶۴

میں دھکیلنے کے مترادف ہے اللہ رب العزت نے اس سلسلہ میں کیا عمدہ بات فرمائی ہے۔
ارشاد ہے واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک (۲۱) (ان
سے بچتے رہیئے کہیں وہ آپ کو اس کے کچھ حصہ سے پھیر نہ دیں جو اللہ نے آپ کی طرف
نازل کیا ہے۔)

اس قدر ہوشیار اور خبردار کی جانے والی قوم بھی اگر یہود وہنود کی سازش کا شکار
ہوکر "وحدت ادیان" کے پرفریب نعرہ کا شکار ہو جائے تو اس کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا
جاسکتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ "وحدت ادیان" کے غلاف میں لپٹے ہوئے اس مکروہ فتنہ کا
سد باب کرنے کی خاطر علماء و مبلغین اپنی تمام تر توانیاں صرف کرتے ہوئے یہود و نصاریٰ
کی اس سازش کو ناکام بنا دیں۔

انبیاء علیہم السلام پر بائیبل کے الزامات:

وہ تحریف شدہ تورات وانجیل جسے یہودی عیسائی کتاب مقدس سمجھ کر اب تک سینے سے
لگائے ہوئے ہیں اور "وحدت ادیان" کے لبادے میں جسے قرآن کے مساوی قرار دینے اور
قرآن کے ساتھ شائع کرنے کی سازش ہورہی ہے اس کے چند اقتباسات نقل کرنا فائدہ
سے خالی نہ ہوگا تاکہ اہل اسلام کو صورت حال کی نزاکت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

انبیاء علیہم السلام کے بارے میں اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی کتاب مقدس کیا کہتی
ہے ملاحظہ فرمائیے۔

انجیل (عہد نامہ قدیم) کی کتاب سلاطین کے باب ۱۱ کا آغاز اس طرح ہورہا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

(۲۱) المائدہ/۴۹

میرزا جلال اسیر اصفہانی کے غیر مطبوعہ قطعات

ڈاکٹر وجیہہ الدین، ایم۔ ایس۔ یونیورسٹی بڑودا، گجرات

میرزا جلال اسیر ایران کا عہد صفوی کا ایک اہم اور نازک خیال شاعر ہے اسیر کا شمار سب ہندی کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ ابوطالب کلیم اور صائب تبریزی اسیر کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

میرزای ما جلال الدین بس است   از سخن سنجان طلب گار سخن

(کلیم) (۱)

راستی طبعش استاد من است   کج فہم بر فرق دستار سخن

خوشا کسی کہ چو صائب زصاحبان سخن

تتبع سخن میرزا جلال کند   (صائب) (۲)

اسیر ایران کے سادات خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کے والد میرزا مومن اصفہان کے رہنے والے تھے۔ جلال اسیر کی تاریخ پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن گنج سخن کے مصنف ذبیح اللہ صفا نے جلال اسیر کی تاریخ پیدائش ۱۰۲۹ ہجری لکھی ہے[۳] جو درست معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ جلال اسیر شاہ عباس اول کا داماد تھا اور شاہ عباس اول کا دور سلطنت ۱۰۳۸ــ ۹۸۹ ہجری تھا۔ اسیر مشہد مقدس کا متولی تھا اور شاہ عباس نے اپنی چھوٹی لڑکی ملک النساء کی شادی اسیر سے کی تھی جس کی وفات شاہ عباس کے زمانے میں

ہی ہو گئی تھی۔ (۴)

اسیر میرزا فصیح ہروی کا شاگرد تھا اپنے استاد کا ذکر کرتے ہوئے صائب کو بحیثیت شاعر اپنے سے برتر تسلیم کرتا ہے:

با وجود آنکہ استادم فصیحی بود اسیر(۵)
مصرع صائب تواند یک کتاب من شود

تمام تذکرہ نگار جلال اسیر کو نازک خیالی کا نمائندہ شاعر تسلیم کرتے ہیں جلال اسیر کے ہم عصر شعراء میں ابوطالب کلیم، طالب آملی، نظیری نیشاپوری، صائب تبریزی، حکیم شرف الدین، شفائی، والہ ہروی، فصیح ہروی اور ملا محسن فیض کاشانی شامل تھے، ذلالی خوانساری جو شاہ عباس اول کا ملک الشعراء تھا جلال اسیر کا شاگرد تھا۔ (۶)

ایک عام خیال یہ ہے کہ جلال اسیر کی وفات ۴۰ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ اسیر کی کلیات کافی ضخیم ہے اس سے اس کی پُرگوئی اور قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ کلیات میں قصائد، قطعات، مثنویات، غزلیات، مخمسات اور رباعیات شامل ہیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق جلال اسیر نے نثر میں کچھ نہیں لکھا تھا۔

کلیات جلال اسیر ۱۲۹۷ ہجری میں منشی نولکشور نے چھاپی تھی جو نامکمل ہے اس کے بعد ہندوستان، پاکستان یا ایران میں اسکی کلیات یا دیوان آج تک راقم کی اطلاع کے مطابق چھپا نہیں ہے۔ تذکرہ کے مطابق گو جلال اسیر ہندوستان کبھی نہیں آیا لیکن ہندوستان کی ہر بڑی لائبریری میں اس کی کلیات یا دیوان کے نسخے موجود ہیں جس سے اس کی ہندوستان میں شہرت اور مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ملا فیروز لائبریری بمبئی، آصفیہ لائبریری حیدرآباد، عربک پرشین انسٹی ٹیوٹ ٹونک۔ راجستھان، ہندوستان کے علاوہ برٹش میوزیم، انڈیا آفس لائبریری، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری وغیرہ۔

راقم کے پاس بھی کلیات جلال اسیر کا ایک خطی نسخہ موجود ہے اس نسخہ میں کاتب کا نام درج نہیں ہے اس پر مختلف مہریں ہیں جو ناخواندہ ہیں لیکن اسی صفحہ پر مہر کے ساتھ سن ۱۱۲۹ ہجری لکھا ہے اور نسخہ کے آخر میں کاتب نے نسخہ کی کتابت مکمل ہونے پر ذیل عبارت درج کی ہے

"تمت تمام شد بعون اللہ تعالیٰ دیوان مرزا جلال اسیر بتاریخ غرہ شہر ذی القعدہ ۲۰"

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کی کتابت غالباً ذی قعدہ ۱۱۲۰ ہجری میں مکمل ہوئی ہوگی اس نسخہ میں کل تین سو صفحات ہیں۔ کلام کی تعداد اس طرح ہے۔

قصائد	۵۲	
قطعات	۱۴	
مثنویات	۳	
غزلیات	۱۵۴۲	(مکمل و غیر مکمل)
مخمسات	۱۷	
اور رباعیات	۹۲	

نولکشور کے مطبوعہ نسخہ اور ذاتی نسخہ کا جب مقابلہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ کافی تعداد غزلیات اور رباعیات اور قطعات کی ایسی ہے جو نولکشور کے مطبوعہ کے نسخہ میں شامل نہیں ہے ذیل میں جلال اسیر کے آٹھ غیر مطبوعہ قطعات درج کئے جاتے ہیں۔

قطعات

خاک راہ تو نوبہار چمن　　نقش پای تو یادگار چمن
ای خیالت گل ہمیشہ بہار　　تا خزاں از تو میگسار چمن
چہ قدر بوی گل گلاب کند　　گر شوی بے خبر دوچار چمن
کہ بہ بیند چنیں عرقناکت　　شبنم گل شود غبار چمن

درکمین گاہ زخم کاری سا تیغ برکف نشستہ غارِ چمن
چہ می است اینکہ میدہد ساقی درچمن میکشم خمارِ چمن

دختر از بباغ می آید

توبہ ہا بے دماغ می آید

صبح عید (از) کرشمہای می است مژدہ ساغر کشان ہوای می است
سایہ برگ برگ گل شاداب چیدہ ہر گوشہ شیشہای می است
سایۂ بید خضر ستان است عیش جاوید خونبہای می است
بادہ از داغ لالہ نوش کنید دست پیمانہ در حنائی می است
کہ برافراخت قد کہ در گلشن قسم گل بخاک پائی می است

آفت عقل و ہوش ما ساقی
نگہ کرم آشنا ساقی

شدہ ام غرقِ بحرِ نیلِ گناہ مو بمویم چو خامہ نامہ سیاہ
گر کشد بارِ کشتِ معصیتم کوہ خم گردد از گرانی کاہ
گردہ عالمی شود پامال گر بمحشر کشم سپاہِ گناہ
نفسی ما کشیدہ ام از دل دیو در شیشہ کردہ ام صید آہ
آہ ازین کردہ ہای توبہ گداز دادہ زین گفتہای خجلت کاہ
عضو عضوم ز روی ہم خجل اند دست و دل جسم و جان چشم (و) نگاہ
میکند کفر ننگ ازین اسلام وای من لا الہ الا اللہ
چکنم با چنیں تبہ کاری گر نیارم بدرگہ تو پناہ

ہمہ رحمی ز غم خلاصم کن
ہمہ لطفِ غلامِ خاصم کن

... د تو کعبۂ جہان باد — جان بہیاد تو عید قربان باد
... دلست دردلم کہ میرس — مو بمویم شہید مژگان باد
... سر میکنم بیاد رخت — شبنم گل شریک طوفان باد
لالہ وگل چہ میکند عاشق — بی تو گلزار در بیابان باد
سنبلی برمزارم افشانند — خواب آسودگی پریشان باد
رفتم از خویشتن بیاد رخی — عالم بیخودی گلستان باد
خار در دل شکستہ خاطر من — مدح پیرای شاہ مردان باد

قبلۂ آسمان ولی اللہ — مدح پیرای
فارس لامکان ولی اللہ

در ثنای علی عمرانی — مور لفظم کند سلیمانی
میکند ہمچو گل درین گلشن — جبرائیل سخن پر افشانی
کام بخشی کہ از زلال کفش — کشتی خاک گشتہ طوفانی
شہریاری کہ از بہار دلش — برگ سبزیست ابر نیسانی
میکند ذوالفقار خونریزش — گردن شرک را گریبانی
غضبش موج بحر قہاری — کرمش لطف عام یزدانی
بارگاہ تو کعبۂ اول — آستان تو قبلۂ ثانی
چہ سراید کسی کہ در چمنت — عندلیب است وحی ربانی
ہر چہ میخواہی از تو می آید — از خداوند از خدا دانی

ای وکیل خدا ہمینت بس
دست قدرت در آستینت بس

میکنم مدحِ حیدرِ کرار نفسم دام آفتاب شکار
ابر نیسان شدم چہ کم دارم صفحہ گلزار و خامہ گوہربار
عالم آئینہ دار عرفانش میتوان دید از در و دیوار
دو جہان مطلعی است در ثنانش از گل و خار میچکد اقرار
بعد مردن نمیکنم خاموش از ثنایش زبان شمع مزار
گر رود خاک تربتم برباد مدحش انشا کنم بخط غبار
میکنم پُرگل از ثنای علی دامن سبزہ تا بجیب بہار
چہ بگویم نمی توان گفتن چکنم نیست طاقتِ گفتار

رحمت حق کلید احسانش
پایہ عرشش چوب دربانش

ای ثنایت کلید باغ بہشت پرگل از مدحتت دماغ بہشت
گر نباشد فروغ عرفانت کی دہد روشنی چراغ بہشت
تا نباشد غبار یکرانت کہ دہد خضر را سراغ بہشت
دردلم حسرت زمین بوست کنج زندان و سیر باغ بہشت

ای رضای دلت رضای خدای
مدعای تو مدعای خدای

مدحتش کردہ ام بہار سخن میزنم دادِ اعتبار سخن
خامہ ام جای نقط می ریزد گل خورشید درکنار سخن
بسکہ شوق ثناگری دارد می چکد مستی از خمار سخن
گوش روحانیان برقص آمد زین گرانمایہ گوار سخن

خجلتم سوخت داورا مددی گرچہ جان میکنم نثار سخن
بسکہ زہر خجالتم نوشید تلخ گردید روزگار سخن
بی زبان گشتہ ام زبانم بخش (۷)
نسخۂ عمر جاودانم بخش

جلال اسیر کی مطبوعہ کلیات میں نو قطعات ہیں۔ ذاتی مخطوطہ میں کل چودہ قطعات ہیں جن میں سے آٹھ غیر مطبوعہ ہیں۔

ان دنوں کلیات میں تمام قطعات میں سے ایک قطعہ استادیعنی نصیح ہروی کی تعریف میں لکھا ہے۔ تین قطعات شاہ صفی کی تعریف اور اسکی فتح وغیرہ کے سلسلہ میں ہیں ان قطعات میں تاریخ بھی کہی ہے۔ چوتھا قطعہ بھی غالباً شاہ صفی کے لئے ہے کیونکہ اس میں بادشاہِ وقت کا نام نہیں ہے اس لئے صرف اندازہ سے ہی کام لیا جا سکتا ہے اس میں شاہ وقت کو نصیحت اور مدد کی درخواست ہے۔ دو قطعات بہاریہ ہیں اور ایک قطعہ حمد باری تعالیٰ میں ہے باقی قطعات میں تین قطعات حضرت علی کی مدح میں دو قطعات شاہ خراسان کی مدح میں، ہیں باقی ماندہ قطعات روزمرہ کی زندگی سے مطلق ہیں۔ تین قطعات مطبوعہ نسخہ میں ایسے ہیں جو ذاتی خطی نسخہ میں نہیں ہیں۔

جلال اسیر نے قطعات سادہ اور آسان زبان میں لکھے ہیں خاص طور سے وہ قطعات جو حمد باری تعالیٰ اور ائمہ حضرات کی تعریف میں ہیں۔ اوپر دیئے ہوئے قطعہ میں جو اس نے حمد باری تعالیٰ میں لکھا ہے جلال اسیر کو اپنے گناہوں کی زیادتی کا کس قدر احساس ہے اور ان گناہوں کی معافی کا طلب گار بھی ہے۔ کتنے آسان اور سادہ انداز میں لکھا ہے اور اسی طرح جب ائمہ حضرات کی مدح کرتا ہے تو ان کی بزرگی اور برتری کے احساس کے ساتھ ان کی مدح میں گم ہو جاتا ہے جس سے اس کے جذبات و احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کلیات جلال اسیر کا تنقیدی مطالعہ کرا جائے اور اسکو تدوین کر کے شائع کیا جائے۔

منابع

(۱) مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامی، ماثر الکرام (سرو آزاد) بتصحیح، عبداللہ خاں (فصل دوم) لاہور، ۱۹۱۳ء صفحہ ۵۳

(۲) ایضاً۔

(۳) جلد سوم، تہران، ۱۳۴۰ شمسی، صفحہ ۱۰۲

(۴) نصر اللہ فلسفی، زندگانی شاہ عباس اول، جلد دوم، تہران ۱۳۴۷ شمسی، صفحہ ۲۰۲۔

(۵) کلیات میرزا جلال اسیر، منشی نولکشور پریس، لکھنو ۱۲۹۷ ہجری، صفحہ ۲۸۷-۲۸۸۔

(۶) امیر شیر علی خاں لودھی، تذکرہ مراۃ الخیال، ۱۳۲۴ ہجری، بمبئی، صفحہ ۷۷

(۷) کلیات میرزا جلال اسیر، نسخہ خطی، ذاتی۔

—— (بقیہ: وحدتِ ادیان) ——

"اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ بہت سی اجنبی عورتوں سے یعنی موآبی، عمونی، ادومی، صیدانی اور حتی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ سلیمان انہیں کے عشق کا دم بھرنے لگا" (۲۲) —— گویا انجیل محرفہ کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام اولوالعزم پیغمبر مبتلائے عشق زناں ہوا (معاذ اللہ) اس سے بڑا الزام کسی پیغمبر پر کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اہل کتاب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض انبیاء پر اعلانیہ زنا کی تہمت بھی عائد کی۔ حضرت لوط علیہ السلام پر تہمت زنا ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے۔ (نقل کفر کفر نہ باشد) (جاری)

تبصرہ

نام کتاب : "منع الصالحات عن حضور الجماعات

مؤلفہ : شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری دامت برکاتہم

قیمت : مندرج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ : جامعہ عربیہ نور الاسلام، شاہ پیر گیٹ میرٹھ شہر (یوپی)

مذکورہ بالا کتاب، ملتِ اسلامیہ کے لئے دینی جذبہ سے ایک اہم دینی موضوع پر شائع کی گئی ہے۔

مساجد میں عورتوں کا جانا درست ہے یا نہیں؟ یہ ایک اہم مسئلہ آجکل ملتِ اسلامیہ میں بہت زور پکڑے ہوئے تھا اس مسئلہ کی اہمیت و نزاکت کا خیال کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کے ایک درد مند عالم دین حضرت مولانا حکیم محمد اسلام صاحب انصاری مہتمم جامعہ عربیہ نور الاسلام شاہ پیر گیٹ میرٹھ شہر نے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ٹھوس و مدلل دلائل پیش کئے ہیں جس سے عام مسلمان کی بھی سمجھ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ "مسجدیں خانۂ خدا ہیں اور یہ صرف عبادت کے لئے ہیں۔ بندۂ خدا، خدا کی بندگی میں فنا فی اللہ ہے ایسے میں کوئی صنفِ نازک اپنے حسن و جمال و آرائش کے ساتھ مسجد میں داخل ہوتی ہے اور عبادتِ الٰہی میں مستغرق بندہ کی نظر اس کے حسن و جمال پر اتفاق سے پڑ جائے تو عبادتِ الٰہی میں خلل واقع ہونا قدرتی بات ہے اور یہ ہی بات خواتین کے خانۂ خدا میں داخلہ میں مانع ہے۔

یہ اہم مسئلہ کی بات، عام مسلمانوں کی فہم و سمجھ میں لانے کے لئے کتاب منع الصالحاتِ عن حضور الجماعات شائع کی گئی ہے جو اس مسئلہ کے حل کے لئے تیر بہدف ثابت ہوگی۔

عامۃ المسلین سے ہر طرح کا افتراق و انتشار مٹا دینا ہی فاضل مؤلف کا نیک اور اصل مقصد ہے اس لئے انہوں نے مسئلہ مذکورہ پر عالم اسلام کے باالاتفاق ثقہ عالم و مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پرانی و مشہور تالیف صلوٰۃ الصالحات بھی اپنی اسی کتاب میں من و عن شائع کر کے اس میں مزید جان ڈالدی ہے جس سے سونے پہ سہاگہ کا کام ہوگا۔ اس سے عام قاری کو کتاب مذکورہ کے مطالعہ میں دلچسپی ورغبت بھی پیدا ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ "منع الصالحات عن حضور الجماعات" جیسی اہم وضروری کتاب تالیف شائع کر کے ملتِ اسلامیہ کی بڑی ہی قابل قدر اور لائق تحسین خدمت انجام دی گئی ہے جسکے لئے کتاب کے مؤلف شیخ طریقت عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اسلام انصاری دامت برکاتہم خلیفۂ اجل حضرت حکیم الاسلام و مہتمم جامعہ عربیہ نور الاسلام شاہ پیر گیٹ میرٹھ شہر (یوپی) تمام عالم اسلام کیطرف سے شکریہ و مبارکباد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ اللہ ربّ العزت کتاب منع الصالحات عن حضور الجماعات شائع کرنیکے دینی جذبہ کو قبولیت کا شرف بخشے۔ مسلمانوں کے لئے حصولِ معلومات وواقفیت اور موجب اجر و ثواب ہے اس کتاب کی خریداری۔ بہشتی زیور اور تعلیم الاسلام کی طرح خدا کرے اس کتاب کی عام مسلمانوں میں اس قدر شہرت ہو کہ یہ کتاب منع الصالحات عن حضور الجماعات ہر مسلمان گھر کی زینت بن جائے۔ (ادارہ)

آفرین! اسلامیہ جمہوریہ ایران

۱۹۷۹ء میں ایران میں حضرت امام آیت اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا اور آج تمام دنیا میں ایران کے اندرونی اسلامی خوشگوار حالات نے تمام دنیا کے لوگوں کے دلوں میں اسلامی انقلاب اور اسلامی تعلیمات کے لئے اچھے خیالات پیدا کر دیئے ہیں۔ ہندوستان کے علماء کرام کے ایران سے قدیم تاریخی لسانی علمی دینی رشتے قائم ہیں۔ ہندوستان کے علماء اسلام خصوصاً دیوبند کے اکابرین نے ہمیشہ ہی ایران کے حالات سے دلچسپی لی ہے اور ایران کا سفر کر کے ایران کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا ہے۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کے بانی اور عالم اسلام کی عظیم و مقتدر ہستی قبلہ ابا جان مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے ایران میں اسلامی انقلاب کی آمد کے فوراً بعد خصوصی دعوت پر حضرت امام خمینی سے خاص ملاقات کر کے انہیں مبارک باد دی تھی۔ جسے امام خمینیؒ نے بڑی ہی لگن دلچسپی اور شکریہ کے الفاظوں کے ساتھ قبول کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے وصال کے بعد احقر صاحبزادہ اور ندوۃ المصنفین کے ڈائریکٹر رسالہ "برہان" کے مدیر مفتی عمید الرحمٰن عثمانی کا رابطہ و تعلق ایرانی کلچر ہاؤس سے برابر ہے۔ نئی دہلی میں قائم ایران کلچر ہاؤس بڑی لگن دیانتداری اور خلوص کے ساتھ ہند و ایران تعلقات کو مستحکم بنائے ہوئے ہے۔ فارسی زبان کو ہندوستان کے نوجوانوں تک پہونچانے میں اسکی محنت قابل داد ہے۔

نئی دہلی میں اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر محترم عزت مآب جناب محمود موسوی نے جس طرح

ہوا ہے وہ

ان کی مساعی جمیلہ ... ہندوستانی عوام علمائے کرام دانش منداں
حضرات کی طرف سے شکریہ و مبارکباد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ ہند و ایران خوشگوار تعلقات
زندہ باد۔ ہندوستانی عوام اور جمہوریہ اسلامی ایران کے عوام پائندہ باد۔

فارسی اساتذہ کی بازآموزی پروگرام کا اختتامیہ اجلاس

مورخہ ۲۱ جون ۱۹۹۸ء ہمدرد یونیورسٹی کنونشن سینٹر میں کل ہند فارسی اساتذہ کی بازآ... پر مشتمل پندرہ روزہ پروگرام کا اختتامیہ اجلاس منعقد ہوا جس میں اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالوحید خاں نے بہ حیثیت مہمان خصوصی اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کی ... محترمہ کپیلا ونتسیاین نے صدر جلسہ کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ ان کے علاوہ نئی دہلی میں مقیم اسلامی جمہوری ایران کے سفیر عزت مآب جناب محمود موسوی اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی و ہمدرد یونیورسٹی کے اعزازی چانسلر جناب عبدالحمید نے اپنی موجودگی سے اختتامیہ اجلاس کی رونق میں اضافہ کردیا۔

اختتامیہ اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے قائم مقام کلچرل کاؤنسلر جناب ڈاکٹر محمد رضا باقری نے اپنی مختصر تقریر میں حکیم عبدالحمید صاحب آل انڈیا انجمن فارسی اساتذہ اور ایران سے تشریف لائے ہوئے مہمان اساتذہ کا شکریہ ادا کیا جنکے تعاون کی وجہ سے یہ بازآموزی پروگرام کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس پروگرام کے دوران پڑھائے گئے درسی پروگرام اور اوقات کلاس پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔

اس کے بعد آل انڈیا فارسی اساتذہ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی نے حاضرین مجلس سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فارسی زبان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ درحقیقت فارسی زبان وادب کی تقریباً ہزار سالہ تاریخ کے

دستاویزی مدارک موجود ہیں جن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان نے انسانی قدر و [illegible] تربیت میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر اظہر دہلوی نے کہا کہ دنیا کے تمام [illegible] ان اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ وقت کی رفتار کے ساتھ زبان وادب میں [illegible] ہے اور اس بازآموزی پروگرام کا مقصد ہندوستانی فارسی اساتذہ کو فارسی [illegible] میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھنا ہے۔

[illegible] اظہر دہلوی کی تقریر کے بعد اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر محترم عزت مآب جناب [illegible] نے ایک مختصر مگر جامع اور غور طلب تقریر فرمائی۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ [illegible] زبان کو سیاسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور زبان مثبت اور منفی دونوں [illegible] کردار ادا کر سکتی ہے۔ فارسی زبان برصغیر ہند میں تقریباً ۸۰۰ سال سے زیادہ عرصہ پر مشتمل درخشاں تاریخ کی حامل ہے لہٰذا اس زبان کے ماہرین کو چاہیئے کہ وہ اس بات کا تحقیقی مطالعہ کریں کہ فارسی زبان نے اس طویل مدت کے دوران مثبت کردار ادا کیا ہے یا منفی کردار کی حامل رہی ہے۔

سفیر محترم کی تقریر کے بعد اختتامیہ اجلاس کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر عبدالوحید نے تقریر فرمائی۔ انہوں نے فارسی زبان کی شیرینی و دلکشی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر مسرت ظاہر کی کہ ہندوستانی فارسی اساتذہ کو زبان وادب کے نئے رجحانات سے روشناس کرانے کے لئے اس قسم کے ثقافتی پروگرام کا انعقاد ہر سال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ زبان وادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی آگاہی کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جانی چاہیئے کہ نئے وسائل تربیت کو بھی بروئے کار لایا جائے کہ پروگرام اور زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔

پروگرام کے آخری حصہ میں محترمہ کپیلا وتسیاین نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا انہوں

اسلامی جمہوریہ ایران اور ہندوستان کے درمیان رابطہ و تعلق خوشگوار بنایا ہوا ہے وہ ان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اس کے لئے ہندوستانی عوام علمار کرام دانش منداں حضرات کی طرف سے شکریہ و مبارکباد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ ہند و ایران خوشگوار تعلقات زندہ باد۔ ہندوستانی عوام اور جمہوریہ اسلامی ایران کے عوام پائندہ باد۔

فارسی اساتذہ کی بازآموزی پروگرام کا اختتامیہ اجلاس

مورخہ ۲۱ر جون ۱۹۹۸ء ہمدرد یونیورسٹی کنونشن سینٹر میں کل ہند فارسی اساتذہ کی بازآموزی پر مشتمل پندرہ روزہ پروگرام کا اختتامیہ اجلاس منعقد ہوا جس میں اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالوحید خاں نے بحیثیت مہمان خصوصی اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کی صدر محترمہ کپیلا وتسیاین نے صدر جلسہ کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ ان کے علاوہ نئی دہلی میں مقیم اسلامی جمہوری ایران کے سفیر عزت مآب جناب محمود موسوی اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی و ہمدرد یونیورسٹی کے اعزازی چانسلر جناب عبدالحمید نے اپنی موجودگی سے اختتامیہ اجلاس کی رونق میں اضافہ کر دیا۔

اختتامیہ اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے قائم مقام کلچرل کاؤنسلر جناب ڈاکٹر محمد رضا باقری نے اپنی مختصر تقریر میں حکیم عبدالحمید صاحب آل انڈیا انجمن فارسی اساتذہ اور ایران سے تشریف لائے ہوئے مہمان اساتذہ کا شکریہ ادا کیا جنکے تعاون کی وجہ سے یہ بازآموزی پروگرام کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس پروگرام کے دوران پڑھائے گئے درسی پروگرام اور اوقات کلاس پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی۔

اس کے بعد آل انڈیا فارسی اساتذہ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی نے حاضرین مجلس سے خطاب کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فارسی زبان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ درحقیقت فارسی زبان و ادب کی تقریباً ہزار سالہ تاریخ کے

دستاویزی مدارک موجود ہیں جن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان نے انسانی قدروں کو فروغ دینے میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر اظہر دہلوی نے کہا کہ دنیا کے تمام ماہرین زبان اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ وقت کی رفتار کے ساتھ زبان وادب میں تبدیلی یقینی ہے اور اس بازآموزی پروگرام کا مقصد ہندوستانی فارسی اساتذہ کو فارسی زبان وادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھنا ہے۔

پروفیسر اظہر دہلوی کی تقریر کے بعد اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر محترم عزت مآب جناب محمود موسوی نے ایک مختصر مگر جامع اور غور طلب تقریر فرمائی۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ زبان کو سیاسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور زبان مثبت اور منفی دونوں طرح کے کردار ادا کر سکتی ہے۔ فارسی زبان برصغیر ہند میں تقریباً ۸۰۰ سال سے زیادہ عرصہ پر مشتمل درخشاں تاریخ کی حامل ہے لہذا اس زبان کے ماہرین کو چاہیئے کہ وہ اس بات کا تحقیقی مطالعہ کریں کہ فارسی زبان نے اس طویل مدت کے دوران مثبت کردار ادا کیا ہے یا منفی کردار کی حامل رہی ہے۔

سفیر محترم کی تقریر کے بعد اختتامیہ اجلاس کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر عبدالوحید نے تقریر فرمائی۔ انہوں نے فارسی زبان کی شیرینی و دلکشی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر مسرت ظاہر کی کہ ہندوستانی فارسی اساتذہ کو زبان وادب کے نئے رجحانات سے روشناس کرانے کے لئے اس قسم کے ثقافتی پروگرام کا انعقاد ہر سال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ زبان وادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی آگاہی کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جانی چاہیئے کہ نئے وسائل تربیت کو بھی بروئے کار لایا جائے کہ پروگرام اور زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔

پروگرام کے آخری حصہ میں محترمہ کپیلا وتسایین نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا انہوں

اسلامی جمہوریہ ایران اور ہندوستان کے درمیان رابطہ و تعلق خوشگوار بنایا ہوا ہے وہ ان کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اس کے لئے ہندوستانی عوام علماء کرام دانش مندان حضرات کی طرف سے شکریہ و مبارکباد کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ ہندو ایران خوشگوار تعلقات زندہ باد۔ ہندوستانی عوام اور جمہوریہ اسلامی ایران کے عوام پائندہ باد۔

فارسی اساتذہ کی بازآموزی پروگرام کا اختتامیہ اجلاس

مورخہ ۱۲ جون ۱۹۹۸ء ہمدرد یونیورسٹی کنونشن سینٹر میں کل ہند فارسی اساتذہ کی بازآموزی پر مشتمل پندرہ روزہ پروگرام کا اختتامیہ اجلاس منعقد ہوا جس میں اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالوحید خاں نے بہ حیثیت مہمان خصوصی اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کی صدر محترمہ کپیلا وتسیاین نے صدر جلسہ کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ ان کے علاوہ نئی دہلی میں مقیم اسلامی جمہوری ایران کے سفیر عزت مآب جناب محمود موسوی اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی و ہمدرد یونیورسٹی کے اعزازی چانسلر جناب عبدالحمید نے اپنی موجودگی سے اختتامیہ اجلاس کی رونق میں اضافہ کردیا۔

اختتامیہ اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے قائم مقام کلچرل کاؤنسلر جناب ڈاکٹر محمد رضا باقری نے اپنی مختصر تقریر میں حکیم عبدالحمید صاحب آل انڈیا انجمن فارسی اساتذہ اور ایران سے تشریف لائے ہوئے مہمان اساتذہ کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون کی وجہ سے یہ بازآموزی پروگرام کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس پروگرام کے دوران پڑھائے گئے درسی پروگرام اور اوقات کلاس پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ بھی پیش کی اس کے بعد آل انڈیا فارسی اساتذہ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی نے حاضرین مجلس سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فارسی زبان کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ درحقیقت فارسی زبان وادب کی تقریباً ہزار سالہ تاریخ کے

دستاویزی مدارک موجود ہیں جن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان نے انسانی قدروں کو فروغ دینے میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر اظہر دہلوی نے کہا کہ دنیا کے تمام ماہرین زبان اس بات سے پوری طرح متفق ہیں کہ وقت کی رفتار کے ساتھ زبان وادب میں تبدیلی یقینی ہے اور اس بازآموزی پروگرام کا مقصد ہندوستانی فارسی اساتذہ کو فارسی زبان وادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھنا ہے۔

پروفیسر اظہر دہلوی کی تقریر کے بعد اسلامی جمہوریہ ایران کے سفیر محترم عزت مآب جناب محمود موسوی نے ایک مختصر مگر جامع اور غور طلب تقریر فرمائی۔ انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ زبان کو سیاسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور زبان مثبت اور منفی دونوں طرح کے کردار ادا کر سکتی ہے۔ فارسی زبان برصغیر ہند میں تقریباً ۸۰۰ سال سے زیادہ عرصہ پر مشتمل درخشاں تاریخ کی حامل ہے لہٰذا اس زبان کے ماہرین کو چاہیئے کہ وہ اس بات کا تحقیقی مطالعہ کریں کہ فارسی زبان نے اس طویل مدت کے دوران مثبت کردار ادا کیا ہے یا منفی کردار کی حامل رہی ہے۔

سفیر محترم کی تقریر کے بعد اختتامیہ اجلاس کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر عبدالوحید نے تقریر فرمائی۔ انہوں نے فارسی زبان کی شیرینی و دلکشی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر مسرت ظاہر کی کہ ہندوستانی فارسی اساتذہ کو زبان وادب کے نئے رجحانات سے روشناس کرانے کے لئے اس قسم کے ثقافتی پروگرام کا انعقاد ہر سال کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ زبان وادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی آگاہی کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کوشش کی جانی چاہیئے کہ نئے وسائل تربیت کو بھی بروئے کار لایا جائے کہ پروگرام اور زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔

پروگرام کے آخری حصہ میں محترمہ کیبلا وتسایین نے صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا انہوں

نے فارسی زبان کی دلکشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ میں فارسی زبان سے واقف نہیں ہوں لیکن فارسی ادب سے ہمیشہ متاثر رہی ہوں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں مولانا روم کی عرفانی تعلیمات اور فارسی زبان کے ذریعہ ہندوستان صوفیائے کرام کے پیغام انسانی دوستی کی بھرپور ستائش کی اور فرمایا کہ ہندوستانی علماء و دانشوروں نے فارسی زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ فارسی زبان کے طویل ماضی کی ایک درخشاں تاریخ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے لہذا مستقبل میں جو تعلیمی پروگرام مرتب کئے جائیں اس میں فارسی اور دیگر کلاسیکی زبانوں کو ان کا جائز حق ملنا چاہیئے۔ انہوں نے ملک کے مختلف علاقوں میں محفوظ گرانقدر فارسی سرمایہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تنہا مدراس کی لائبریری میں فارسی کے ۵۵ ہزار مخطوطات موجود ہیں اور اس عظیم ثقافتی میراث کی حفاظت لازمی ہے۔

اختتامیہ اجلاس کے آخری مرحلہ میں باز آموزی پروگرام میں شریک اساتذہ نے اپنے محترم ایرانی اساتذہ کی خدمت میں ہدیہ بھی پیش کیا۔

واضح رہے کہ فارسی زبان و ادب کی باز آموزی کے اس پروگرام میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تقریباً ۷۰ مندوبین نے شرکت فرمائی۔ ایرانی استاد پروفیسر راستگو نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ہندوستانی فارسی اساتذہ، زبان میں اچھی مہارت کے حامل ہیں لہذا آئندہ باز آموزی پروگرام میں فارسی ادب کو خصوصی اہمیت دی جانی چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجلس ادارت اعزازی

سید اقتدار حسین

ڈاکٹر معین الدین بقائی

محمود سعید بلالی

ڈاکٹر جوہر قاضی

برہان

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد ۱۲۳ | اگست ۹۸ء | شمارہ ۸

سلسلہ | شمارے | نمبر ۸

زر تعاون

فی پرچہ: ۶ روپے

سالانہ: ۷۲ روپے

کمپیوٹر کتابت

CREATIVE VISION

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ برہان

4136 - اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ 110006 ☆ فون نمبر 3262815

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۱۵ر اگست کی تاریخ ہر سال آتی ہے اور آتی رہے گی۔ یہ تاریخ ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لئے ہر لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس تاریخ میں ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت دوبارہ قائم ہوئی تھی ایک عرصہ تک ہندوستان انگریز سامراج کی غلامی کے پھندے میں جکڑا ہوا تھا اور اس غلامی کے خلاف ایک طویل جد وجہد عمل میں لائی گئی، ہزاروں ہندوستانی اپنے ملک کی غلامی سے نجات کے لئے انگریز سامراج سے لڑائی لڑتے ہوئے موت سے ہمکنار ہوئے۔ ہندوستان کے نامور علماء کرام نے آزادی کے لئے جنگ کا اعلان کیا ملک کو غلامی سے مکمل طور پر چھٹکارا دلانے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دیں، پھانسی کے تختے پر ہنستے ہوئے جھول گئے ان کی قربانیوں کی بدولت یہ ملک آزاد ہوا۔

۱۵ر اگست کی تاریخ اپنی اسی آزادی ملنے کی یادگار تاریخ ہے۔ جسمیں ہم اپنے ملک کی فلاح و بہبودگی کے لئے نئے نئے پلان بناتے ہیں اپنے ملک کی ترقی کامیابی کے لئے فکر و تدبر تلاش کرتے ہیں اور ہمارے ملک کے حکمراں عوام و خواص کے سامنے ملک و عوام کی خدمت و ترقی کے پروگراموں کا اعلان کرتے ہیں۔ اور ۱۵ر اگست ۹۸ء کی تاریخ مزید اہمیت کی یوں حامل ہوگئی ہے کہ اس تاریخ کو اس جماعت کے رہنما وزیر اعظم ۱۵ر اگست کو لال قلعہ سے ہندوستانی عوام کو خطاب کریں گے جو ملک کی آزادی کے بعد عالم وجود میں آئی تھی اور جس کا پہلا نام جن سنگھ تھا اور دوسرا نام

بھارتیہ جنتا پارٹی ہے۔ اور جس نے اپنے قیام کے روزِ اول سے حزب اختلاف کے فرائض انجام دیئے تھے۔ حکومت پر بحیثیت حزب اختلاف کے ہمیشہ ہی تنقید کرنے میں پیش پیش رہی ہے۔ آج یہ جماعت حزب اختلاف کی کرسی سے چھلانگ لگا کر حکمراں جماعت کی کرسی پر براجمان ہے۔ اس وجہ سے اس بار کی ۱۵ اگست ۱۹۹۸ء کی تاریخ نہ صرف اہم بلکہ دلچسپ بھی ہو گئی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کو مرکز میں قیام کے چار مہینے پورے ہو چکے ہیں۔ اور اب چاروں طرف نظر دوڑا کر ہم ملک کے حالات کا جب جائزہ لیتے ہیں۔ تو ہمیں ہر طرف یاس و ناامیدی ہی دکھائی دیتی ہے۔ مہنگائی اور وہ بھی کمر توڑ مہنگائی نے عوام الناس کا کچومر ہی نکال دیا ہے۔ آٹا دال چاول دودھ دہی سبزی گوشت یہ سب چیزیں زبردست مہنگائی کی وجہ سے عام لوگوں کی پہنچ سے دور بہت دور ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک بار جبکہ جناب اٹل بہاری باجپئی حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھا کرتے تھے اس وقت انھوں نے مہنگائی کا رونا روتے ہوئے کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب لوگ تھیلوں میں بھر بھر کر نوٹ لیجایا کریں گے اور اس کے عوض میں جو بھی سامان خورد و نوش خرید کر لائیں گے وہ چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں لے کر گھر آیا کریں گے۔ ایسا معلوم دیتا ہے کہ وہ وقت (خدا کرے نہ آئے) آنے والا دکھائی دے رہا ہے۔ جہاں عوام مہنگائی کی مار سے بےحال ہیں وہاں پانی اور بجلی کی آئے دن قلت نے بھی انکا جینا دوبھر کر دیا ہے — حکمراں طبقہ اسے صرف اخبارات کی من گھڑت خبریں بتا کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی ان تکالیف سے حکمراں طبقہ اپنے کو ناواقف بنائے ہوئے ہے۔ یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اگر مہنگائی اور پانی و بجلی کی قلت سے وہ حکمراں طبقہ ابھی تک غافل ہے جو خود ایک عرصہ تک حزب اختلاف کے بنچوں سے

حکومت پر اس سلسلے میں نکتہ چینی کرتا رہا ہے تو بڑے ہی تعجب کی بات ہے۔ اور اس سے عوام کی مایوسی میں قدرتی اضافہ ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ٹی وی چینل پر آپ کی عدالت میں دہلی کے چیف منسٹر جناب صاحب سنگھ ورما نے جب یہ بات کہی کہ دہلی میں مہنگائی اور پانی و بجلی کی قلت صرف اخبارات ہی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں تو آپکی عدالت کے جج نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ وہ عوام کے مسائل جاننے اور سمجھنے اور ان کی تکالیف کا جائزہ لینے کے لیے ہر ہفتہ کسی نہ کسی علاقہ میں جاکر بھیس بدل کر گھوما کریں جب ہی انہیں حقیقت حال کا پتہ ہوگا۔ حکمراں طبقہ کے لوگوں کو ہمارا بھی یہی مشورہ ہے کہ وہ اپنے اپنے طور پر خود علاقوں میں اچانک جائیں اور گھومیں اور عوام کے مسائل کا جائزہ لیں اور پھر ان کا تدارک کرنیکی طرف مستعد عمل ہوجائیں۔ یہ ہی ملک کی اور اسکے عوام کی صحیح معنوں میں خدمت ہوگی ملک اور عوام کی خدمت ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔ یہ بات انہیں ہر وقت اور ہر حال میں ذہن نشین کرلینی چاہیئے۔ جب ہی ملک و عوام کو ان سب کٹھن تکالیف و مشکلات اور مہنگائی کی مار سے نجات نصیب ہوگی۔ اسی کے ساتھ عوام کی بھی خود کی ذمہ داری ہے کہ وہ مہنگائی کو کم کرنے میں اپنی ذمہ داری کو بھی فراموش نہ کرے اور ملک میں آئے دن تشدد و خوں ریزی کے واقعات، اغواء کے افسوسناک واقعات کے تدارک کے لیئے بھی عوام کو خود کوشاں ہونے کی ضرورت ہے عوام اپنے کو بھی ذمہ دار سمجھیں اور ملک میں امن و امان کی ہر طرح بحالی اور قتل و غارت گری کے واقعات اور بچوں کو اغواء ہونے سے بچانے کے لیے ملک کے عوام اپنی آئینی ذمہ داریوں سے بھی خبردار رہیں۔ یہ وقت و حالات کی مانگ و ضرورت ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا گروپ کے اخبارات سے یہ جان کر ملت اسلامیہ کو یقیناً خوشی و مسرت

ہوگی کہ اسپین میں پانچ سو سال بعد پھر اسلام کی واپسی ہونی شروع ہوگئی ہے۔ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمز نئی دہلی نے ۲؍ اگست ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع کی ہے جس کا عنوان ہے: "اسپین میں پانچ سو سال بعد پھر اسلام کی واپسی" اس خبر کے تحت اس نے شائع کیا ہے۔

"اسپین میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے ۵۰۰ سال بعد پھر ملک میں اسلام کی واپسی ہورہی ہے۔" ال منڈو" روزنامہ اخبار کے مطابق پچھلے آٹھ سالوں میں یہاں مسلم لوگوں کی آبادی بڑھ کر دوگنی ہوگئی ہے۔ اور تنسو سے زیادہ مسجدیں قائم ہوگئی ہیں ۱۹۹۷ء میں ہی وہاں ۵۲ نئے اسلامی جماعتوں کا رجسٹریشن ہوا ہے۔ اسپین میں سرکاری اندازے کے مطابق مسلم آبادی تین لاکھ ہے لیکن کچھ لوگوں کا اندازہ ہے کہ یہ تعداد پانچ لاکھ ہوسکتی ہے۔ اسپین کے سب ہی ۱۷ علاقوں میں مسجدیں تعمیر ہوچکی ہیں۔ اور ان کی کل تعداد بڑھ کر دو سو ہوگئی ہے۔ افسران کا کہنا ہے کہ قریب سو اسلامی جماعتوں کا سرکاری طور پر رجسٹریشن ہوا ہے۔ لیکن ان کی حقیقی تعداد اس سے دوگنا زیادہ ہے۔ اندلس کا گرینڈا شہر ایک بار پھر اسلام کا مرکز بنتا جارہا ہے۔ یہ وہ ہی شہر ہے جو ۱۴۹۲ء میں مسلم اسپین پر عیسائی حملہ کے دوران سب سے آخر میں ان کے ہاتھوں میں گیا تھا۔ قریب دو ہزار مسلم گھروں والے اس شہر کی گلیوں میں مسلم تہذیب و تمدن کے پھیلاؤ اور اس کی تبلیغ کا نظارہ ہونے لگا ہے گلیوں میں کافی خواتین برقعہ پہنے نظر آتی ہیں اور داڑھی والے لوگ ٹہلتے ملتے ہیں جو مسلموں کی خاص پہچان ہے۔ شہر میں عطر کی دوکانیں ہیں اور فرنیچر کے کارخانے ہیں ان کاروباروں میں زیادہ تر مسلم طبقہ کے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ اسپین میں قریب تین ہزار سے لے کر پانچ ہزار تک لوگوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام مذہب قبول کیا ہے۔"

یہ ایک خوش آئند بات ہے اللہ کرے وہ وقت بھی ہمیں دیکھنا نصیب ہوجائے جب تاریخ اپنے کو دوہراتے ہوئے پورا اسپین مسلم اسپین بن جائے۔

(پانچویں اور آخری قسط)

مغربی فنِ تعمیر پر اسلامی فنِ تعمیر کے اثرات

از : مارٹن ایس برگس

مترجم : جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم۔ اے

اسلامی فنِ تعمیر کے اس جائزے کے دوران جن مختلف نقاط کا ذکر ہوا ان سب کو پیشِ نظر رکھیئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجموعی حیثیت سے مغربی دنیا نے اسلام سے تعمیر کاری میں جو قرض لیا ہے وہ حقیقی اور واقعی ہے صرف فوجی تعمیر کاری ہی کے میدان میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ صلیبی محاربوں نے (جنھوں نے ارضِ مقدس میں بہت سے نفیس کلیسا اور قلعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں) قلعہ بندی کے فن میں بہت سی چیزیں اپنے دشمن مسلمانوں سے سیکھی تھیں اور خود مسلمانوں نے اس سلسلہ میں آرمینی سنگ راجوں کی مہارت سے فائدہ اٹھایا تھا۔

آرمینیا اور شام کی سنگی اور ایران کی خشتی قبل اسلام عمارتوں سے (ایران کی ان قبل اسلام خشتی عمارتوں کے بارے میں اب علمار میں یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے کہ ہم نے قرون وسطیٰ میں لداؤ چھتیں بنانے کا طریقہ ان ہی عمارتوں سے لیا ہے) ہم نے جو کچھ لیا ہے اس قرض کو منہا کر دیا جائے تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ شام اور دوسرے ملکوں کی اسلامی عمارتوں میں جو نکیلی کمان استعمال کی گئی ہے وہ مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ دوہرے انحنا والی نکیلی کمان قریب قریب یقین کی حد تک اور ٹیوڈر کمان ممکن ہے دونوں کا ایک ایسی ہی اصل سے تعلق رکھتی ہیں، کئی نعلوں اور کئی نعل دار یا کثیر برگی کمانو

کا استعمال بھی اسی ذریعہ سے آیا ہے۔ اسی طرح غالباً سطحوں کی تزئینی نمونے اور ممکن ہے دریچوں میں سلاخوں کے ذریعہ تزئین بھی یہیں سے لی گئی ہے۔ گل بوٹوں کے تختے ابتدائی مسجدوں میں پتھر یا سنگتراشی میں بنی ہوئی ہندسی شکلوں کی جالیوں سے لیے گئے ہیں یا یہ ممکن ہے کہ یہ چیز اولیں آگہی کے قبل اسلام زمانے میں شام اور مسوپوٹیمیا (عراق) کی عمارتوں میں استعمال ہو چکی تھی۔ بعض اوقات رنگین شیشوں کی ایجاد کا سہرا مشرق کے سر باندھا جاتا ہے لیکن یہ بات اب تک ثابت نہیں ہوئی ہے، پایوں کے گوشوں میں دیوار سے لگا کر دھرے دینا جیسے گوتھک چھتوں کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آٹھویں یا نویں صدی کی ایک اسلامی ایجاد ہے۔ تزئینی اور رجال دار گھڑ گنبج عراق (مسوپوٹیمیا) سے قاہرہ منتقل ہوئے یہاں سے یہ اطالیہ منتقل ہوئے اور آگے چل کر گوتھک فن تعمیر کی ایک خصوصیت بن گئے۔ بعد کی گوتھک عمارتوں میں منبت کاری میں بنے ہوئے کتبے جو تزئین کے لئے استعمال کئے گئے ہیں نویں صدی کی جامع ابن طولون کی نقل میں بنائے گئے ہیں لیکن فرانس کے جنوبی علاقوں پر مسلمانوں کے اقتدار کے دوران میں کوفی رسم خط میں لکھے ہوئے کتبے فرانس تک پہنچ چکے تھے[1]

---

[1] یعنی ماہر نصرانی منبت کار گاؤفرے ڈس (GAUFREDUS) کے منبت کار چوبی دروازے جولے پوی (LE PUY) کے کلیسا کی ایک چھوٹی سی کان میں لگے ہوئے ہیں اور دوسرا منبت کار دروازہ لاوو دے تشیلیاک (LAVOUTECHILAC) میں لگا ہوا ہے۔ وسٹ منسٹر آبے کے اوپری حصہ میں تزئینی پٹیوں اور بعض ابتدائی رنگین شیشوں کے دریچوں کی اصل کے بارے میں پروفیسر لتھالے (LETHALY) نے اسلامی خیال ظاہر کیا ہے ملاحظہ ہو برلنگٹن میگزین بن میں اے ایچ کرسٹی کا مضمون

The Denelagment of ornament from

Bus Ling Ton Magazine Vals X/+X/i, 1922

اور انگلستان تک میں تزئین کی بعض نادر مثالوں میں عربی اثر کی غمازی ہو رہی ہے دھاری دار روکار تاہرہ سے آئے ہوں گے۔ ایسے ہی نشاۃ ثانیہ کے گھنٹہ گھر۔ اور نشاۃ ثانیہ کی صدف نما محرابیں بھی یہیں سے آئی ہوں گی۔ عربی و مشربیہ، یا چوبی جالیاں جو مکانوں کے زنانے حصے کو چھپانے یا مسجد میں آرٹ کے طور پر استعمال ہوتی تھیں ان کی انگلستان کی دھاتی جالیوں میں نقل کی گئی ہے۔ گل بوٹوں کی ہلکی مینت کاری کے ذریعہ عمارت کی سطحوں کی تزئین یا ماہی پشت جال کے ذریعہ دیواروں کا سجانا اور زینت کے لیے ہندسی شکلوں کا استعمال ان سب چیزوں کے لیے ہم مسلمانوں قوموں کے ممنونِ احسان ہیں یہی تو میں ہمارے علم ہندسہ کا بہت بڑا ماخذ یا ذریعہ رہی ہیں۔

اوپر جو باتیں بیان ہوئیں وہ موٹی موٹی سی باتیں تھیں لیکن صلیبی لڑائیوں کے دوران میں اور زیادہ پرامن طریقہ پر، قرون وسطیٰ کے آخری زمانے میں مشرق اور مغرب کے قریبی ربط نے تعمیر کاری پر اور بھی اثرات ڈالے ہوں گے جن کا اس سرسری جائزے میں ذکر نہ ہو سکا۔ اسپین میں اسلامی تعمیر کاری کی روایات نشاۃِ ثانیہ کے آخری عہد تک برقرار رہیں اور یہی روایتیں اسپین کے گوتھک تعمیر کاری کے بہت سی گتھیوں اور عجیب وغریب چیزوں کا حل پیش کرنے میں مدد دیتی ہیں آخر میں یہ بات بھی دھیان میں رکھی جائے کہ اب بھی بعض دور دراز ملکوں میں اسلامی تعمیر کاری سے کام لیا جا رہا ہے جہاں وہ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ زمانے سے پھلتی پھولتی چلی آرہی ہے۔ ختم شد

تیسری اور آخری قسط

وحدتِ ادیان

ڈاکٹر احمد ساہتاز، کراچی یونیورسٹی (پاکستان)

" اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں، کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں، تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ کب وہ لیٹی اور کب اٹھ گئی۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس کا نام موآب رکھا۔ وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا وہی بنی عمون

۲۲۔ عہد نامہ قدیم، کتاب سلاطین باب ۱۱

کا باپ ہے جو آج تک موجود ہیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) (۲۳)

اس طرح عیسائیوں نے اللہ کے ایک پاک پیغمبر پر تہمت لگانے کی ناپاک جسارت کی اور صرف یہی نہیں انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے پر الزام لگایا کہ اس نے اپنے باپ کی بیوی سے زنا کیا اور باپ نے اسے کچھ نہ کہا۔

انجیل محرف کی کتاب پیدائش باب ۳۵ میں ہے۔

"روبن نے جاکر اپنے باپ کی حرم بلہاہ سے مباشرت کی اور اسرائیل کو یہ معلوم ہو گیا"(۲۴)

حضرت داؤد علیہ السلام پر بھی تہمت زنا لگائی گئی، سفر سموئیل ثانی باب ۱۱ میں ایک قصہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام ظہر کے بعد اپنے بستر سے اٹھے اور شاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اتفاقاً ان کی نگاہ ایک عورت پر پڑی جو غسل کر رہی تھی اور وہ بڑی خوبصورت تھی داؤد نے کسی آدمی کو بھیج کر اس عورت کی نسبت معلوم کرایا تو لوگوں نے بتایا کہ یہ "اوریا" کی بیوی بت سبع ہے۔ پھر داؤد نے آدمیوں کو بھیج کر اس عورت کو پکڑ والیا اور اس کے ساتھ صحبت کی پھر وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور اسے حمل رہ گیا۔"(۲۵)

متذکرہ بالا بیانات عیسائیوں کی مشہور کتاب مقدس، انجیل (محرف) میں موجود ہیں قرآن کریم نے ان تمام الزامات سے ان انبیاء کرام کو بری قرار دیتے ہوئے ان کی شان بیان کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر لگنے والے الزامات بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

۲۳۔ عہد نامہ قدیم، کتاب پیدائش، باب ۱۹، آیت ۳۰

۲۴۔ عہد نامہ قدیم، کتاب پیدائش، باب ۳۵، آیت ۲۲

۲۵۔ عہد نامہ قدیم، سفر سموئیل ثانی باب ۱۱

قرآن اور عصمتِ انبیاء: بعض انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بائبل کے بیانات آپ نے پڑھے اب دیکھئے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السّلام کی عصمت کی گواہی کس طرح دی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنے ان برگزیدہ بندوں پر عائد ہونے والے الزامات کی قلعی کھولنے کے لئے کس قدر عمدہ کلمات میں ان کی شان بیان کی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ ولقد آتینا داؤد فضلاً (۲۶) (اور بے شک ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے بڑا فضل عطا کیا)

"واذکر عبدنا داؤد ذا الاید انہ اواب" (۲۷) (اور یاد کیجئے ہمارے طاقت ور بندے داؤد کو وہ بے شک بہت رجوع کرنے (توبہ کرنے) والا تھا)

"یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" (۲۸) (اے داؤد بے شک ہم نے آپ کو زمین میں اپنا نائب بنایا)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: "ووھبنا لداود سلیمان، نعم العبد انہ اواب" (۲۹) (اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا وہ کیا ہی اچھا بندہ ہے بے شک وہ ہماری طرف بہت رجوع کرنے والا ہے)

حضرت لوط علیہ السّلام کے بارے میں فرمایا: "واتیناہ حکما وعلما ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث انھم کانوا قوم سوء فاسقین و

۲۶۔ سورۃ سبا، آیت / ۱۰

(۲۷) سورۃ ص / ۱۸

۲۸۔ سورۃ ص / ۲۶

۲۹۔ سورۃ ص / ۳۰

ادخلناہ فی رحمتنا انہ من الصالحین (۳۰)

(اور ہم نے لوط کو حکم اور علم عطا کیا اور اس بستی سے ان کو نجات دی جس کے ناپاک کام کرتے تھے بے شک وہ بدترین قوم تھے نافرمانی کرنے والے اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کیا بے شک وہ صالحین میں سے تھے۔

سورۃ الشعراء میں فرمایا؛

کذبت قوم لوط المرسلین اذقال لھم اخوھم لوط الا تتقون انی لکم رسول امین (۳۱) قوم لوط کے لوگوں نے رسولوں کو جھٹلایا جب ان کے ہم قبیلہ لوط نے ان سے کہا کیا تم نہیں ڈرتے ؟ بے شک میں تمہارے لئے امانت والا رسول ہوں۔

سورہ الصافات میں ارشاد ہوا: وان لوطا لمن المرسلین اذ نجیناہ واھلہ اجمعین (۳۲) (بے شک لوط پیغمبروں میں سے ہیں، جب ہم نے انہیں اور ان کے سب گھر والوں کو نجات دی)

حضرت یعقوب علیہ السّلام کے بارے میں ارشاد ہوا۔

واذکر عبادنا ابراھیم واسحق و یعقوب اولی الایدی والابصار انا اخلصناھم بخالصۃ ذکری الدار وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار (۳۳) (اور یاد کیجئے ہمارے بندوں ابراہیم واسحاق اور یعقوب، قوت

۳۰۔ سورۃ الانبیاء/ ۷۴

۳۱۔ سورۃ الشعراء/ ۱۶۰

۳۲ سورۃ الصافات/ ۱۳۳

۳۳۔ سورۃ ص/ ۴۵۰

[illegible] بصیرت والوں کو بے شک ہم نے ان کو برگزیدہ کیا ایک امتیازی [illegible] آخرت کے گھر کی [illegible] کے لیے [illegible] ہماری بارگاہ میں [illegible] پسندیدہ بندوں میں سے ہیں

مندرجہ بالا آیات مبارکات کے مطالعہ کے بعد اہل ایمان خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا ایک ایسی کتاب کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے جس میں انبیاء کی عظمت و شان کی باتیں ہوں اور جس کے منزل من اللہ ہونے میں ذرہ برابر شک بھی نہ ہو یقیناً بائبل اور قرآن کی ایک ہی جلد میں اشاعت کا اہتمام حق و باطل کو یکجا کرنے اور باطل کو حق کا درجہ دینے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو دشمن کی اس نئی چال سے بچنے کی بصیرت نصیب فرمائے۔ (آمین)

گلِ رعنا

(از یوسف [illegible] رعنا [illegible])

[illegible] غیر [illegible] حضرت جوش ملیح آبادی [illegible] جگر مراد آبادی [illegible] وغیرہ نے اپنے اثرات کا اظہار کیا ہے۔

جگر مراد آبادی رعنا صاحب کو ایک فطری شاعر کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

صفحات : ۲۳۲

قیمت مجلد : =/۲۵ روپے

قطعاتِ وفاتِ غالبؔ

عبدالرؤف خاں (ایم۔ اے ہسٹری) اُودئی کلاں (راج)

ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے اپنے کسی مقالے میں تحریر فرمایا تھا کہ "اردو ادب میں کام کرنے والوں کے لئے نئے موضوعات کا فقدان نہیں۔ ایک موضوع غالبؔ کی وفات کے قطعاتِ تاریخ کو یکجا کرنا بھی ہے۔ لیکن جیسا کہ مولانا الطاف حسین حالیؔ (م ۱۹۱۴) نے لکھا ہے کہ "اُن (غالبؔ) کی وفات کی تاریخیں جو مدت تک ہندوستان کے اردو اخباروں میں چھپتی رہیں وہ گنتی اور شمار سے باہر ہیں۔"[1] اس لئے اس موضوع کا کما حقہ' حق وہی اسکالر ادا کرسکتا ہے جو بلند ہمت اور وسائل سے بے نیاز ہو؟ اور جو ملک کے تحقیقی اداروں اور جامعات کے کتب خانوں تک سفر کرسکے ہیں۔ جہاں اُس عہد (۱۸۶۹ کی ۱۵ فروری کے بعد سے کم از کم دسمبر ۱۸۷۰ تک) کے اردو اخبارات کی فائلیں موجود ہیں۔ یہ کام کسی بھی ریسرچ اسکالر کے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوگا۔ راقم دور افتادہ و بے بضاعت کی رسائی بڑے اداروں تک اب ممکن نہیں۔ تاہم میرے ذاتی محدود ذخیرے کی مدد سے وفاتِ غالبؔ کے چند قطعات پیش کررہا ہوں۔ اگر کسی اسکالر کے کام آسکے۔ تو زہے نصیب۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ المعروف بہ میرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں

---

[1] یادگارِ غالب ص ۱۰۰ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

بہادر نظام جنگ شبِ ہشتم ماہِ رجب ۱۲۱۲ ہجری معادل ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے[۲] اپنی ولادت کا قطعۂ سال کسی وقت خود ہی کہا۔

غالب بہ زناسازیِ فرجام نصیب　　ہم بیم عدو دارد و ہم ذوقِ حبیب

تاریخ ولادتِ من از عالمِ قدس　　ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم لفظ "غریب"[۳] ۱۲۱۲ھ

یعنی "شورشِ شوق" اور لفظ "غریب" سے مادے حاصل کئے۔ دوسری تاریخ ولادت اردو میں مزاحیہ طور پر کہی۔ صاحبِ عالم مارہروی صاحب سے غالب کی مراسلت رہتی تھی۔ ایک دفعہ عالم صاحب نے مرزا غالب سے پوچھا کہ آپ کی ولادت کس سنہ میں ہوئی، اور یہ بھی اطلاع دی کہ میری ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتی ہے، جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں۔ مرزا نے جواب میں یہ شعر بھیجا :-

ہاتفِ غیب سن کے یہ جیتا

ان کی تاریخ ہیرا "تاریخا"　　۱۲۱۲ھ

مرزا نے شاعری کی ابتدا ۱۲۱۱ ۱۸۰۷ء میں کی۔ شروع میں اسد تخلص اختیار کیا۔ مگر میر امانی اسد کا درج ذیل شعر سنکر :

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی　　مرے شیر شاباش رحمت خدا کی[۵]

اپنا تخلص (اسد) کر دیا اور تقریباً ۱۸۱۶ء میں غالب تخلص رکھ لیا، پھر بھی کبھی اسد

---

[۲] ایضاً ص ۹ نیز دیوانِ غالب کامل نسخۂ گپتا رضا ص ۱۰۲ مرتبہ کالی داس گپتا رضا ساکار پبلشرز بمبئی ترمیم و اضافہ کے ساتھ ۱۵ فروری ۱۹۹۵ء

[۳] کلیاتِ غالب فارسی ۱: ۲۲۲۔ [۴] دیوانِ غالب نسخۂ رضا ص ۵، بحوالہ مکاتیب الغالب

[۵] سخنِ شعراء ص ۲۱ عبدالغفور نساخ

تخلص بھی روا رکھا۔ ۱۲۷۷ھ میں اپنی وفات کا قطعہ بھی خود ہی لکھا:

من کہ باشم کہ جاوداں باشم | چوں نظیری نہ ماند و طالب مُرد
در بہ پرسند در کدامیں سال | مرد غالب، بگوکہ "غالب مُرد"[۶] ۱۲۷۷ھ

(یعنی کیا ہستی ہے کہ ہمیشہ زندہ رہوں۔ جب بڑے بڑے نامی شاعر نظیری اور طالب باقی نہ رہے۔ اور اگر لوگ پوچھیں کہ غالب کس سال میں مر گیا (تو جواب دو کہ) "غالب مُرد" کے عدد نکال لو۔ یعنی ۱۲۷۷ھ) یہ قطعہ ۱۲۷۷ھ میں لکھا تھا مگر ۱۲۷۷ھ میں وفات نہ ہوئی تو اس بارے میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں، "میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسر شان تھی بعد رفعِ فسادِ ہوا سمجھ لیا جائے گا"۔[۷]

۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء میں کسی نے غالب کے انتقال کی افواہ اڑا دی۔ افواہ سنکر انکے نادیدہ شاگرد محمد حبیب اللہ ذکا حیدر آبادی سے رہا نہیں گیا اور انہوں نے ایک بہترین قطعۂ تاریخ (فارسی) سپردِ قرطاس کیا:

گزشت از جہاں آں جہانِ سخن | کہ می گفتمش عرفی و طالب است
خرد گفت سالش ریاضِ جناں
کراں تا کراں مسکنِ غالب است[۸] ۱۲۸۳ھ

(یعنی وہ جہانِ سخن جب اس جہاں سے گزر گیا، جس کو میں عرفی اور طالب کہتا ہوں۔

---

۶ اردوِ معلیٰ ص ۲۷۰ ناشر رام نرائن لال ارن کمار، الہ آباد ۱۹۹۰ء

۷ غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم ۲/۵۳۰

۸ ماہنامہ آجکل نئی دہلی دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۱۴

(یہ ہے عقل نے اُس کا سالِ وفات کا مادہ) "ریاضِ جناں" بتلایا جو اس کنارے سے اس کنارے تک غالب کا مسکن ہے) قطعہ کا حل ملاحظہ فرمایا جائے۔

یعنی "ریاضِ جناں" کے ایک کنارے (ر) سے دوسرے کنارے (ں) تک "غالب" کا مسکن ہے:- ۲۰۰+۵۰+۱۰۳۳=۱۲۸۳ھ۔ اس نوعیت کا دعائیہ قطعہ تاریخ گوئی کے لٹریچر میں شاید ہی مطالعہ میں آئے۔ اگرچہ اس صنعت میں ستیح ستارہ گردہ (۱۱۱۱ھ) کی بھی ایک تاریخ ملتی ہے، جو ذاکر کے ذہن میں ضرور رہی ہوگی۔ بہرحال یہ افواہ غلط ثابت ہوئی۔

۱۲۸۴ھ میں غالب کی سماعت کمزور ہوگئی تھی۔ سید آل محمد مارہروی نے اس واقعے کی بابت یہ قطعہ کہا:

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ 	بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے

دوستو تاریخ اوس کی غیب سے

یوں سنی میں نے کہ غالب کر ہوئے ۔ ۱۲۸۴ھ (کر بمعنی بہرا ہونا)

مورخ نے "ہوئے" کے (۳۱) عدد شمار کئے ہیں۔ غالب انتقال سے تین ماہ پیشتر مے نوشی سے تائب ہوگئے تھے۔ اس واقعے کی تاریخ خود کہی۔ قطعہ مبسوط ہے لہٰذا صرف تین شعر پیش ہیں:-

ہر شب بقدح ریختے بادۂ گلفام 	آرے ز دو سی سال مرا قاعدہ ایں بود

در غرۂ شعبان چو زمن بادہ گرفتند 	خود غالب پژمردۂ نشانی ز سنیں بود

روشش بدر آرز از مہ شعبان کہ دریں جا

مقصود من از تخرجہ البتہ ہمیں بود ۱۲۸۵ھ

ؔ دیوانِ تواریخ ص ۱۶۴ مطبع نورالانوار آرہ ۱۲۹۹ھ

"غالب پژمردہ" مادہ ہے جس کے عدد ۱۲۹۱ ہوتے ہیں بخشش بد سارز کہتے ہوئے (۶) عدد کا تخرجہ کر کے مطلوبہ سال ۱۲۸۵ھ حاصل کیا گیا ہے۔ اس یگانۂ روزگار شاعر کی یہ آخری نگارش ہے۔

ذوقعدہ ۱۲۸۵ھ / ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو یہ شہرۂ آفاق شاعر خدا کو پیارا ہوا۔ آہ غالب بمرد (۱۲۸۵ھ) مادہ ہے، جس پر بہت سے شعراء کو توارد ہوا۔ غالب کے شاگرد بال مکند بے صبر نے اس مادہ کو یوں منظوم کیا :

ہماں میرزا غالب اوستادِ من　　　　بجاں آفریں جاں چو آخر سپرد

بپرسیدم از دل سنِ رحلتش　　　　بنالید و گفتا "آہ غالب بمرد" ۱۲۸۵ھ

(اُن میرے استاد میرزا غالب نے آخر اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی (تب) میں نے دل سے ان کا سنہ رحلت پوچھا تو رو دیا اور کہا۔ آہ غالب مر گیا)

میر وزیر نور لکھنوی نے بھی اسی مادہ سے سال پیدا کیا۔

پئے سال آں شاعرِ بے نظیر　　　　فلک زد ندا "آہ غالب بمرد"-۱۲۸۵ھ

جناب محمد بخش فہم بدایونی نے فارسی میں یہ قطعہ کہا :

خزاں دیدہ شد گلشنِ نظم و نثر　　　　چو غالب ز باغِ جہاں رخت برد

نلہ غالب کا ایک مشاق شاگرد بال مکند بے صبر (حیات اور انتخاب تصانیف) از کالی داس گپتا رضا ص ۱۲ و ۴۶ ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی ۱۹۹۲ء

لله تاریخ نمبر نگار جولائی ۱۹۶۳ء نیز تاریخ لطیف ص ۵۰

ے کلیات غالب (فارسی) مرتبہ امیر حسن نورانی ص ۲۰۶ ناشر راجہ رام کمار بکڈپو مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۶۸ء

حعاً ہاتفِ غیب از پئے سال — بگفتا بُن، آہ غالب بمرد[۱۳] ۱۲۸۵ھ

جب ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو غالبؔ کی موت واقع ہوئی تو ذکا حیدر آبادی نے اردو میں درج ذیل تاریخی قطعہ دس عدد کے تدخلے سے کہا:

میرے استادِ معنوی غالبؔ	جس کا ہر لفظ معنی اعجاز
وحدہٗ لاشریک لہٗ کی قسم	ہر ایک فنِّ سخن میں تھا بے نیاز
ایسی قسمت کہاں جو بس کرتا	پردۂ چشم طرب با انداز
ہاں سنا ہے کہ اُس کے تھے کردار	جیسے گفتار حافظ شیراز
کیا عجب ہے جو حرمت اُس سے	بخش دے بھی کریم نکتہ نواز
ہند کا انوریؔ و سعدیؔ تھا	متفق اس پہ ہیں سخن پرداز
خود ہی فرما گیا ہے یہ مقطع	پیش بینی کا دیکھنا انداز
"اسداللہ خاں تمام ہوا" ۱۲۷۵	وا دریغا وہ رندِ شاہد "باز" (۱۰)
پہلے مصرع سے تا بہ آخر شعر	سالِ تاریخ کا ہے جلوہ طراز

غیب دانی صفت خدا کی ہے

اک عدد کی کمی میں تھا یہ راز[۱۴] ۱۲۸۵ھ

مادہ آٹھویں شعر یعنی مقطعِ غالبؔ کا پہلا مصرع ہے، جس کی کل قیمت ۱۲۷۵ ہوتی ہے لیکن نویں مصرع کی رو سے مقطع کے آخری لفظ "باز" کے دس عدد کا تدخلہ کرتے ہوئے

۱۳؎ تاریخ گویانِ بدایوں از ڈاکٹر صداقت اللہ خاں ص ۱۰۱ مطبوعہ ۱۹۹۵ء

۱۴؎ ماہنامہ آج کل نئی دہلی دسمبر ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۴۔

۱۲۸۵ھ حاصل کئے گئے ہیں۔ قاری "اک عدد کی کمی۔۔۔۔ الخ سے کسی وہم میں مبتلا نہ ہوں کہ پھر تدخلہ "باز" کے دس عدد کا کیوں کیا گیا۔ دراصل یہاں "اک" (ایک) سے مراد صرف "احد" نہیں بلکہ ہر ایک عدد خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنے آپ میں ایک عدد ہی ہوتا ہے تاریخ گو "دس عدد کی کمی تھا یہ راز" بھی کہہ سکتا تھا لیکن اس سے نہ صرف شعر بلکہ مکمل قطعہ کا حسن ختم ہو کر رہ جاتا اس لئے اک عدد کی کمی کہا" عدد" میں جو نزاکت ہے وہ دس عدد میں نہیں۔ اس سے تاریخ بےمزہ ہو کر رہ جاتی۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے غالب کی رحلت پر نہایت پُر اثر مرثیہ کہا، جس میں غالب ہی کے ایک مشہور مصرعے سے تاریخ برآمد کی:

غالب نے جبکہ روضۂ رضواں کی راہ لی ؛ ہر لب پہ آہِ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اُس دن کچھ اہلِ شہر کی افسردگی نہ پوچھ ؛ دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا
حالی کہ جسکو دعویٰ تمکین و ضبط ہے ؛ دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد ؛ عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد ؛ اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر وہ نورد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جاں گزا ؛ دل تھا کہ فکرِ سال میں بیصرفہ گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا ؛ سچ ہے کہ خواجہ رہنمائی میں فرد تھا

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر ۱۵۱۱

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" ۲۷۹۶ = ۱۲۸۵ھ

یہ تاریخ غالب مرحوم ہی کی غزل کے ایک مصرعہ سے نکالی گئی ہے۔ ان کی غزل کا مقطع ہے:

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ تن کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ﮯ۱۴ دیوان حالی ص ۱۸۰ مطبع انوار المطابع لکھنؤ ۱۹۲۳ء

مصرعِ اخیر کے اعداد ۲۷۹۶ ہوتے ہیں جب ان میں سے لفظ "تاریخ" کے (۱۲۱۱) عدد ساقط کریں جس کا قرینہ "نکال چکے" میں اور "فکر" کے (۳۰۰) عدد کا اخراج کریں جس کی وضاحت "پرھ بغیر" میں موجود ہے، تو ان کا میزان (۱۲۱۱+۳۰۰) ۱۵۱۱ ہوا۔ اسے ۲۷۹۶ میں سے خارج کیا تو ۱۲۸۵ باقی رہے اور یہی غالب کا سال وفات ہے تاریخ کی مختصر صورت یہ ہوئی ۲۷۹۶-(۱۲۱۱+۳۰۰)= ۱۲۸۵ھ۔

بال مکند بے صبر نے اپنے استاد کی وفات پر دوسرا قطعہ بزبانِ اردو کہہ کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا، جو چار اشعار پر مشتمل بہترین شخصی مرثیہ ہے:

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ — جس سے اہل کلام تھے مغلوب
جب سدھارے بسوے خلد ہوئے — سخن اُن کے اَلَم میں سینہ کوب
اُس بہرِ سخن کے اختر کا — مجکو سالِ غروب تھا مطلوب

کہا بے صبر نے از سرِ حسرت
"ہوا آفتابِ ہند غروب"[۱۵] ۱۸۶۹ء ۱۸۶۹ء

منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی نے اردو میں دو قطعاتِ تاریخ کہے:

مر گیا غالب جو لاثانی تھا ہند میں — لے گیا دنیا سے دل سے حسرتیں کیا دریغ
فکر میں اے سحر میں بیٹھا ہوا تھا ناگہاں
یہ ندا آئی فلک سے: ولے واویلا دریغ[۱۶] ۱۲۸۵ھ

سحر کے دوسرے قطعے کا ہمیں صرف شعرِ تاریخ شعر ہی دستیاب ہو سکا۔ یہ قطعہ تین

---

[۱۵] غالب کا ایک مشتاق شاگرد۔ بال مکند بے صبر ص ص ۱۲ و ۴۶

[۱۶] تاریخ گویانِ بدایوں ص ۷۳

شعر پر مشتمل ہے۔

ہے تحریر مصرع مرے لب پہ جاری — " دنیا سے آج چل دیا غالب بھی"[17] ۱۲۳۴ (کذا)

اس تاریخ کا مادہ مسخ ہے۔ درست صورت یہ ہونی چاہیئے :

" دنیا سے آج چل بسا غالب بھی" ۱۲۸۵ھ

سید آلِ محمد مارہروی نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ اردو میں یوں کہا :

جنابِ میرزا نوشہ صد افسوس — ہوئے دارِ فنا سے رہگرا آج

لکھو اے آلِ محمّد سالِ منقوط

کہ "رشکِ حافظ و طالب مرا آج"[18] ۱۲۸۵ھ

مذکورہ مادہ صنعتِ معجمہ میں ہے جس کے حروف منقوط یہ ہیں : ش، ف، ظ، ب ج ۔ ان حرفوں کے اعداد کا میزان ۱۲۸۵ ہوتا ہے، اور مورخ کو یہی ہجری سنہ مطلوب تھا۔

دیوانِ غالب کا پانچواں ایڈیشن مطبع مفیدِ عام آگرہ سے ۱۲۸۵ھ میں وفاتِ غالب کے فوری بعد شائع ہوا۔ سالک نے دونوں واقعات کی بہت خوبصورت اتفاقی تاریخ کہی :

ہے یہی سالِ طبع سالِ وفات — "آج اون کا سخن تمام ہوا"[19] ۱۲۸۵ھ

سالک صاحب نے معلوم نہیں کس دریائے غم میں غوطہ زن ہوکر مادہ کہا تھا کہ جس کے ہر ایک حرف سے ہزار ہا حسرتیں برس رہی ہیں ۔ آج اون کا سخن تمام ہوا۔!!! ذرا دھیمے لہجے میں پڑھا جائے : آج !! اون !! کا ۔ ۔ ۔ ۔ !!!

---

[17] تاریخِ لطیف ص ۹۴

[18] دیوانِ تواریخ ص ۳۹ مطبع نور الانوار آرہ ۱۲۹۹ھ

[19] ماہنامہ نیا دور نصف صدی نمبر (لکھنؤ) بابت مارچ تا مئی ۱۹۹۶ء صفحہ ۳۷ ۔

سالک صاحب نے معلوم نہیں کس دریائے غم میں غوطہ زن ہو کر مادہ کہا تھا کہ جس کے ہر ایک حرف سے ہزار ہا حسرتیں برس رہی ہیں۔ آج ادن کا سخن تمام ہوا۔!!! ذرا دھیمے لہجے میں پڑھا جائے: آج !!! ادن !! کا۔۔۔ !!!

جناب سید مسعود حسن مسعود صاحب نے ہجری و عیسوی سنہ میں دو قطعات لکھے ہیں:

نامور نکتہ رس خدائے سخن　　　شاعر باوقار مصدرِ علم

کہدو مسعود سال ہجری میں
ہوئی تاریخ "موت" مظہرِ علم"　　۱۲۸۵ھ

دوسرا قطعہ یہ ہے:

چل بسے آج میرزا غالب　　　چھا گیا ملک پر وبالِ غم
موت کا انکی سانحہ تھا عظیم　　　اک جہاں کو ہوا کمالِ غم

ہے یہ مسعود عیسوی سن میں
"محترم نیک ذات "سالِ غم　　۱۸۶۹ء

مذکورہ دونوں قطعات بہت بعد میں کہے گئے ہیں جو بے نمک اور عمومی نوعیت کے حامل ہیں۔

سید محمد علی جویا مرادآبادی نے بزیادتِ یک عدد مندرجہ ذیل قطعہ کہا جو زنانی اور ناقص الاعداد مادہ کا حامل ہے:

حادثہ وہ ہوا ہے غالب کا　　　جس سے مغموم خاص و عام ہوئے

۲۰ے عندلیبِ تواریخ ص ۱۱۳، ادارہ انیسِ اردو الہ آباد ۱۹۶۳ء

۲۱ے حوالہ سابق ص ص ۱۱۳-۱۱۴

پس غالب یہ سال ہاتھ آیا[۲۲]

" اسداللہ خاں تمام ہوئے" ۱۲۸۴ + ۲ = ۱۲۸۶ھ

"پس غالب" سے مراد یہاں "غالب" کا آخری حرف بائے موحدہ ہے جس کے دو عدد شامل اعدادِ مادہ کیے ہیں۔ جبکہ معنی تقریب یہ ہیں کہ غالب کی رحلت کے بعد یہ تاریخ ہاتھ آئی۔ باقی دو قطعات بزبانِ فارسی ہیں[۲۳] اور دونوں ۱۲۸۶ھ کے مظہر۔

نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی نے دو اشعار پر مشتمل قطعہ موزوں کیا جس کا تاریخی بیت ہے:-

کہا ہاتف نے ہوش" اب ہوئے ہے ہے

اسد بیشۂ سخن سنجی" ۱۲۸۵ھ

جویا کا فارسی زبان میں کہا ہوا ایک قطعہ یہ ہے:-

غالب چوں ازیں جہانِ گذراں   شد داخلِ خلد ہر ملک گفت

تاریخ وفات اوز جویا

"تاج سر شاعران" فلک گفت[۲۴] ۱۲۸۶ھ

(غالب جب اس جہان فانی سے گئے تو ہر ایک فرشتے نے کہا کہ وہ داخل خلد ہو گئے، اور جویا سے فلک نے ان کی تاریخ وفات " تاج سر شاعراں" یعنی شاعروں کے سر کا تاج کہی۔)

جویا کی تاریخیں لگ بھگ دو ماہ کے تفاوت سے ہیں:

سید محمد علی جویا نے فارسی کے دوسرے قطعہ میں غالب، شیفتہ، مظفر خاں گرم اور رجب علی بیگ سرور کے انتقال پر کہا جو گویا صنعت اتفاق میں بطرزِ معما ہے، جسے ہم یہاں حرف

---

۲۲ خیابانِ تاریخ (سرودِ غیبی) ص ۸۲ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۲ھ

۲۳ تاریخ لطیف ص ۵۰

۲۴ خیابانِ تاریخ ص ۵۱

غالب کے سبب لکھتے ہیں:

دینکے سال زگیتی رفتند	غالب و شیفتہ و گرم و سرور
آں ہمہ در ہمہ اصناف سخن	چوں سخن در ہمہ گیتی مشہور
سالِ تاریخ اگر می خواہی	بہراِیں چار حریف مسطور
اول و اوسط و ثانی و سوم	گیر از یں ہر ہمہ نام مغفور

باز ترکیب بدہ تا بشنوی[۱]
مژدہ مغفرت شاں "ز غفور" ۱۲۸۶ھ

جو یانے چوتھے شعر میں وضاحت کردی ہے کہ ان چاروں شعراء کے تخلص کے حرفِ اول یعنی غالب کے "غ" شیفتہ کے تخلص کے حرف درمیانی (اوسط) یعنی "ف" گرم کے تخلص کے حرفِ ثانی یعنی "ر" اور سرور کے تخلص کے حرف سوم یعنی "و" کو ترتیب دے کر مادہ بنایا جائے تو وہ لفظ "غفور" ہوگا۔ جس کے عدد ۱۲۸۶ ہوتے ہیں۔ لیکن سرور کے علاوہ شیفتہ کا سالِ وفات صحیح طور پر معلوم نہیں باقی گرم و غالب کے سالِ وفات ۱۲۸۵ھ ہیں۔

اس "رشکِ جامی و ثانی سعدی" کی رحلت پر سید آلِ محمدؐ مارہروی نے درج ذیل تاریخی مرثیہ کہا:

حیف رفت آنکہ از کلامش بود	آشکارا معانی سعدی
درمیا دینِ نظم و نثرش داد	طالعش ہمعنانی سعدی
ہر کہ دیوانِ او مطالعہ کرد	یافت شیریں بیانیِ سعدی
بود در ہند بعدِ مرگِ حزیں	حق او ہمز بانِ سعدی

۱۔ خیابانِ تاریخ ص ۲۱

ابرِ نیسانِ کلکِ در سلکش ! — داشت گوہر فشانیِ سعدی
سعدی ار زندہ بودی او بسخن — ساختی میزبانیِ سعدی
صحبتِ پُر افادتش دادی — یاد از نکتہ دانیِ سعدی
مستمع را زِ خواندنِ شعرش — لذتِ شعر خوانیِ سعدی
از جواں فکریش تقابل داشت — پیریش با جوانیِ سعدی
بود ذاتِ بلاغتِ آباتش — در زمانہ نشانیِ سعدی

گفت آلِ محمد ش تاریخ

" رشک جامی و ثانی سعدی"[26] ۱۲۸۵ھ

سید آلِ محمد صاحب ہی کا دو اشعار کا ایک دوسرا قطعہ ہے جو عیسوی سنہ میں برآمد کیا ہے ؛

غالب کہ بشعرِ فارسی در عہدش — لفّاظ او بود و صفنا نش لافظ (کذا)

تاریخِ مسیحی پئے سالِ نقلش

از آلِ محمد است: "فخرِ حافظ"[27] ۱۸۶۹ء

ڈپٹی عفور نساخ کے قطعہ کا تاریخی شعر ہے ؛

نساخ من کہ جستم تاریخ انتقالش — گفتا سروشِ غیبی " بعن الکمال غالب"[28] ۱۲۸۵ھ

مفتی محمد غلام سرور لاہوری نے تعمیہ کی طرح غالب کی وفات کے قطعہ کا مادہ ایک عدد کی زیادتی سے برآمد کیا ہے ؛

چوں غالب شہنشاہِ ملکِ سخن — ز دنیا ببامِ فلک خیمہ زد

---

۲۶ گنجینۂ سروری (گنجِ تاریخ) ص ۲۱۷ مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء

۲۷ دیوانِ تواریخ ص ص ۱۷۰ - ۱۷۱ و ص ۸۵

۲۸ تاریخ لطیف ص ۵۰ ۔

رقم کرد سرور بتاریخ او

کہ "رفت از جہاں گنج عرفاں اسد" ۱۲۸۶ھ

شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) نے ذیل کا مرثیہ نظم کیا:

مرزا نوشہ جناب غالب — در فن سخنوری یگانہ

از اہل سخن ربود دلہا — در شعر بطرز جاودانہ

کیفیت نثر او چگویم — دارد انداز دلبرانہ

باشد بکلام او عجب لطف — معشوقانہ و عاشقانہ

از کشور ہند تا بفارس — زد کوس کمال خسروانہ

در وجد آرد قلوب پاکاں — تو لش در قالب ترانہ

مستانہ کلام او بخشد — کیف و شکر بے شبانہ

ایں اشعارم بمدحت او — نبود گفتار شاعرانہ

ہر آنچہ کہ گفتہ ایم یاراں — باشد قول محققانہ

بگذاشتہ خاک پاک دہلی — در شوق بہشت جاودانہ

سال آں بے نظیر یحییٰ

گو "بود نظیری زمانہ"[۲۹] ۱۲۸۵ھ

ولہ

غالب نام آور کہ گرفتی — از قلم خود کار سیف

رحلت کرد و سالش گفتم

"حیف جناب غالب حیف"[۳۰] ۱۲۸۵ھ

۲۹۔ کنز تواریخ ص ص ۲ - ۳۱ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۸۲ء

۳۰۔ حوالۂ سابق ص ۳۲۔

حاتم علی مہر کے قطعہ کا حامل تاریخ شعر ہے :-

گفت ہاتف پئے تاریخ اے مہر ۔۔۔ "بجناں غالب نامی آمد"[۳۱] ۱۲۸۵ھ

سید آل محمد بلگرامی ثم مارہروی نے صنعت زبر و بینہ میں بڑا عمدہ قطعہ کہا جو اتفاقی ہے :-

سہ شاعر را زوال آمد بہ یک سالی ۔۔۔ کہ ہند از شعر شاں چوں اصفہاں بود

یکے آں غالب استادِ لسانین ۔۔۔ کہ او خود پیر و شعر او جواں بود

دوم زانہا سرور استاذ اردو ۔۔۔ کہ شعر او سرور افزائے جاں بود

سوم شاعر خلیل مرثیہ گو ۔۔۔ کہ در ملکِ سخن صاحب قِراں بود

ہمہ عالم، ز نوت ایں سہ شاعر ۔۔۔ پُر از فریاد از شور و فغاں بود

زُبُر با بینہ از بہرِ تاریخ ۔۔۔ فراہم شد "زوالِ شاعراں بود" ۱۲۷۳

ولیکن با زُبُر با بینہ ہم ۔۔۔ سر حزن و بکا شامل بآں بود ۱۲ / ۱۲۸۵ھ

(یعنی تین شاعروں پر ایک ہی سال میں زوال آیا مراد وفات ہوئی، جو کہ اپنے اشعار سے ہندوستان کو اصفہان کی مانند بنائے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک غالب تھے جو فارسی و اردو کے استاد تھے، جو اگرچہ خود پیر تھے مگر ان کی شاعری جوان۔ ان میں سے دوسرے رجب علی بیگ سُرور استادِ اردو تھے جنکے اشعار کا سُرور جاں فزا تھا۔ تیسرے شاعر مرثیہ گو ے خلیل تھے جو اقلیم سخن کے صاحبقِراں تھے۔ اِن تینوں شاعروں کی وفات سے تمام عالم فریاد اور شور و فغاں سے پُر ہوگیا۔ مجھے برائے سالِ صنعتِ زبر و بینہ میں مادہ "زوالِ شاعراں بود" (شاعروں کا زوال تھا) فراہم ہوا لیکن زبر و بینہ ہی میں سر حزن و بکا (ح، ب) شامل مادہ کرنے پر)

---

[۳۱] دیوانِ تواریخ ص ۵۱

مذکورہ تاریخ میں زبیر وبینہ کے التزام کے سبب مطلوبہ سنہ برآمد کرنے کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہوگیا ہے۔ اسی لئے ذیل کی سطروں میں اس کا حل پیش ہے:

زوالِ شاعراں بود + ح ب

ح ب	بود	شاعراں	زوال	
حا با	با واو دل	شین الف عین را الف نون	واو الف لام	زبر وبینہ: زا

اعداد: ۸+۳۱۳+۱۱۱+۷۱(۳۴۳)+۳۶۰+۱۱۱+۳۰+۲۰۱+۱۱۱+۲۶+۲۰(۲۱۹)+۳۴+۲+۳۵(۵۱)+۱۹+۲(۱۲)

کل میزان: ۱۲۸۵ھ۔

۵۳-۱۹۵۲ء میں حکومتِ ہند نے غالبؔ کا مزار تعمیر کروایا۔ ابوالفصاحت حضرت لبھورام جوشؔ ملسیانی نے قطعۂ تاریخ تعمیر کہا جس کے پہلے شعر کے پہلے مصرع میں غالبؔ کا سالِ وفات بھی فوری طور پر برآمد کیا ہے:-

وہ تھا بارہ سو پچاسی ہجری | جب ہوا دفن یہ شیریں گفتار
کی حکومت نے بھی قدر افزائی | مقبرہ کر دیا اس کا تیار

سالِ تاریخ یہ لکھ دو اے جوشؔ
"آئیے دیکھئے غالبؔ کا مزار"[۳۲] ۱۳۷۲ھ

اس رشکِ طالبؔ و عرفیؔ و حافظؔ و سعدیؔ و جامیؔ کے مزار واقع دہلی میں انکے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروحؔ کا یہ حسرت اندوز قطعہ کندہ ہے۔

کل حسرت وافسوس میں ایں یادِ دلِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک

---

[۳۲] مکتوباتِ جوشؔ ملسیانی بنام رضاؔ، از کالیداس گپتا رضاؔ ص ۹۹ حاشیہ نمبر ا، ول پبلیکیشنز بمبئی اگست ۱۹۷۷ء بار اول

حاتم علی مہر کے قطعہ کا حامل تاریخ شعر ہے :۔

گفت ہاتف پئے تاریخ اے مہر — "بجناں غالب نامی آمد"[۳۱] ۱۲۸۵ھ

سید آل محمد بلگرامی ثم مارہروی نے صنعت زبر و بینہ میں بڑا عمدہ قطعہ کہا جو اتفاقی ہے :۔

سہ شاعر را زوال آمد بہ یک سالی — کہ ہند از شعر شاں چوں اصفہاں بود

یکے آں غالب استادِ لسانین — کہ او خود پیر و شعر او جواں بود

دوم زانہا سرور استادِ اردو — کہ شعر او سرور افزائے جاں بود

سوم شاعر خلیل مرثیہ گو — کہ در ملکِ سخن صاحب قراں بود

ہمہ عالم، ز فوت ایں سہ شاعر — پُر از فریاد از شور و فغاں بود

زُبُر با بینہ از بہر تاریخ — فراہم شد "زوالِ شاعراں بود" ۱۲۷۳ + ۱۲

ولیکن با زُبُر با بینہ ہم — سر حزن و بکا شامل بآں بود ۱۲۸۵ھ

(یعنی تین شاعروں پر ایک ہی سال میں زوال آیا مراد وفات ہوئی، جو کہ اپنے = اشعار سے ہندوستان کو اصفہان کی مانند بنلئے ہوئے تھے۔ اُن میں ایک غالب تھے جو فارسی و اردو کے استاد تھے، جو اگرچہ خود پیر تھے مگر ان کی شاعری جوان۔ ان میں سے دوسرے رجب علی بیگ سرور استادِ اردو تھے جنکے اشعار کا سرور جاں فزا تھا۔ تیسرے شاعر مرثیہ گوے خلیل تھے جو اقلیم سخن کے صاحبقراں تھے۔ ان تینوں شاعروں کی وفات سے تمام عالم فریاد اور شور و فغاں سے پُر ہوگیا۔ مجھے برائے سال صنعت زبر و بینہ میں مادہ "زوالِ شاعراں بود" (شاعروں کا زوال تھا) فراہم ہوا لیکن زبر و بینہ ہی میں سر حزن و بکا (ح، ب) شامل مادہ کرنے پر)

---

[۳۱] دیوانِ تواریخ ص ۵۱

مذکورہ تاریخ میں زبر و بینہ کے التزام کے سبب مطلوبہ سنہ برآمد کرنے کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس لیے ذیل کی سطروں میں اس کا حل پیش ہے:

زوالِ شاعراں بود + ح ب

حا ب	بود	شاعراں	زوال	
حا یا	باواو دل	شین الف عین را الف نون	زا واو الف لام	زبر و بینہ:

اعداد ۸+۱۳+۱۱۱ + ۷۱=(۲۰۳) + ۳۶۰ + ۱۱۱ + ۱۳۰ + ۲۰۱ + ۱۱۱ + ۶=(۹۱۹) ۴+۱۲+۳۵ (۵۱) ۹+۳=(۱۲)
کل میزان: ۱۲۸۵ھ۔

۵۲-۵۳ ۱۹ء میں حکومتِ ہند نے غالب کا مزار تعمیر کروایا۔ ابوالفصاحت حضرت لبھو رام جوش ملسیانی نے قطعۂ تاریخ تعمیر کہا۔ جس کے پہلے شعر کے پہلے مصرع میں غالب کا سالِ وفات بھی فوری طور پر برآمد کیا ہے:-

وہ تھا بارہ سو پچاسی ہجری — جب ہوا دفن یہ شیریں گفتار
کی حکومت نے بھی قدر افزائی — مقبرہ کر دیا اس کا تیار

سالِ تاریخ یہ لکھ دو اے جوش
"آئیے دیکھئے غالب کا مزار"[۳۲] ۱۳۷۲ھ

اِس رشکِ طالب و عرفی و حافظ و سعدی و جامی کے مزار واقع دہلی میں انکے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح کا یہ حسرت اندوز آتلہ کندہ ہے۔

کل حسرت و افسوس میں ایں یادِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک

[۳۲] مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا از کالیداس گپتا رضا ص ۹۹ حاشیہ نمبر ا، ومل پبلیکیشنز بمبئی اگست ۷۷ ۱۹ء بار اول

ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے نہ حالی"[۲۳] ۱۲۸۵ھ

امید ہے کہ کوئی نوجوان اسکالر اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کی طرف مائل ہوگا۔ غالب ہی کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب   اب عناصر میں اعتدال کہاں

راقم الحروف قطعاتِ وفاتِ غالب پر سرِ دست کچھ زیادہ کر بھی نہیں سکتا تھا جو کچھ کیا ہے اس کے لئے بس یہی کہہ سکتا ہوں:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

۲۳۔ مظہرِ معانی (۱۳۱۶ھ) معروف بہ دیوانِ مجروحؔ ص ۲۳۹، سرفراز پریس بستی قربان علی دہلی ۱۳۱۶ھ

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

(جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء)

قسط ۱

... دیوار افگند سایہ دراز	باز گردد سوئے او آں سایہ باز
... کو راست و فعل ما ندا	سوئے ما آید ندا ہا را صدا

قرآن عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لا متناہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروف ... ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے۔ اگر ہم اس پر بھروسہ ... اور اعتصام کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں چنگل ماریں! ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار، بے ولی، ونصیر، نہیں چھوڑ گیا ہے، ساری زندگی لطف حق شامل حال رہتا ہے، زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے۔ اطمینانِ قلب و جمعیتِ خاطر نصیب ہوتی ہے۔ اگر ہم رضائے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں۔

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گذر رہے ہیں اور جن سے ہم خوف زدہ ہیں۔ إِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (بقرہ ع ۳۲) وہ ہمارے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا (النساء رکوع ۵) حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں، اور اس سرور سے ہمارے قلب کو مملو کرنا چاہتے ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروحؔ
ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے نہ خاک"[۳۲] ۱۲۸۵ھ

امید ہے کہ کوئی نوجوان اسکالر اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کی طرف مائل ہوگا۔ غالب ہی کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ اب عناصر میں اعتدال کہاں

راقم الحروف قطعاتِ وفاتِ غالبؔ پر سرِ دست کچھ زیادہ کر بھی نہیں سکتا تھا جو کچھ کیا ہے اس کے لئے بس یہی کہہ سکتا ہوں:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

---

۳۲ مظہرِ معانی (۱۳۱۶ھ) معروف بہ دیوانِ مجروحؔ ص ۲۳۹، سرفراز پریس بستی قربان علی دہلی ۱۳۱۶ھ

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

(جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا)

قسط ۱

گرچہ دیوار افگند سایہ دراز — باز گردد سوئے او آں سایہ باز

ایں جہاں کوہ است و فعلِ ما ندا — سوئے ما آید ندا ہا را صدا

قرآن عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لامتناہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروف عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے۔ اگر ہم اس پر بھروسہ کریں اور اعتصام کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں چنگل ماریں! ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار، بے ولی، و نصیر، نہیں چھوڑا گیا ہے، ساری زندگی 'لطف حق' شامل حال رہتا ہے، زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے۔ اطمینانِ قلب و جمعیتِ خاطر نصیب ہوتی ہے، اگر ہم رضائے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں۔

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ وَاللّٰہُ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گذر رہے ہیں اور جن سے ہم خوف زدہ ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ (بقرہ ع ۳۲) وہ ہمارے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (النساء رکوع ۵) حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں، اور اس سرور سے ہمارے قلب کو مملو کرنا چاہتے ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ

مَا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجدہ ع ۲) آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانۂ غیب میں موجود ہے اس کی کسی کو خبر نہیں۔

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الٰہی نظم موجود ہے، جس میں توافق و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی! حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظم الٰہی کے دائرہ میں بسر ہو اور زمین پر رہ کر بھی ہم جنت کی خوشبو سونگھتے رہیں۔ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (الاحزاب ع ۶) حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے مومن پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ انھیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مومن پر بہت مہربان ہیں!

اسی زندگی میں ہمیں یہ نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہمیں اس کو عطا کر سکتے ہیں۔ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ! اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہو جاتی ہے جو پانی کے چشمے کے پاس اُگا ہے، ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سرمدی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے۔

صد چو عالم در نظر پیدا کند
چونکہ چشمت را بخود بینا کند (رومیؒ)

اگر ہماری آنکھیں حق تعالیٰ کے مشاہدہ کے لیے کھل جائیں اور ہم ہدایت و نظم الٰہی کے دائرہ میں اپنی زندگی بسر کریں تو ہماری ساری خارجی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں یا غائب ہو جاتی ہیں:

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر
تاب خور بگدازدش از یک نظر (رومیؒ)

اس عقیدہ یا ایمان کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہو کر زندگی کے کچھ قدیم دستور اصول ہم سے سنو اور زندگی کے تجربات، حالات یا ماحول میں ان سے کام لو، زندگی "گریۂ پیہم" نہ رہے گی، "خندہ یکدم" ہو جائے گی! (جاری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرپرست اعلیٰ ندوۃ المصنفین دھلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجلس ادارت اعزازی

سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۳ | ستمبر ۱۹۹۸ء | شمارہ ۳

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ بُرہان

4136 اردو بازار جامع مسجد دہلی۔110006 * فون نمبر 3262815

زرِ تعاون
فی پرچہ: ۶ روپے
سالانہ: ۷۲ روپے
کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISIO

عمید الرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

موجودہ مسلم معاشرے میں برائیاں اس قدر گھر کر گئی ہیں کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے ایسے تاریک ماحول میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی کہیں نظر آتی ہے تو دل ودماغ میں خوشی ومسرت کی لہر دوڑ جانا قدرتی بات ہے۔ مشہور خبر رساں ایجنسی رائٹر نے کینیا کے مسلمانوں سے متعلق ایک خبر شائع کی ہے جو اس طرح ہے۔

" کینیا میں ایک مسجد میں عبادت کرنے گئے مسلم نوجوانوں نے خواب میں بھی شاید نہ سوچا ہوگا کہ واپس لوٹتے وقت وہ اکیلے نہیں ہوں گے بلکہ انکے ساتھ انکی بیویاں بھی ہوں گی اور ساتھ میں ہنی مون کے لئے دھن بھی ملے گا۔ کینیا کے "ایسٹ افریقن اسٹینڈرڈ" میں شائع شدہ خبر کے مطابق نیروبی سے تین سو تیس کیلومیٹر مشرق میں واقع ایک مسجد کے امام نے پوچھا کہ کیا یہاں حاضرین میں غیر شادی شدہ نوجوان ہیں؟ امام صاحب کی بات سنتے ہی اسی وقت چالیس نوجوان آگے بڑھ آئے۔ اس کے بعد بیس جوڑوں کا نکاح پڑھایا گیا نکاح کے بعد امام نے ہنی مون کے لئے بیس بیس ہزار شیلنگ بھی دیئے۔ امام نے بعد میں اخبار والوں کو بتلایا کہ یہ نکاح شہر میں اخلاق سوز حرکات کے سدباب کے لئے کرائے گئے"۔

جس نیوز ایجنسی نے یہ خبر شائع کی ہے اس پر یہودی لابی کا قبضہ ہے اس لئے اس نے اس خبر کو مضحکہ خیز انداز میں اس لئے دیا کہ مسلم معاشرے کی کوئی بھی اچھی خبر اپنی اصلیت سے نہ چھپنے پائے جس سے اسلام اور مذہب اسلام کے ماننے والوں کا سر بلند ہو اس لئے اس نے یوروپی ممالک میں موجود بے شمار خرابیوں پر پردہ ڈالے رکھنے کے ارادے سے اس اچھی خبر کو بھی برائی کے انداز میں شائع کیا ہے چونکہ مسلمانوں کی اپنی کوئی نیوز ایجنسیاں نہیں ہیں۔

اس لئے اخبارات میں جو بھی خبریں شائع ہوتی ہیں وہ یہود و نصاریٰ کی نیوز ایجنسیاں ہی شائع کرتی ہیں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو بھی اچھی خبریں ہوتی ہیں وہ اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ ان دشمنانِ اسلام نیوز ایجنسیوں کی بدولت مسخ شدہ ہو کر ہی شائع ہوتی ہیں۔ کینیا کے شہر نیروبی میں غریب مسلمان جوڑوں کی شادیاں سنتِ نبوی صلعم کے مطابق مسجد میں بالکل سادگی کے ساتھ انجام پذیر ہوئیں اس خبر سے مسلم معاشرہ کی سربلندی ظاہر ہوتی ہے جو یہود و نصاریٰ کے لئے ناقابلِ برداشت ہے اس لئے وہ اس خبر میں اپنی شیطان صفت ذہنیت کی ملاوٹ کرنے سے باز نہیں آئے۔ کینیا کی مسجد میں بیس مسلمان جوڑوں کی سادگی کے نکاح خوانی کی خبر ایک اہم خبر ہے۔ جس سے مسلم معاشرہ کی نیک نامی اور عزت و وقار میں انشاء اللہ اضافہ ہی ہوگا۔ ایسی ہی ایک خوشی و مسرت سے لبریز خبر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کی ہے اور جس میں ہندوستانی مسلمانوں خصوصاً دہلی کے مسلمانوں کی رواداری، شرافت، انسانیت، خدا ترسی، فرض شناسی، ہمت و ایثار اور جذبۂ ہمدردیٔ ملت کی موجود جھلک موجود ہے۔

بات ۲۸ جون ۱۹۹۸ء کی ہے خدمتِ خلق کے کاموں میں مصروف و منہمک دہلی کی ایک معروف شخصیت حاجی اختر سعید دہلوی ہے اپنے ذرائع اور حق و استحقاق سے انتظام و بندوبست کر کے دو مسلمان یتیم لڑکیوں کی شادی دو مسلمان لڑکوں کے ساتھ کرنے کی تاریخ طے کرتے ہیں۔ یتیم بچیوں کے لئے جہیز کا سامان بھی اچھا خاصہ جلدی جلدی جو ہو سکا اکٹھا کیا گیا اس کے ساتھ یہ بھی سوچا گیا کہ شادی کے بعد بھی ان بچیوں کے نصیب میں جو ہوگا وہ دیا جائے گا ــــ تاریخ مقررہ پر دونوں لڑکے شادی کے لئے برات لیکر آئے۔ عین نکاح سے چند لمحے پہلے جہیز پر نگاہ ڈالنے کے بعد لڑکوں کے کسی عزیز نے اسکوٹر کی فرمائش کر دی۔ جیسے ہی اس فرمائش کی خبر یتیم لڑکیوں کی شادی کرنے والے

حاجی اختر سعید کے کانوں تک پہنچی وہ ہکا بکا ہی رہ گئے۔ فوراً ہی انہوں نے نکاح خوانی کے لئے قاضی صاحب کو کہا کہ نکاح مت پڑھائیے اور دونوں لڑکوں کو جو دولہا بنے ہوئے تھے کہا کہ اٹھو اور نکل جاؤ یہاں سے کیا نکاح پڑھوانے آئے ہو یا سودا کرنے کے لئے آئے ہو، کیا تم مسلمان کہنے کے حقدار ہو اطاعتِ رسول کے دعویدار بنتے ہو اور عمل و کردار سے شیطان بنے ہوئے ہو۔ اچھا ہوا تم نے اپنی ذہنیت نکاح سے پہلے ہی ظاہر کردی ورنہ تو یہ دونوں معصوم بچیاں تم درندوں کے ظلم وستم اور شیطانی کردار کی شکار تمام زندگی ہی ہوتی رہتیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تم کو پولیس کے سپرد کرنا پڑے گا۔ دونوں لڑکے بڑی بے عزتی کے ساتھ بھگا دیئے گئے اب ان معصوم یتیم بچیوں کے لئے اندھیرا ہی اندھیرا سامنے تھا۔ لیکن نہیں خدا کی عنایت وفضل اور کرم وانعام کی بارش ان یتیم بچیوں پر اس طرح ہوتی ہے کہ حاجی اختر سعید کے دوست واحباب جو ان یتیم بچیوں کی شادی کے انتظامات میں مصروف ومستغرق تھے ان میں سے ایک پر حاجی اختر سعید کی توجہ مرکوز ہوئی وہ تھے علمی ذوق کے حامل شعر وشاعری کے شوقین سوئی والان گلی کوتانہ میں سیما ایکسپورٹ کے مالک محمد مختار خاں صاحب حاجی اختر سعید نے ان سے کہا کہ اپنے کسی لڑکے کو تیار کرو شادی کے لیے۔ پیکر ایثار اور مجسم شرافت وانسانیت اللہ کے اس نیک بندے محمد مختار خاں نے ذرا بھی چوں وچرا کئے بغیر اپنے لڑکے محمد اختر کو فوراً پیش کردیا۔ اور دوسری لڑکی کے لیے ایک دوسرا لڑکا محمد آصف خود بخود ازراہِ انسانیت تیار ہوگیا۔ فوراً ہی ان دونوں لڑکوں سے دونوں یتیم لڑکیوں کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ دونوں یتیم لڑکیوں کی رخصتی بڑی شان کے ساتھ ہوئی دونوں لڑکے اپنی اپنی دلہن کو عزت ووقار کے ساتھ اپنے اپنے گھر لے گئے۔ آج یہ دونوں لڑکیاں معزز خاندان میں اپنے قابل وہونہار شوہروں کے ساتھ سکون وراحت

آرام واطمینان کے ساتھ خوش ومسرت آمیز زندگی بسر کر رہی ہیں یہ ہے سنت نبوی صلعم پر عملی طور پر چلنے کی عظیم الشان مثال، اسے ہم ایک مثالی شادی کہیں گے۔ اور آفرین ہے ان حضرات پر جنھوں نے اپنے نوجوان لڑکوں کے لئے ہنسی خوشی ایسی شادیاں کرنے کی حامی بھری۔ نہ کوئی فضول کی رسم نہ کوئی دھوم دھام سے برات چڑھانا اور نہ کوئی اپنے لڑکوں کی قابلیت وصلاحیت اور اپنے مال واسباب پر اِترا ہٹ دکھانا، ہر مسلمان کو اس "مثالی شادی" سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ محمد مختار خاں اور ان کے گھر کی خواتین کہہ سکتی تھیں کہ ہمارے لڑکے اس قدر گرے ہوئے تھوڑے ہی ہیں کہ ایسی یتیم بچیوں سے شادی کریں؟ اس قسم کی کسی بات کو بھی زبان پر لانا انہوں نے گناہ کبیرہ سمجھا۔ بلکہ انہوں نے اپنے لڑکوں کی شادی ان یتیم بچوں سے کرنا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ کا اپنے لڑکوں پر انعام واکرام ہی گردانا ـــــ اس مثالی شادی کی جس قدر بھی شہرت کی جائے کم ہی ہے وہ اس لئے کہ ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے تعلق سے جو غلط رسم ورواج اور گندگی کا عنصر گھس آیا ہے اس سے اس کی تلافی ہی ہوگی اور اس طرح تمام عالم میں ملّت اسلامیہ کی واہ! واہ ہوگی اسلامی تعلیمات اور سیرتِ رسول صلعم کی خود بخود تبلیغ ونشر واشاعت ہو کر رہیگی ـــــ دوسرے اکثر مسلمان اس وقت دنیاوی عیش واسباب کے حصول میں لگے ہوئے ہیں انھیں معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے علم، مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کی تہذیب وتمدّن کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے مسلم دشمن طاقتیں آج آپس میں گھی شکر ہیں اور وہ ایک ایسے خفیہ خطرناک پروگرام کے تحت اسلام اور مسلمانوں پر ضرب شدید لگانے کے فراق میں نشانہ تانے بیٹھی ہوئی ہیں جو مسلمانوں کی ہستی و وجود ہی کو ختم کر ڈالے۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے ناپاک منصوبے ہر جہت سے اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا کرم وفضل نہ

جو تو ملت اسلامیہ کا وجود کب کا کفر کی طاقت و یلغار سے ختم ہو چکا ہوتا۔ اس موقع پر ہم کو
مسلم قوم کی ان برائیوں کو ٹٹول کر ان کے سدباب کے لیے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔
قرآن کریم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اچھائیوں کی تلقین کریں اور برائیوں سے روکیں۔ قرآن
مجید کی یہ ہدایت محض ایک ترغیبی نصیحت کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ اسکو امت مسلمہ کا فریضہ
قرار دیتا ہے۔ اور اس عمل کو مسلمانوں کے لیے وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)
قرآنی تعلیم کا مقصد انسان کو ایک ایسا مثالی انسان بنانا ہے جو خیر و فلاح کا نمونہ ہو اور
جس کا وجود اپنے ہم جنسوں کے علاوہ کائنات کے ہر وجود بلکہ ہر شئے کے لئے رحمت و
راحت ہو۔ جس روز مسلمان اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے مطابق ہر ہر موڑ پر اپنی زندگی
کو ڈھال لیں گے اسی روز سے مسلمانوں کا عروج پھر شروع ہو جائے گا اور تمام عالم میں
اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ شرط ہے کہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں' کاروبار
میں، رہن سہن میں، چلنے پھرنے میں، بولنے چالنے میں، معاملات اور لین دین میں اسلامی
تعلیمات پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا ہو جائے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مسلمانوں پر آج پوری ذمہ داری آن پڑی ہے کہ وہ امت محمدیہ کے ناطے معاشرہ اور
ماحول میں پھیلی ہوئی تمام برائیوں کے خاتمے کیلئے اپنی زندگی کو مثالی نیک عمل و کردار کے سانچے
میں ڈھالیں اور ہر انسان کو باور کرائے کہ آج بنی نوع انسانی کی پریشانیوں کے مشکلات
اور الجھے مسائل کا حل صرف اور صرف اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہی ہے۔

کیوں اندھیروں میں بھٹکتا پھر رہا ہے آدمی
روشنی رکھی ہوئی ہے آج بھی جزدانوں میں

قبلہ ابّا جان رحمتہ اللہ علیہ

از قلم: صاحبزادہ عمید الرحمان عثمانی

آج علی الصبح تلاوت قرآن پاک پڑھ کر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک دم قبلہ ابّا جان حضرت مفکرِ ملّت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کی یاد آئی اور اس قدر آئی کہ میں ماضی کی یادوں میں کھو گیا اور ان یادوں میں قبلہ ابا جان کا سراپا شفقت بھرا سلوک نظروں کے سامنے آگیا۔

مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ بہت بڑے عالم تھے مفکر تھے مدبر تھے اور زبردست متقی و پرہیزگار تھے ان کا تدین و تقویٰ صالحیت ضرب المثل تھے دین و مذہب کے سلسلے میں کسی بھی طرح اور کسی بھی حیثیت سے وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان میں تمام انسانوں سے بلا لحاظ مذہب و ملّت رواداری اور محبت اور حسن وسلوک کے جوہر نمایاں دیکھنے میں ملتے تھے۔ وہ اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان وادب پر گہری نظر و واقفیت رکھتے تھے مگر اس کے باوجود ان میں اپنے علم پر تکبر و پندار نہ تھا۔ ہر ایک سے چاہے وہ عالم ہو یا جاہل وان پڑھ خندہ پیشانی اور اپنے کو چھوٹا و کم سمجھتے ہوئے ملتے تھے مخاطب ومقابل کی عزت و تکریم کا خیال وہ ہر وقت مقدم رکھتے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ میرے علم و معلومات کے مطابق انکا کوئی بھی مخالف و دشمن نہ تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ بعض حضرات نے اپنے ذاتی یا وقتی مفادات کے پیش نظر حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو نظر انداز یا فراموش کرنے میں اپنا نفع سمجھا لیکن اپنے کردار وعمل اور حسن سلوک سے

حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کو اپنی ناپسندیدگی کا احساس نہ ہونے دیا جس سے خود بخود ذاتی مفاد پرستوں نے اپنے ضمیر کے اندر جھانک کر دیکھا تو اپنے ہی کو مجرم سمجھا اور اس طرح ان کے دل و دماغ میں حضرت مفتی صاحبؒ کے بارے میں نیک و حسن ظن ہی پروان چڑھتا رہا۔

حضرت مفتی صاحبؒ میں بلا کی ذہانت تھی وہ ملت کا بڑا سے بڑا اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ بھی اس خوبی سے سلجھا دیا کرتے تھے کہ وہ مسئلہ اپنے آپ میں کوئی مسئلہ ہی نہیں رہتا تھا۔ ملت اسلامیہ ان پر جتنا بھی ناز کرے کم ہی ہے۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مصائب و مشکلات میں اس قدر اضافہ ہوا کہ اگر امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اور مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اپنی شب و روز محنت و لگن، دور اندیشی سے ان مصائب و مشکلات کے تدارک کے لیے کمربستہ اور مستعد عمل نہ ہوتے تو نہ معلوم ہندوستانی مسلمان تاریخ کے کس موڑ پر آج یاد کئے جاتے۔ ملک و ملت کے ان مخلص اور درد مند راہنماؤں نے برادرانِ وطن سے تحریک آزادی میں اپنی زبردست قربانیوں کا صلہ کبھی نہیں مانگا انہوں نے خود داری اور وقار کے ساتھ ان راہنماؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلمانان ہند کے تمام مسائل خوش اسلوبی سے انجام دیئے جن کے ساتھ وہ جنگ آزادی میں ان کے شانہ بشانہ ان سے کہیں زیادہ آزادیٔ ہند کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے قربانیاں پیش کر چکے تھے اور اس کا حال انھیں معلوم تھا۔ اس لئے ہندوستانی مسلمان بڑی حد تک ان راہنماؤں کے سایۂ راہنمائی میں اپنے کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے رہے ہیں۔ اور آزاد ہندوستان میں باوجود پاکستان کے وجود آنے کے عزت و توقیر کے ساتھ اپنے جائز حقوق منواتے ہوئے مسلمان موجود ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ موجود رہیں گے۔

مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ نے ۱۹۳۸ء میں دہلی میں ادارہ ندوۃ المصنفین قائم کیا جس کا مقصد ہندوستان میں علوم اسلامیہ شرقیہ عربیہ کی اشاعت کرنا تھا۔ اور اس میں انھیں زبردست کامیابی نصیب ہوئی۔ اردو عربی اور فارسی میں ادارہ ندوۃ المصنفین نے اپنے بانی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی سرپرستی میں وہ بھاری بھرکم لٹریچر شائع کیا جسے دیکھ کر پڑھ کر عالم اسلام کی بڑی بڑی مقتدر ہستیاں داد تحسین دینے پر مجبور ہوگئیں اور انھیں حیرت تھی کہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک میں اسلامی علوم وفنون پر نایاب ونادر اور معیاری لٹریچر شائع ہوا۔ مفتی صاحبؒ کے خلوص لگن ایثار کی بدولت بڑے بڑے علما ادارہ ندوۃ المصنفین سے وابستہ ہونے میں فخر و شان محسوس کرنے لگے۔

جس طرح علم دین کی خدمت کے لئے انہوں نے ادارہ ندوۃ المصنفین قائم کیا اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مسلم مجلس مشاورت کے نام سے ایک ایسا سیاسی پلیٹ فارم بھی ان کی کوششوں سے عالم وجود میں آیا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان میں اپنی اہمیت اور طاقت و قوت کا احساس دلایا اور جس کی سنجیدہ قیادت کو برادران ملک کے بڑے بڑے دانشوروں نے بھی تسلیم کیا۔ مفتی صاحبؒ کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کا سانحہ پیش نہیں آتا۔ مگر یہ قدرت کا حکم تھا اور اس کے حکم کے آگے تو کسی کا بس چل ہی نہیں سکتا ہے۔

خیر یہ سب کچھ تو حضرت مفتی صاحبؒ کے ملک وملت کے لئے عظیم الشان کارنامے تھے ہی جس کا ذکر اس وقت خواہ مخواہ ہوگیا۔ میرا اپنے قبلہ اباجان حضرت مفکر ملت کی اس خانگی زندگی کا ذکر کرنا ہے جس سے ہم سب کا روزمرہ کا واسطہ وسابقہ پڑتا رہتا تھا۔ اور جب ان کی ان معنوں میں یاد آرہی ہے تو مجھے یہ کہنے دیجیے کہ حضرت قبلہ اباجان (ہم سب بھائیوں کی زبان پر یہی نام ان کے لئے چڑھا ہوا تھا) ایک مثالی شوہر تھے ایک مثالی باپ تھے، ایک مثالی بھائی تھے اور ایک مثالی پڑوسی تھے۔ ہماری والدہ مرحومہ فرمایا کرتی تھیں کہ

مفتی صاحبؒ شروع ہی سے بڑے سیدھے سادھے اور بھولے تھے۔ ان کی ذات سے کبھی کسی کو کسی بھی طرح کی اذیت نہیں پہنچی بارہا ان کے گھر میں موجود خادموں سے بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوئیں مگر انہوں نے ہمیشہ درگذر کیا بعض اوقات خادموں کی نافرمانیوں اور دانستہ غلطیوں کی وجہ سے ہم سب کو اور خود مفتی صاحبؒ کو بھی بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی تھی مگر جب خادموں سے باز پرس کا موقع آتا تو ان کی نرم مزاجی ان کے لئے سینہ سپر ہوکر ان کا دفاع ہی کرتی جس سے ہمیں ان پر جھنجھلاہٹ بھی ہوتی مگر احتراماً ہمیں خاموشی اختیار کرنی پڑتی۔ انہیں کبھی غصہ میں ہم نے نہیں دیکھا گھر میں دستک دے کر ہی داخل ہوتے۔ وہ ہر کام میں وقت کی پابندی کو ملحوظ رکھتے اور ہمیں بھی وقت کی پابندی کرنے کی تاکید کرتے۔ نماز باجماعت مسجد میں جاکر ادا کرتے اور اس میں اس حد تک ان کی سختی تھی کہ اگر بیمار ہیں، بخار میں تپ رہے ہیں تب بھی مسجد ہی میں نماز باجماعت ادا کرتے کڑاکے کی سردی میں عشاء و فجر کی نمازیں مسجد میں ادا کرنے جاتے اور سنتیں یا دو نفل گھر آکر ادا کرتے۔ دعا میں خصوصیت سے خشوع و خضوع کے ساتھ دیر تک مشغول رہتے۔ والدہ مرحومہ فرماتیں تھیں کہ ہماری ازدواجی زندگی میں کبھی بھی ناچاقی نہ ہوئی رنجش اور کسی قسم کی ناراضگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا گھر میں روکھا سوکھا کھانا بھی ہوتا تو اسے بڑے شوق سے کھاتے۔ کھانے میں کبھی نقص نہیں نکالتے۔ گھر میں مہمانوں کا آنا جانا رہتا ہی تھا۔ مہمانوں کے ساتھ اتنی مصروف زندگی کے باوجود وقت اچھا خاصہ بتاتے تھے۔ ان کی ناز برداری میں لگے رہتے تھے بھائی سے برتاؤ بڑا ہی مشفقانہ رہتا تھا۔ اور بھائیوں کے بچوں کے ساتھ بڑا ہی شفیقانہ سلوک کرتے بیٹی داماد کی تربیت و خاطرداری میں لطف و حظ محسوس کرتے اپنے بچوں کے تمام مسائل سے آگاہی و واقفیت رکھتے۔ اور ان کی حسب عادت و قابلیت اپنے مفید مشوروں و ہدایتوں سے خیر خواہی و تربیت کرتے تھے۔ مایوسی اور بددلی کو وہ کفر کہتے تھے۔ جب میں امتحان میں بار بار فیل ہوتا رہا تو مجھے ایکدن انہوں نے بڑی مایوسی کی حالت میں سر پکڑے ہوئے دیکھا پوچھا بیٹا کیا ہوا تم کیوں پریشان ہو کیا فیل ہونیکی

وجہ سے تم نے اپنی یہ پریشان کن حالت بنا رکھی ہے؟ تو سنو بیٹا! فیل ہونا واقعی اچھی بات نہیں ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے تمہیں ان ہی مضمونوں اور کتابوں کو زیادہ پڑھنے کا موقع ملے گا اس سے یقیناً تمہاری قابلیت میں اضافہ ہوگا لہذا اسے تم قدرت کی طرف سے اپنی قابلیت بڑھانے اور اس میں اضافہ کرنیکا ایک اور موقع سمجھو۔ اور جب میں نے ان کے یہ الفاظ سنے تو میری مایوسی اور پریشانی ایکدم ختم ہوگئی اور دل و دماغ تازہ ہوگیا۔ گھر کا کوئی بھی فرد بیمار ہوتا تو قبلہ ابا جان کی محبت و ممتا دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی حکیم یا ڈاکٹر کو بلواتے دوا خود پلاتے اور تیمار داری بھی دیر تک کرتے رہتے کسی کے سر میں درد ہوتا تو دبانے جاتے اور آیت قرآن پاک پڑھتے جاتے اپنے ہاتھوں سے پرہیزی کھانا کھلاتے۔ اور مرض سے شفایابی کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں نفل شکرانہ ادا کرتے۔ اگر کبھی خود بیمار ہوتے تو اپنی خدمت کسی سے نہ لیتے بلکہ اپنی خدمت خود ہی حتی الامکان کرتے کسی کو بھی تکلیف دینا انہیں گوارہ ہی نہ تھا نماز جمعہ اور نماز عیدین کے لئے سب بچوں کو ساتھ لیجا کر جامع مسجد اور عیدگاہ میں ادا کرتے عید پر سب بچوں کو انکے حسب استحقاق عیدی دیتے۔ جب کوئی مہمان نہ ہوتا تو ناشتہ کھانا گھر ہی میں سب کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھاتے۔ قبلہ ابا جان کی تربیت نے سب بہن بھائیوں کو نماز پنجگانہ کا سخت پابند بنا دیا تھا چنانچہ فجر کی نماز کے لئے سب بہن بھائی اور والدہ صاحبہ ایک گھنٹہ قبل اٹھ کر بیدار ہو جاتے ضروریات سے فراغت کے بعد وضو کر کے نماز فجر ادا کرنے ہم سب بیٹوں کے ساتھ مسجد میں جاتے والدہ اور ہمشیرہ گھر ہی میں نماز ادا کرتیں نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن پاک کا التزام تھا اس کے بعد ہی ناشتہ وغیرہ کرتے۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد قبلہ ابا جان دفتر جا کر اخبارات کا مطالعہ کرتے اور آنے والوں سے ملاقات کرتے، ان سے گفتگو کرتے ان کے مسائل کا کوئی مفید مثبت حل بتاتے، گھر میں جب بھی گھر کے افراد کے درمیان میں ہوتے تو سیرت رسول صلعم اور صحابہ کرام کے واقعات ایسے دلنشیں انداز

میں ہمیں سناتے کہ آج جب ہم انہیں یاد کرتے ہیں تو احترام و ادب کے ساتھ ہمارا سر جھک جاتا ہے اور دل سے ان کے لیے بارگاہ عالی میں دعاؤں کا سرور شروع ہو جاتا ہے۔ انکی شخصیت کے ذریعہ انکے ملنے والوں نے ان کے عزیز و اقارب نے اللہ کے فضل سے بے انتہا فوائد حاصل کیے ہیں کتنے بے روزگاروں کو ان کے نام کی برکت اور سفارش سے سرکاری نوکریاں ملیں جو آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ جلیل القدر منصب ان کے ذریعہ حاصل کیے مگر کبھی انہوں نے اپنی اولاد کو کسی سفارش سے نہ نوکری دلوائی اور نہ کوئی کاروبار کرایا فرمایا کرتے تھے کہ اگر اولاد کسی قابل ہو گی تو خود بخود اللہ پاک انھیں انکے مرتبہ پر تفویض فرمائے گا۔ اور یہ ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا ہی فیض ہے کہ ہم نے قبلہ اباجان کے نام کو کبھی ذاتی فائدہ کے لیے استعمال کرنا مناسب نہ سمجھا ان کی حد درجہ نرمی و شفقت ہی ہمارے لئے بیش بہا سرمایہ سے کم نہ تھی ایسے مشفق اور نیک دل اور نیک سیرت اور مثالی کردار والے باپ کے ہم بیٹے ہیں ہمارے لئے یہ ہی فخر و ناز کی بڑی بات ہے اور جسے ہم اپنی زندگی کے لیے بہترین سرمایہ سمجھتے ہیں اور انشاء اللہ سمجھتے رہیں گے!

حضرت قبلہ اباجان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مجھ احقر راقم کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں رسالہ برہان اور ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کو حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے شایانِ شان قائم رکھنے کے لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا حالانکہ حاسدین، مخالفین کے ناپاک منصوبے بھی اپنی جگہ خفیہ طریقہ سے جاری تھے رسالہ "برہان" دہلی میں اہل علم کے اسمائے گرامی شائع کئے جا رہے ہیں تو وہ بھی اسی وجہ سے کہ ایک تو ان پر حضرت مفتی صاحبؒ کی نظر التفات رہتی تھی دوسرے ان میں ہمیں مفتی صاحبؒ قبلہ کی خوشبو کی جھلک آتی ہے

بہر حال حضرت قبلہ اباجان مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ اس صدی کی عظیم و نادر شخصیت و ہستی تھے جو اپنی عظیم الشان علمی قومی و ملی خدمات کی بدولت صدیوں تک احسان شکر گزاری کے ساتھ عوامی دلوں میں یاد رہیں گے۔ اور آنیوالی نسلیں انکے کارناموں پر فخر محسوس کرتی رہیں گی

قسط ۱

قطعاتِ وفاتِ شعرائے اردو

عبدالرؤف خاں ایم اے ہسٹری۔ اودی کلاں (سوائی مادھوپور) راج ۳۲۲۳۰۱

اردو ادب میں قطعاتِ تاریخ کی افادیت و اہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں خصوصاً جب کسی شاعر کے سالِ وفات میں اختلاف ہو یا معلوم ہی نہ ہو تو اس صورتِ حال میں قطعۂ تاریخ گوہرِ مقصود کا کام دیتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی نے کہا ہے کہ "تاریخ ادب اردو کی تدوین میں قطعات تاریخ سے غیر معمولی استفادہ کیا گیا ہے ۔۔۔۔۔ اردو کے بہت سے شاعروں کی وفات کا علم آج ہرگز نہ ہو سکتا، اگر اتفاقاً کوئی شاعر ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ نہ نظم کر گیا ہوتا اس طرح قطعات تاریخ گویا فن کاروں کا تحفہ ہیں جو آئندہ آنے والے مورخین کے لیے چھوڑ گئے ہیں"[1]

مذکورہ بیان کی روشنی میں پیش ہیں اردو شعرا کی وفات کے قطعاتِ تاریخ۔ بعض شعرا کی وفات کے دو۔ دو تین قطعات محض اس خیال سے لکھے جاتے ہیں کہ شاید وہ کسی ریسرچ اسکالر کے لیے مفید مطلب ثابت ہوں اگرچہ اس سے مضمون کی طوالت ضرور بڑھ جائے گی۔ یہ سلسلہ ہم اردو کے پہلے مجدد شاعر ولی دکنی سے شروع کرتے ہیں۔ جو اپنے دور

---

[1] نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۷۶ء ص ۵۵

کا سب سے بڑا اردو شاعر تھا۔

ولی: بقول نصیر الدین ہاشمی ولی کا صحیح نام ولی محمد تھا[1]۔ لیکن محققین کے نزدیک انکے نام میں اختلافات ہیں[2]۔ ان کے سال ولادت کے بارے میں بھی معلومات کا فقدان ہے۔ اسی طرح انتقال کے متعلق بھی مختلف بیانات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ۱۱۵۵ھ میں رحلت کی بعض ۱۱۴۳ھ تسلیم کرتے ہیں جبکہ بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب کے دریافت کردہ قطعہ ذیل سے ۱۱۱۹ھ سال وفات قرار پاتا ہے۔

مطلعِ دیوانِ عشق سید ارباب دل　　والیِ ملک سخن صاحب عرفاں ولی
سالِ وفاتش خرد از سرِ الہام گفت　　"باد پناہِ ولی ساقی کوثر ولی[4]"

(۱+ ۱۱۱۸ = ۱۱۱۹ھ/ ۸-۱۷۰۷ء)

لیکن ممکن ہے کہ یہ قطعہ ولی اورنگ آبادی کی وفات سے تعلق رکھتا ہو[5]۔ کیونکہ ولی دکنی کا سالِ وفات اب عام طور پر ۱۱۵۵ھ تسلیم کیا جانے لگا ہے چنانچہ بعد کے تاریخ گو شعرا نے اپنے قطعات میں ۱۱۵۵ھ کے مادے ہی موزوں کئے ہیں، مثلاً حکیم رحمت بنارسی رحمت نے قطعہ ذیل موزوں کیا:

ولی کی دھوم ہے بزم سخن میں　　ہر اک شاعر کو پہنچا فیض ان سے
لکھو اُنکی فوت کی تاریخ رحمت
"ولی بے طبع استاد اولیں تھے[6]" ۱۱۵۵ھ/ ۴۳-۱۷۴۲ء

---

[1] دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۳۰۱ ۱۹۸۵ء نئی دہلی [2] برائے اختلافات نام ملاحظہ ہوں تاریخ ادب اردو از جمیل جالبی ص ص ۵۳۲ تا ۵۳۴، تاریخ ادب اردو (مترجم) از رام بابو سکسینہ ص ص ۷۱ تا ۷۳، ۱۹۸۶ء لکھنؤ اور سخنورانِ گجرات از سید ظہیر الدین مدنی ص ص ۸۴ تا ۸۷ [3] جمیل جالبی ۵۳۵ ظہیر الدین مدنی ص ۸۶ [5] رام بابو سکسینہ ص ۷۳ [6] رہنمائے تاریخ اردو از محمد عبد القادر ص ۳۴ معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۳۸ء

خان بہادر سید مسعود حسن خان مسعود نے بھی اپنے قطعہ کے مادہ سے ۱۱۵۵ھ ہی برآمد کیا ہے :-

ولی دکنی پہنچے جناں میں سوئے عقبیٰ گئے از دارِ دنیا
بنائے شاعری کا ملک بھر میں اُن ہی کے سر رہا مسعود سہرا
برائے سال رحلت آپ لکھ دیں
کہ ہجری سال "طوطی شکر خا" ۱۱۵۵ھ [7]

محمد عبدالقادر قادر کے قطعۂ وفاتِ ولی کا مخبر سال رحلت کا مادہ بھی ۱۱۵۵ھ ہی بہم پہنچاتا ہے :-

چل بسے ہیں اب ولی استاد بھی ہو گئے دل شاعروں کے پاش پاش
ملہم غیبی نے قادر سے کہا سال رحلت آپ لکھئے "جانخراش" ۱۱۵۵ھ [8]

دکن نے اردو کی آغوش میں دو مایۂ ناز اولادیں چھوڑی ہیں۔ ان میں پہلا قابلِ احترام نام حضرت ولی کا ہے۔ جنکی عزت اردو غزل کے باوا آدم کی حیثیت سے رہتی دنیا تک قائم رہے گی اور دوسری ہستی جو اس خاکِ پاک سے اٹھی وہ حضرت سید شاہ سراج الدین حسینی اورنگ آبادی کی ہے۔[9] سراج کی غزل کا مشہور مطلع ہے :-

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی [10]

---

[7] عندلیب تواریخ! از خان بہادر مسعود حسن مسعودؔ ص ۴۶، ادارہ انیس اردو الہ آباد ۱۹۶۲ء

[8] رہنمائے تاریخ اردو ص ۳۵-۳۴

[9،10] کلیات سراج مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری ص ۲۶ و ۵۱ مطبوعہ ۱۹۸۲ء نئی دہلی۔

اس درویش صفت شاعر کی رحلت جو دنیوی جاہ و حشمت سے متنفر تھا ۴ر شوال ۱۱۷۷ھ[۱۱] میں ہوئی۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی (ف ۱۲۰۰ھ) اور ان کے بھتیجے میر اولاد محمد ذکا[۱۲] کے علاوہ منشی لچھمی نرائن شفیق (م ۱۲۲۳ھ) نے جنکو علامہ غلام علی آزاد بلگرامی سے شرف تلمذ حاصل تھا، درج ذیل قطعۂ تاریخ لکھتے ہوئے نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

سیدِ حق پرست معنیٰ سنج | کہ از و یافت شعر حسن رواج

سالِ نوتش شفیق کرد رقم

"روبر جاں نمود شاہ سراج"[۱۳] ۱۱۷۷ھ/ ۷ر اپریل ۱۷۶۴ء

حضرت جانِ جاناںؒ:۔ حضرت میرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی ولادت ۱۱۱۲ھ بمقام کالا باغ صوبۂ مالوہ میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد مرزا جان عالمگیری منصب دار تھے۔ اورنگ زیبؒ نے والد کے نام کی مناسبت سے ان کا جانِ جاں رکھا کیونکہ بیٹا باپ کی جانِ جاں ہوتا ہے۔ کثرتِ استعمال سے یہ جانِ جاناں ہوگیا جو موصوف کی عرفیت ہے، نام شمس الدین اور تخلص مظہر ہے درج ذیل دو مشہور شعر آپ ہی کے ہیں:۔

[۱۴]
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے | اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

اور

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے[۱۵]

---

[۱۱] برائے قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو حوالۂ سابق ص ۷۰۔ [۱۲] ذکا کے حالات تاریخ شعر کے لئے دیکھئے تین تذکرے مرتبہ پروفیسر نثار احمد فاروقی ص ۲۳۶ مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۸ء [۱۳] حوالہ ماقبل ص ۲۳۶

[۱۴] تذکرہ شورش (رموز الشعراء) از علام حسین شورش مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی ص ۸۱ ھم لکھنو ۱۹۸۴ء

[۱۵] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا مؤلفہ سعادت خاں ناصر مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی ص ۸۴ لکھنؤ ۱۹۷۱ء

آپ کا کلام اردو زبان کی تاریخ ارتقا میں ایک خاص مقام کا حامل ہے، جیسا کہ تقریباً سوا دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی مذکورہ دونوں اشعار کی معنویت سے ثابت ہے کہتے ہیں کہ آپ کی شہادت میں نجف خاں کا ہاتھ تھا۔ بہرحال یہ افسوسناک واقعہ ماہ محرم کی دسویں تاریخ ۱۱۹۵ھ میں رونما ہوا۔ ساتویں محرم کو ایک تعزیہ پرست نے آپ کو قرابین (چوڑے منہ کی چھوٹی بندوق) مار کر زخمی کیا۔ تین دن تک نہایت صبر و استقلال کے ساتھ زندہ رہے اس دوران اپنے ہی اشعار بار بار پڑھتے تھے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن	خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نیز یہ اگرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا	لیکن اس جور و جفا کا بھی سزا وار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بیکس افسوس	کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا[۱۶]

میر قمر الدین منت (م ۱۲۰۸ھ) نے حدیث پاک "عاش حمیداً مات شہیداً" (اچھے اخلاق پر زندہ رہا اور شہادت کی موت پائی) سے شہادت کا سال ۱۱۹۵ھ حاصل کیا۔[۱۷] (۳) مادہ پر ایک اور صاحب کو بھی توارد ہوا۔

آں قبلۂ ارباب تقی "عاش حمیداً"	واں قدوۂ ارباب سخا "مات شہیداً" ۱۱۹۵ھ

مجموعۂ ہر دو صفتِ سال وفاتش[۱۲۲]	مظہر رضی اللہ لقد کان سعیداً[۱۸] (۶۱)

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی (ف	) نے اپنے مرشد کا سنہ شہادت آیت شریفہ اولئک مع الذین انعم اللہ[ھ] (وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا ہے) بے کم و کاست

---

[۱۶] گل رعنا از مولانا عبد الحئی ص ۱۳۳

[۱۷] ملہم تاریخ ترجمہ بلخص تسلیم مترجم سید اقتدار احمد سہسوانی ص ۶ مراد آباد ۱۹۱۲ء

[۱۸] غرائب الجمل از نواب عبد العزیز ولا مدراسی ص ۷۶ ۳ عزیز المطابع حیدر آباد ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء

[ھ] سورۂ نساء آیت: ۶۹ -

۱۱۹۵ھ برآمد کرتے ہوئے آیت پاک کو نواشعار کے مرثیہ میں منظوم کیا۔ حضرتؒ کے شاگرد حسان اللہ بیان نے "مظہر کی" مادہ حاصل کیا۔ اردو کے مقتدر شاعر مرزا محمد رفیع سودا نے بزبان اردو قطعہ ذیل کہا جس میں قاتل کی مذمت کی گئی ہے۔

مظہر کا ہوا جو قاتل اک مرتدِ شوم | اوران کی ہوئی خبر شہادت کی عموم
تاریخ وفات ان کی بھی باروئے درد | سودا نے کہ ہائے جانِ جاناں مظلوم[۲۰] ۱۱۹۵ھ

سودا:۔ حضرت جانِ جاناںؒ کی شہادت کے تقریباً پانچ چھ ماہ بعد ہی اردو کے مسلم الثبوت استاد مرزا محمد رفیع سودا (ولادت ۱۱۱۵ھ تا ۱۱۱۸ھ کے درمیان) بھی اِس جہانِ فانی سے ۲ رجب ۱۱۹۵ھ کو راہی آخرت ہوئے۔ جن کے بارے میں مولانا محمد مبین چریا کوٹی کیفی فرماتے ہیں کہ "مرزا جب قصیدہ پیش کرتے ہیں تو شکوہِ الفاظ کے ڈنکے بجادیتے ہیں۔ غزل سناتے ہیں تو دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں مرثیہ پڑھتے ہیں تو سامعین کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ ہجو کرتے ہیں تو حریفوں پر ہستی تنگ کر دیتے ہیں"[۲۱] مرزا کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی صنفِ شاعری کو نہیں چھوڑا، سب کچھ کہا اور خوب کہا۔ ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ مرتے وقت زبان پر یہ شعر تھا۔

آج سودا جہاں سے اٹھتا ہے | شور و غل ہر مکاں سے اٹھتا ہے

اِس سرورِ شاعرانِ ہند کی رحلت پر فخرالدین ماہر نے قطعۂ تاریخ کہکر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے | فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پائے عناد | "شاعرانِ ہند کا سرور گیا"[۲۲] ۱۱۹۹-۴=۱۱۹۵ھ

۱۹؎ ملہم تاریخ ص ۵۱۔

۲۰؎ علمائے ہند کا شاندار ماضی ۲/۷۰ مصنفہ مولانا محمد میاںؒ نیز تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت خاں ناصر مرتبہ ڈاکٹر شمیم ص ۸۳۔

۲۱؎ جواہر سخن ۲۱، ۲۴۵ مولفہ مولانا محمد مبین کیفی چریا کوٹی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۵ء

۲۲؎ تذکرۂ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی ص ۱۳۴ لکھنؤ ۱۹۸۵ء

قیام الدین قائم چاند پوری (م ۱۲۱۰ھ) نے بڑا پُرسوز تاریخی مرثیہ کہا:-

آہ مرزا رفیع دنیا سے　　جا کے جنت میں جب مقیم ہوا

دردِ فرقت سے اس کے شقِ قلم　　اہلِ معنی کا دل دو نیم ہوا

گل سے تا خار اس چمن میں جو تھا　　خاک برسر وہ جوں نسیم ہوا

سال تاریخ کی تھی مجھ کو تلاش　　کیونکہ بس حادثہ عظیم ہوا

اس میں پیرِ خرد نے از سرِ یاس

یہ کہا: "آب سخن　　یتیم ہوا"[۲۳]　۱۱۸۵ + ۱۰ = ۱۱۹۵ھ

منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے قیامِ تاریخ اور ماہ کی صراحت کے ساتھ قطعہ

یل کہا:-

لکھنؤ میں جو میرزائے رفیع　　چوتھی رجب کی، جان میں گذرے

جبکہ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوئی تاریخ

"ہائے سودا جہان میں گذرے"[۲۴]

شفیق کے مادہ سے ۱۱۹۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ ایک عدد کے تخرجے کا بھی قطعہ میں

وئی قرینہ نہیں ہے۔ سودا کی وفات کے فارسی قطعات سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔

ارا مقصد بھی ممکنہ حد تک یہی ہے کہ ہر شاعر کی وفات کے صرف اردو زبان میں کہے

ئے قطعات میں پیش کیے جائیں، ہاں فراہم نہ ہو سکے تو فارسی زبان کے قطعات

جبوری لکھے جائیں گے یا ضروری معلومات بہم پہنچانے کے لیے۔

درد:۔ خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا۔ مشہور بزرگ خواجہ ناصر عندلیب کے

لف الصدق تھے۔ ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، جیسا کہ ستاتھ سنگھ بیدار کے

---

[۲۳] تین تذکرے مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ص ۲۳۶ مکتبہ برہان دہلی اشاعت اولین ۱۹۶۸ء

[۲۴] جمیل جالبی جلد دوم حصہ دوم صہ ۶۵۸

قطعۂ تاریخ ولادت سے تصدیق ہوتی ہے:

از حضرتِ دردِ عارف یزدانی گہوارۂ آفاق چو شد نورانی
بیدارِ نویدِ سالِ تاریخش گفت آمد بوجود نقشِ بندِ ثانی ۱۱۳۳ھ

دردؔ اپنے پدرِ بزرگوار خواجہ ناصر عندلیب (م ۱۱۷۲ھ) کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ حضرت دردؔ وحدت الوجود کے قائل اور فن موسیقی کے ماہر تھے وہ پہلے شاعر ہیں جن کے فیض سے اردو تغزل کو محبوبِ حقیقی کے حسن و کرشمہ کا جلوہ گاہ بنا دیا۔ چھیاسٹھ سال کی عمر میں، جیسا کہ خود انکی پیشین گوئی تھی، ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ میں روز جمعہ وصال ہوا۔ نیاز احمد نیازؔ سرہندی نے اردو زبان میں قطعۂ تاریخ انتقال کہا:۔

حضرتِ دردؔ نے جس وقت کیا نقلِ مکاں ہوگیا دردِ جدائی سے جہاں پر آشوب
گرچہ اس گریۂ غم سے تو نہ تھا دل کو فراغ سالِ تاریخ کو جو عذر کیا دل سے خوب

ہاتفِ غیب سے اک بارگی آئی یہ ندا[26]
"حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب" ۱۱۹۹ھ

دردؔ کے دوست میر محمدی بیدارؔ دہلوی (م ۱۲۰۹ھ) نے فارسی میں جو تاریخ کہی وہ دردؔ کی وفات کے بارے میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس سے ہمیں وفاتِ دردؔ کا وقت روز، تاریخ اور ماہ کی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ البتہ عمر اڑسٹھ سال کی اطلاع درست نہیں۔

آفتابِ امتِ دینِ محمدؐ، خواجہ میر مظہرِ علمِ علیؑ[27] و وارثِ اثنا عشر

---

[25] حوالہ مذکور ص ۷۲۵۔

[26] ماہنامہ آجکل نئی دہلی جنوری ۱۹۸۶ء ص ۱۱ بحوالہ مجموعہ نغز از قدرت اللہ قاسم نسخہ خدا بخش گھر جمیل جالبی نے اس قطعہ کو ہدایت اللہ ہدایت (۲/۷۲۵) سے منسوب کیا ہے۔

[27] تصوف کے ایک سلسلے کے علاوہ تمام سلاسل کا شجرہ حضرت علیؑ پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔ علامہ تمنا عمادی ایسے صوفیا کو جنکا رجحان مسلک کی اثنا عشر کی طرف ہوتا تھا، شیعوں کے خالہ زاد بھائی کہا کرتے تھے۔

حضرتِ سید آنکہ از دردِ فراق عندلیب — نالۂ یا غرش نی کرد بر دلہا اثر
چون نکرد دنیا بہ شصت و ہشتم سالگی — جانبِ اعلاءِ علیین او کردہ سفر
بندۂ بیدار کان ہست از غلامانش یکے — گشت از وقتِ وصالِ در روز و ماہش چو خبر
نیمہ ہر شب ماندہ ہاتف کرد واویلا و گفت — "ہائے بود آدینہ و بست و چہارم از صفر"[۲۸] ۱۱۹۹ھ

قائم :- شیخ قیام الدین نام، عرفیت محمد قائم اور تخلص قائم تھا، چاند پور ضلع بجنور کے باشندہ تھے۔ ابتدا میں درد اور بعد کو سودا کے شاگرد ہوئے۔ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ نمونتہً ان کے دو مشہور خلائق اشعار ملاحظہ ہوں :-

ٹوٹا جو کعبہ کونسی یہ جائے غم ہے شیخ — کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
نیز قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جاکر کہاں کمند — کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا[۲۹]
دل ڈھونڈھنا ہے سینے میں مرے بوالعجبی ہے — اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

(تین تذکرے ص ۱۰۳)

بمقام رامپور ۱۲۰۸ھ میں قائم نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ شاہ کمال کی فرمائش پر جرأت نے رباعی مستزاد میں تاریخ لکھی۔

جب سیلِ فنا ملکِ عناصر میں بہی — آکر ناگاہ
قائم کے جو تن کی تھی عمارت سو ڈھہی — لی زیست نے راہ
جرأت نے کہی رو کے یہ تاریخِ وفات — یکتائی کے ساتھ
"قائم بنیادِ شعرِ ہندی نہ رہی (کذا نسرہی) — کیا کہیے اب آہ"[۳۰] ۱۲۰۸ھ

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کہتے ہیں کہ "اس قطعے میں کہیے کے اعداد (۴۵) اور آہ کے (۷)

---

۲۸ دیوانِ بیدار بہ تصحیح جلیل احمد قدوائی مقدمہ ص ۶ ہندوستانی اکیڈمی یوپی۔ الہ آباد ۱۹۳۷ء

۲۹ جواہر سخن ۱۲ ۲۰۶ و ۲۰۹

۳۰ تین تذکرے ص ۸

شمار کریں تو ۱۲۰۸ھ مستفاد ہوتا ہے۔[31] یعنی "آہ" میں الف ممدودہ کے دو عدد لیتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ قطعہ ایک عدد کے تدخلے سے کہا گیا ہے، جس کا واضح قرینہ تیسرے مصرعے کے فقرے "یکتائی (یعنی ایک) کے ساتھ" میں موجود ہے۔

سوز:۔ میر محمد نام اور تخلص سوز تھا۔ ابتدا میں میر تخلص اختیار کیا تھا۔ لیکن جب میر تقی میر کی شہرت ہوئی تو پھر اپنا تخلص سوز کر لیا۔ شعر گوئی کے علاوہ لطیفہ گوئی، خوش نویسی تیر اندازی و اسپ سواری میں بھی یکتائے روزگار تھے اور بزرگی و درویشی میں بھی ممتاز جائے ولادت دہلی ہے (۱۱۳۶ھ) اور انتقال اسی سال کی عمر میں لکھنؤ میں ۱۲۱۳ھ میں ہوا۔ ناسخ و جرأت نے تاریخیں موزوں کیں۔

اٹھ گیا میر سوز دنیا سے — ہائے صاحب کمال واویلا (ہ)
سالِ تاریخ ہے یہی ناسخ — شاعرِ بے مثال واویلا[32] (ہ) ۱۲۱۳ھ

قلندر بخش جرأت نے دو قطعات کہے:

کی جو ہیں میر سوز نے رحلت — گردن انداز کی دو نیم ہوئی
نکلی تاریخ بے سرِ انداز — آہ ادائے سخن یتیم ہوئی[33] (۱۲۱۴ − ۱ = ۱۲۱۳ھ)

دوسرا مبسوط قطعہ یہ ہے:۔

سوز ماتم نے میر سوز کے آہ — شمع ساں بس جلا دیا دل کو
میر صاحب سا شخص جو مر جائے — غم ہوا ہائے یہ بڑا دل کو
مٹ گیا لطفِ ریختہ گوئی — خاک پھر دے سخن مزا دل کو

---

[31] تین تذکرے ص ۸ [32] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۷، جس میں ہائے ہوز آخر حذف ہے نیز ملاحظہ ہو دیوانِ ناسخ (نسخۂ بنارس ص ۱۳۹ تقدیم ڈاکٹر حنیف نقوی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (عکسی ایڈیشن) ۱۹۹۷ء [33] تین تذکرے ص ۷۷

خاک میں مل گئی ادا بندی گفتگو اب خوش آئے کیا دل کو
کہی جرأت نے رو کے یہ تاریخ "داغ اب سوز کا لگا دل کو"[34] ۱۲۱۳ھ

تنہا :- محمد عیسیٰ نام اور تنہا تخلص تھا۔ دلی میں پیدا ہوئے۔ بعد میں لکھنؤ آگئے۔ ناسخ سے نہایت الفت تھی۔ مصحفی کے اشعار پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ لکھنؤ میں رحلت (۱۲۲۲ھ) کی۔ ناسخ نے حسب حال تنہا کی تاریخ کہکر حق دوستی ادا کیا:

مونس جان حزیں دشت بلاخیز میں آہ اٹھ گیا سوئے عدم چھوٹ کے ہم کو تنہا
کلک ناسخ نے لکھا مصرع تاریخ وفات "آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا"[35] ۱۲۲۲ھ

جرأت :- جرأت تخلص اور اصل نام یحییٰ امان مگر مشہور نام شیخ قلندر بخش تھا ولادت بمقام دہلی ۱۱۶۲ھ/ ۴۹-۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ بچپن فیض آباد میں گذرا۔ مرزا جعفر علی حسرت لکھنوی (۱۲۰۶ھ) کے شاگرد تھے۔ شاعری کے علاوہ فن موسیقی اور علم نجوم میں بھی ماہر تھے۔ لکھنؤ میں وفات پائی ناسخ نے تاریخ کہی، جس کے مادہ سے ۱۲۲۵ھ مستفاد ہوتا ہے:

جب یہاں جرأت کا باغ دہر سے گلشن فردوس کو جانا ہوا
مصرع تاریخ ناسخ نے لکھا "ہائے ہندوستان کا شاعر ہوا"[36] ۱۲۲۵ھ

لیکن مصحفی اور راجہ جسونت سنگھ پروانہ کے قطعات ذیل سے ۱۲۲۴ھ حاصل ہوتا ہے اور بقول قاضی عبدالودود صاحب ۱۲۲۴ھ ہی درست ہے[37]:

جب قلندر بخش جرأت مر گیا ریختہ کے دل میں خوں نے کھایا جوش
مصحفی نے یہ کہی سال وفات "ہوگئی کیا بلبل نالاں خموش"[38] ۱۲۲۴ھ

---

۳۴ تین تذکرے ص ۷۷ ۳۵ دیوان ناسخ نسخۂ بنارس ۱۵۱

۳۶ حوالۂ ماقبل ص ص ۵۴، ۱۵۳ ۳۷ ملاحظہ ہو دیوان نوازش حسین خاں نوازش مقدمہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۳ء ۳۸ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۲۱۳ ۔

پیارے لال لکھنوی نے یہ تاریخ لکھی :

جو کہ کرتا ہے فکرِ شعر و سخن		اِس زمانے میں وہ غنیمت ہے
کہ نہ اگلے سے لوگ باقی ہیں		نہ وہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے
اِک سخن گو جو تھا قلندر بخش		نام جرأت سے جس کی شہرت ہے
کر گیا کوچ اس مقام سے حیف		آج منزل نشینِ حسرت ہے

ہے یہ تاریخ اول اور ثانی
کہو "جنت نصیب جرأت ہے"[39]		۱۲۲۴ھ

میر :- خدائے سخن، سرآمدِ سعرا اور امام المتغزلین میر محمد تقی میر جن کا فرمایا ہوا کل بھی مستند تھا اور آئندہ بھی رہے گا ۱۱۳۵ھ/ ۲۳-۱۷۲۲ء میں آگرہ میں عالم وجود میں آئے اور ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء میں بمقام لکھنؤ رہگرائے عالمِ بقا ہوئے۔ غلام ہمدانی مصحفی نے تعمیۂ تدخلے سے تاریخ لکھی :-

وہ محمد تقی میر کہ تھا !		ریختہ میں ہر ایک کا سرتاج
ہندِ جنت نشاں میں رکھی تھی		غزلِ عاشقانہ اس سے رواج
خرمنِ عمر اس کا برقِ اجل		کر گئی جس دم آن کرتا راج

از سرِ درد مصحفی نے کہا ۴
حق میں اُس کے "ہوا نظیری آج" ۱۲۲۱ + ۴ = ۱۲۲۵ھ[40]

اس سرتاجِ ریختہ کی رحلت پہ دوسرا قطعہ احمد علی خاں یکتا نے کہا :

جب دلِ احباب پر موجبِ رنج و الم		واقعۂ جانگداز میر تقی کا ہوا

---

[39] طبقات شعرائے ہند از کریم الدین ص ۱۴۸ اردو اکادمی لکھنؤ ایڈیشن ۱۹۸۳ء
[40] دیوانِ مصحفی صفحہ چھبیس مرتبہ و منتخبہ اسیر لکھنوی و امیر مینائی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۹۰ء

مادہ تاریخ کا میر خرد نے دیا ہیں درد کی رُو سے کہا آج نیٔتری موا ۱۲۲۵ھ

ناسخ نے بزبان فارسی تاریخ کہی، جس کا مادہ ہے:

"وا ویلا مرد شہ شاعراں" ۱۲۲۵ھ

بقول محمد ہدایت اللہ سابق چیف جسٹس بھارت سرکار" ناسخ نے جب میر کی یہ تاریخ وفات برآمد کی تو گو رنج کا اظہار تھا مگر میر کو ایسے نام سے یاد کیا کہ انکا لقب بن گیا کہ وہ بیشک "شہ شاعراں" تھے اور آج تک ان کا فرمایا ہوا مستند ہے"

انشاؔ :۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ ابن میر ماشاء اللہ خاں کے یہاں مرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت نہ معلوم ہے۔ نواب میر قاسم علی خاں کے عہد میں مرشد آباد سے فیض آباد آئے اور پھر شاہ عالم کے دربار میں دہلی آگئے۔ لیکن پھر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء میں وفات پائی۔ انکے شاگرد ایسری سنگھ عرف بسنت سنگھ نشاط نے تاریخ کہی۔

خبرِ انتقالِ میر انشاؔ دلِ غمدیدہ تا نشاط شنفت

سالِ تاریخ او زِ جانِ اجل ۳
عرفی وقت بود انشا گفت ۱۲۳۰ + ۳ = ۱۲۳۳ھ

سید مسعود حسن مسعود نے عمومی نوعیت کا درج ذیل قطعہ کہا:

حضرت انشاؔ ظریف و بذلہ سنج لکھنؤ آکے ہوئے رہتے نذرِ موت

مادہ تاریخ کا مسعود لکھ "مخزنِ خورشید" بہر سالِ فوت ۱۸۱۷ء

ترقی :۔ اسد الدولہ خاں بہادر میرزا محمد تقی نام اور ترقی تخلص تھا نیز عرفیت آغا صاحب

۱؎ کلیاتِ میر مرتبہ ظلِ عباس عباسی ص ۲۹

۲؎ دیوانِ ناسخ ۲: ۳۱۶ مطبع نامی منشی نولکشور بار ششم فروری ۱۸۹۳ء کانپور

۳؎ انشاء اللہ خاں انشاؔ از ڈاکٹر عابد پشاوری (شیام لال کالکڑا) ص ۲۸۰۔

۴؎ عندلیب تواریخ از سید مسعود حسن خاں مسعود ص ۱۰۸، ادارہ انیس اردو الہ آباد ۱۹۶۳ء

[illegible]

[illegible] صاحب کرم ہونگے

[illegible] کے برابر — اہل حشم نہ ہوں گے عالی ہمم ہونگے

[illegible] ماتم سرا ہیں سینے — ہے کون دل کہ جس میں سوفارِ غم ہونگے

[illegible] ہر قلم میسر — اوصاف اُس کے ناسخ پھر بھی رقم ہونگے

[illegible] نہ روز محشر — خلد بریں میں داخل شاہِ اُمم ہونگے

[illegible] مطلع بڑے تاریخ — بس ایک سے زیادہ اعداد کم ہونگے (۱)

"دنیا کے جو مزے ہیں باللہ کم نہ ہونگے

چرچے یہی رہیں گے اے وائے ہم نہ ہونگے"[25] ۱۲۴۵ + ۱ = ۱۲۴۶ھ

ترقی کی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے:-

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے — چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

یارانِ رفتگاں پر کیا روئیں ہم ترقی — کیا ہم روانہ سوئے ملک عدم نہ ہوں گے[26]

ناسخ:- شیخ امام بخش نام تخلص ناسخ تھا۔ اردو کے عظیم شاعر اور طرزِ لکھنؤ کے موجد تھے۔ شیخ خدا بخش سکینہ لاہور جو بسلسلۂ تجارت فیض آباد آتے رہتے تھے۔ ناسخ کو اپنا پسر متبنّیٰ بنایا جب

[25] ذکر و فکر از ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۵۵، الہ آباد ۱۹۸۰ء

[26] تذکرہ ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۵ء لیکن سعادت خاں ناصر نے تیسرے مصرع کی قرائت یہ لکھی ہے: "یارانِ رفتگاں پر کیا روئیں اے ترقی" دیکھئے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۸۵، نیز ایک نسخہ میں "... روتے ہو کیا ترقی" بھی آیا ہے۔ ایضاً حاشیہ ۳۔

[illegible] ناسخ بھی لکھنؤ آگئے۔ مصحفی کو اپنا کلام دکھاتے تھے لیکن بعد میں مشورہ سخن لینا بند کر دیا۔ لکھنؤ میں ہی ۱۲۵۴ھ میں راہی ملکِ بقا ہوئے۔ ان کے شاگرد رشید میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی:

اٹھا مرگِ ناسخ کا غل چار سو سے — گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے

کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت — "دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے" ۱۲۵۴ھ

ان تعلقات وفات سے صرف نظر کرتے ہوئے، مقیم الدولہ راجہ نواب علی خاں سحر والیِ محمود آباد [illegible] کا کہا ہوا اردو زبان کا قطعہ بھی لکھا جاتا ہے، جو شخصی مرثیہ ہے:

[illegible] ہیں سنبل و سوسن سیاہ پوش — مانند لالہ باغ میں ہیں داغ داغ گل

[illegible] ماتم و نالاں ہیں آبشار — مرغِ چمن ہیں نوحہ گر و بے دماغ گل

شبنم سے اشک بار ہیں اشجارِ بوستاں — دل تنگ مثل غنچہ ہیں مابین باغ گل

[illegible] وفات حضرتِ ناسخ ہے جانگزا — رکھتا نہیں ہے رنج و الم سے فراغ گل

بھولا ہے عندلیب کو اب نغمۂ طرب — بلبل کے زمزمے سے اب بے دماغ گل

مصرع یہ اب ہے مرغِ چمن کی زبان پر
"اقلیم شاعری کا ہوا ہے چراغ گل"[47] ۱۲۵۴

آتش: خواجہ حیدر علی آتش ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ایامِ جوانی میں لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ دبستان لکھنؤ کے مشہور و معروف اساتذہ میں تھے۔ لکھنؤ ہی میں بروز چہار شنبہ (بدھ) ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ/۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء میں بوقتِ صبح انتقال ہوا جو اچانک حادثہ تھا۔ مصحفی کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ سید سادات حسین

---

[47] بیاضِ سحر (انیسِ بے نظیر) ص ص ۸۵، ۸۴ در مطبع اودھ پریس لکھنؤ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء

والد کا نام میرزا محمد امین نیشاپوری۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ میر سوز کے شاگرد اور ناسخ کے مولا تھے۔ ۱۲۴۶ھ میں راہی خلد ہوئے۔ ناسخ نے ترقی ہی کی ایک غزل کے مطلع زبان زد خلائق سے بتغیر خفیف تاریخ کہی جو شخصی مرثیے کی اعلا ترین مثال ہے :-

تھے حاتم زمانہ مرزا تقی ترقی	ایسے کہیں جہاں میں صاحب کرم نہ ہونگے
تا حشر اس امیر فیاض کے برابر	اہل حشم نہ ہوں گے عالی ہمم نہ ہونگے
بائے وفات اس نے ماتم سرا ہیں سینے	ہے کون دل کہ جس میں سو خار غم نہ ہونگے
ہوں گے اگر نیستاں بہر قلم میسر	اوصاف اس کے ناسخ پھر بھی رقم نہ ہونگے
لے لیں گے ساتھ اسکو جبتک نہ روز محشر	خلد بریں میں داخل شاہ امم نہ ہونگے
گن اس بلیغ کا یوں مطلع برائے تاریخ	بس ایک سے زیادہ اعداد کم نہ ہونگے (۱)

" دنیا کے جو مزے ہیں باللہ کم نہ ہونگے

چرچے یہی رہیں گے اے وائے ہم نہ ہونگے "[۴۵] ۱۲۴۵ + ۱ = ۱۲۴۶ھ

ترقی کی غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے :-

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے	چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
یاران رفتگاں پر کیا روئیں ہم ترقی	کیا ہم رواں سوئے ملک عدم نہ ہوں گے[۴۶]

ناسخ :- شیخ امام بخش نام تخلص ناسخ تھا۔ اردو کے عظیم شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد تھے۔ شیخ خدا بخش سکینہ لاہور جو بسلسلۂ تجارت فیض آباد آتے رہتے تھے۔ ناسخ کو اپنا پسر متبنیٰ بنالیا جب

---

[۴۵] ذکر و فکر از ڈاکٹر گیان چند جین ص ۱۵۵، الہ آباد ۱۹۸۰ء

[۴۶] تذکرۂ ریاض الفصحا از غلام ہمدانی مصحفی، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۵ء لیکن سعادت خاں ناصر نے تیسرے مصرع کی قرأت یہ لکھی ہے: " یاران رفتگاں پر کیا روئیں اے ترقی" دیکھئے تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ص ۱۸۵، نیز ایک نسخہ میں "... روتے ہو کیا ترقی" بھی آیا ہے۔ ایضاً حاشیہ ۳۔

لکھنؤ دارالخلافت ہوا تو ناسخ بھی لکھنؤ آگئے۔ مصحفی کو اپنا کلام دکھاتے تھے لیکن بعد میں مشورہ سخن لینا بند کر دیا۔ لکھنؤ میں ہی ۱۲۵۴ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کے شاگرد رشید میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی۔

اٹھا مرگِ ناسخ کا غل چار سو سے — گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے

کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت — "ولا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے" ۱۲۵۴ھ

فارسی قطعات وفات سے صرف نظر کرتے ہوئے، مقیم الدولہ راجہ نواب علی خاں سحر والی محمود آباد (م ۱۲۷۴ھ) کا کہا ہوا اردو زبان کا قطعہ بھی لکھا جاتا ہے، جو شخصی مرثیہ ہے:

ژولیدہ مو ہیں سنبل و سوسن سیاہ پوش — مانند لالہ باغ میں ہیں داغ داغ گل

ہر نخل نخلِ ماتم و نالاں ہیں آبشار — مرغِ چمن ہیں نوحہ گر و بید ماغ گل

شبنم سے اشک بار ہیں اشجارِ بوستاں — دل تنگ مثل غنچہ ہیں سا بین باغ گل

از بس وفات حضرتِ ناسخ ہے جانگزا — رکھتا نہیں ہے رنج و الم سے فراغ گل

بھولا ہے عندلیب کو اب نغمۂ طرب — بلبل کے زمزمے ہے اب بید ماغ گل

مصرع یہ اب ہے مرغِ چمن کی زبان پر
"اقلیم شاعری کا ہوا ہے چراغ گل"[۴۶] ۱۲۵۴

آتش:۔ خواجہ حیدر علی آتش ۱۱۹۲ھ/۱۷۷۸ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ایام جوانی میں لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ دبستان لکھنؤ کے مشہور و معروف اساتذہ میں تھے۔ لکھنؤ ہی میں بروز چہار شنبہ (بدھ) ۲۵ محرم ۱۲۶۳ھ/۱۳ جنوری ۱۸۴۷ء میں بوقتِ صبح انتقال ہوا جو اچانک حادثہ تھا۔ مصحفی کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ سید سادات حسین

---

[۴۶] بیاضِ سحر (انیسِ بے نظیر) ص ص ۸۵، ۸۴ در مطبع اودھ پریس لکھنؤ سنہ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۶ء

خاں شرف عرف آغا حجو نے تاریخی مرثیہ کہا۔ جس سے سالِ وفات کے علاوہ آتش کی سیرت و شخصیت، افتادِ طبع، مذہبی عقائد اور مدفن وغیرہ کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں :-

خواجۂ صبر و رضا و بندۂ خاصِ خدا — تارکِ دنیا و لذت، قانع و گوشہ نشیں

بے ریا، بے نفس، بے پروا و بے حرص و ہوس — ناز بردارِ توکل، باخدا عزلت گزیں

پاک دامن، پاک طینت، پاکباز و پاک صاف — محوِ محبوبِ خدا، جو یائے ربّ العلمین

عارف و مجذوب، سالک جلّ کش روشن ضمیر — خاکسار و بوترابی، عاشقِ حبل المتین

کربلا میں روح رہتی ہے ہوئے ہیں گو یہاں دفن — زندہ دل تھے، زندۂ جاوید ہیں زیرِ زمیں

شاعرِ بے مثل و یکتا تھے وہ فردوسیِ عصر — چل بسے افسوس دنیا سے سوئے خلدِ بریں

آتش انکا تھا تخلص، نام تھا حیدر علی — تھے خدا رس، تھا انہیں دنیا سے کچھ مطلب نہیں

اے شرف تھے جلوہ فرما بوریائے فقر پر — کرتے تھے ہر وقت تعظیم و ادب مسند نشیں

سالِ رحلت سے دو عالم میں ہیں شہرت یافتہ
"حیدری مداح و فردوسی فردوس بریں"[۴۸] ۱۲۶۳ھ

جاری ہے

[۴۸] ملاحظہ ہو "دبستانِ آتش" از ڈاکٹر شاہ عبدالسلام ص ص ۷۴-۱۲۶ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی بار اول ۱۹۷۷ء۔ لیکن مادہ بُری طرح مسخ ہے یعنی: حیدری مداح و فردوشِ فردوس بریں"۔ کہہ نہیں سکتے کہ "فردوسی" کے بجائے فردوش (؟) کیوں اور کیسے ہوا؟ بہرحال ہم نے درست کرتے ہوئے مادہ لکھا ہے۔

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

قسط ۲

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا

یاد رکھو کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا انفس جیسا ہوگا ویسی ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا "آفاق" ہوگا۔ آفاق تابع انفس ہے۔ آفاق میں تغیر انفس کے تغیر کا تابع ہے۔ اس صداقت کو قرآن حکیم نے ایک سے زیادہ جگہ واضح کیا ہے شک وشبہ سے نکالنے کے لئے ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد ع ۲)

واقعی حق تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الانفال ع ۷)

یہ بات اسی سبب سے ہے کہ حق تعالیٰ کی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے انفس کو نہیں بدل ڈالتے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، انفس کا بدلنا ضروری ہے۔ اگر باطن میں کجی ہو، انفس خام و ناشائستہ ہو، تو خارج میں کجی، ناہمواری، عدم توافق یا دوسرے الفاظ میں درد وغم، قلت واقلال، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔

باطن یا انفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کے صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے

ملنے افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری، ضیق و پریشانی، رنج و غم، غم والم سب نتیجہ ہیں باطنی زندگی کا، یعنی رذائل اخلاق کا، اتباع ہوی کا، جرم و معصیت کا، بدکرداری وگناہ کا قرآن مبین نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ (شوریٰ ع ۵)

اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔

اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا؟ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (پ ۴ ع ۸)

اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے دوچند پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی؟ آپ فرما دیجئے کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری ہی طرف سے پہنچی ....

صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا:

انما هی اعمالکم ترد علیکم

یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں۔

دوسری جگہ یوں فرمایا:

إنما هی اعمالکم أحصیها علیکم فمن وجد خیراً فلیحمد الله ومن وجد غیرها فلا یلومن الا نفسه۔

یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جن کو میں محفوظ رکھتا ہوں (تمہارے نامہ اعمال میں لکھوا جاتا ہوں کہ ان کا پورا پورا بدلہ تم کو ملے) اگر تم میں سے کوئی خیر پائے تو اللہ کا شکر کرے اور اگر اس کے خلاف پائے تو سوائے اپنے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے

اس اصول کی وضاحت میں صوفیہ کرام نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور

صادق ہے وہ شخص اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اگر سیدھی تو سایہ بھی سیدھا ہوگا۔ النفس شخص کے مانند ہے اور ماحول اس کا سایہ ہے، یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات و واقعات ان کا عکس یا سایہ ہیں۔ شیخ ابو النجاؒ اپنے احباب سے کہا کرتے تھے۔

"اعلموا ان جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما یبرز منکم من الاعمال، فانظروا کیف تکونون، فان الظل تابع الشاخص فی العوج والاستقامة"۔ یعنی "جان لو کہ جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی تمہارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے، اسی لئے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے کجی و راستی ہر دو میں"۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا نشوز و گریز اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو ٹھہراتے اور اپنے ہی ملامت کرتے۔ ان کا قول مشہور ہے۔

ان الوجود یعاملنی علی صورة عاملت بہ فالقوم علی لا علیہم فی الاصل لانہم کظل الشاخص علی حد سواء فان کان الشاخص مستقیما فالظل مستقیم او اعوج فالظل اعوج ومن طلب الاستقامة الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال۔ یعنی "لوگ میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں جیسا کہ میں انکے ساتھ کرتا ہوں، پس ملامت میرے ہی ذات پر ہے نہ کہ انکی ذات پر، کیونکہ انکی مثال کسی شئی کے سایہ کے مانند ہے اگر شئی سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شئی ٹیڑھی ہے تو سایہ بھی ٹیڑھا جس شخص نے اس بات کی توقع کی کہ ٹیڑھی شئی کا سایہ سیدھا ہوگا تو اس نے محال کی تمنا کی۔

قرآن عظیم نے کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ اور كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ اور لَهَا مَا

كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا
کہکر اس صداقت کی توضیح کی ہے۔ اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو! یہ وہی اصول ہے
جس کو امیر مینائی نے عاشقوں کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

یہ رونا بے وفائی کا یہ شکوہ کج ادائی کا
سزا ہے دل لگانے کی، مزہ ہے آشنائی کا

فلسفۂ اخلاق کی زبان میں اسکو یوں بیان کرتے ہیں: الناس مجزیون باعمالھم ان خیراً فخیر وان شراً فشر، لوگوں کو اعمال کی جزا ملتی ہے اگر اعمال اچھے ہوں تو ان کی جزا بھی اچھی ہوتی ہے، اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے!

بنیادی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ماحول یا واقعاتِ زندگی کے سلسلہ میں تمہیں چند باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اوپر بیان کئے ہوئے اصول پر غور کرنے سے تمہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن کریم نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کردی ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (الجاثیہ ۲۲)

حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے۔

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفل شیر خوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں! یہ فرائض و واجبات کا بار ہمارے کاندھوں پر رکھتی ہے تاکہ ان کی ادائی میں ہم زیادہ سے زیادہ قوی ہوتے جائیں، ہمارے اخلاق اعصاب و عضلات طاقتور ہوں اور ہم انسان کامل بنتے جائیں اور اس سرور و مستی سے بہرہ یاب ہوں جو کاملین کے لئے مقدر کی گئی ہے!

(جاری)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرپرست اعلی ندوۃ المصنفین دہلی

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مجلس ادارت اعزازی

سید افتخار حسین

ڈاکٹر معین الدین بقائی

محمود سعید بلالی

ڈاکٹر جوہر قاسمی

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

جلد: ۱۲۳ | اکتوبر ۱۹۹۸ء | شمارہ: ۴

اس شمارے میں

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ برہان

4136 - اُردو بازار جامع مسجد دہلی-110006 * فون نمبر 3262815

زرِ تعاون

فی پرچہ ۶ روپے

سالانہ ۷۲ روپے

کمپیوٹر کتابت

CREATIVE VISION

عمیدالرحمن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

اُف یہ مہنگائی، نہیں نہیں یہ مہنگائی نہیں اسے مہنگائی نہیں کہتے ہیں۔ مہنگائی تو اسے کہتے
سی چیز کی قیمت ایک روپیہ سے بڑھ کر سوا روپیہ ہو جائے یا حد ہے ڈیڑھ روپے ہو جائے۔
لناس کے لئے اشیائے خورد و نوش کی کوئی چیز ایک روپیہ سے ایکدم بڑھ کر سوا روپیہ ہو جائے
غریب عوام پر مہنگائی کی مار ہی سے تعبیر کیا جائے گا اور اس پر عوام کا رونا بلکنا اپنی جگہ جائز
بی ہے۔ لیکن جب اشیائے خورد و نوش کی کوئی چیز مثلاً دال ارہر ۱۷ روپے فی کیلو بازار میں بکتے
یکدم چالیس بیالیس اور پینتالیس روپے ہو جائے تو اسے ہم کیا کہیں گے۔ اسے مہنگائی کہنا مہنگائی
ن ہے۔ اس طرح تو کبھی بھی مہنگائی ہوتی سنی نہیں گئی اسے تو ہم بلا مبالغہ لوٹ کا نام ہی دیں گے
ہنگائی نہیں بلکہ لوٹ ہے اور اس لوٹ کو عوام بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور دل و
سے برداشت بھی کر رہے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حکومت بھی دیکھ رہی ہے مگر اس پر
ومت کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی ہے۔ بھلا بتائیے تو سہی یہ حد نہیں تو اور کیا ہے کہ پیاز
مولی قیمت کی چیز بھی آج گراں قدر بن گئی ہے اور عجب نہیں مہنگائی نہیں بلکہ لوٹ کا یہی حال
ریب عوام کی پہنچ سے پیاز دور ہو جائے گی اور یہ خواص کے محلوں کے یہاں کی قیمتی جنس
نے گی۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی جو ابھی کل تک اپوزیشن میں بیٹھ کر مہنگائی
روتی تھی مہنگائی پر بازار بند کرا دیا کرتی تھی مہنگائی پر شور شرابہ کر کے حکومت کے ایوانوں
زلے پیدا کرتی تھی آج اس کی حکومت کے سائے میں معمولی چیزوں کی قیمتیں آسمان چھو رہی
ں سے عوام الناس کا بہت برا حال ہو گیا ہے ایک لفظ میں اس کو بیان کریں تو یہ کہنا مناسب

اشیائے ضروریہ کی چیزوں کی آسمان چھوتی قیمتوں نے غریب عوام کا کچومر ہی نکال دیا ہے
یا نہ ہوگا - آٹا دال چاول سب مہنگے بہت مہنگے عوام کی پہنچ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور
پہ مستزاد موسمی سبزیوں کی کمیابی بلکہ نایابی نے رہی سہی کسر بھی نہیں چھوڑی ہے۔ پیاز کے بعد
کی آسمان چھوتی قیمت گوبھی پالک مولی ٹماٹر جب بازار میں خریدنے کوئی نکلتا ہے تو وہ ان کی
ت پوچھ کر اور اپنی جیب ٹٹول کر مایوس واپس گھر آکر رونے بلکنے لگتا ہے۔ کیا یہ ہی بھارتیہ
ا پارٹی کا حکومتی نظام چلانے کا طریقہ ہے جس میں غریب عوام کی کوئی پوچھ ہی نہیں ہے۔
ں اشیائے خورد و نوش کی قلت بلکہ قحط نے عوام کا دم نکال دیا ہے وہاں خوردنی تیل میں
وٹ سرسوں کے تیل میں ایسے اجزاء کی شمولیت جس سے عوام میں بیماری پھیلی اور اس کے بعد
سے ان تیلوں کا فقدان اور پھر جب بازار میں یہ آیا تو ۳۸ روپے فی کیلو تیل سے بڑھ کر ایکدم
روپے تک اس کی قیمت کا پہنچ جانا محیر العقول نہیں تو اور کیا ہے؟ ہائے یہ مہنگائی نہیں بلکہ یہ
ہے جسے دیکھ کر یہ کہنے میں ہمیں کوئی حجاب نہیں ہے کہ بیوپاری طبقہ اس موقع کی تلاش میں
کہ عوام الناس کی جیبیں آن کی آن میں خالی کرالی جائیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اشیائے خورد و نوش کی آسمان چھوتی قیمتوں کا یہ ہی حال رہا تو وہ دن
ر نہیں جب عوام کا جینا ہی دوبھر ہو جائے گا۔

عوام الناس جہاں اشیائے خورد و نوش کی قلت و قحط سے دوچار ہیں وہیں لا اینڈ آرڈ کا
لہ بھی ان کے لئے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ چوریاں ڈکیتیاں اور قتل کی خبریں روزانہ اخبارات
کثرت سے پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ ہر شخص پریشان ہے کہ ہندوستان جیسے جنت نشان کہا
ہے وہاں کب تک یہ دل دہلا دینے والی خبریں سننے کو ملتی رہیں گی۔ یہ تو دیمک کی طرح ملک کو
نے والی ہیں۔ جو بھی اس کا ذمہ دار ہے وہ بلا شبہ ملک و قوم کا غدار ہے اور ملک و قوم کے
اروں کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ دنوں دہلی کے عوام کو طرح طرح کی مشکلات کا
سامنا کرنا پڑا ہے۔ بسوں کی ہڑتال، پانی بجلی کی قلت اور تکلیف دہ حد تک ان کی کمیابی نے
م الناس کا برا حال کر دیا ہے ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے ہم ان واقعات و حالات
عوام الناس کو پہنچی ان تکالیف کی مذمت کر سکیں۔ آخر کب تک یہ حالات قائم رہیں گے۔ حکومت

سے کوئی اپیل گذارش یا درخواست کرنا کہ وہ ان سب تکالیف و مشکلات کا تدارک کرے ا
توجہ ان کو حل کرنے کی طرف مرکوز کرے، ہم بے سود ہی سمجھتے ہیں۔ حکومت کے پاس ذرائع ابلا
ہیں اس لئے یقیناً وہ ان سب حالات و تکالیف سے آگاہ ہوگی ہی۔ اس کے باوجود بھی جوں کا
حالت میں کوئی سدھار نہ ہو تو اب مالک حقیقی پروردگار عالی ہی سے دعا ہے کہ عوام النا
یا اللہ اس مہنگائی و لوٹ سے نجات عطا فرما اشیائے خورد نوش کی قلت و کمیابی اور ق
خاتمہ ہو آمین ثم آمین!

دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن کی آمد ہے۔ الیکشن کمیش
طرف سے نوٹیفکشن جاری ہو چکا ہے۔ اس انتخاب کے نتائج بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے
کی مار نے عوام کا برا حال بنا دیا ہے۔ عوام کس پارٹی کو منتخب کرتے ہیں یہ دیکھنے کی بات ہوگی۔
جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی دہلی اور راجستھان میں حکمراں جماعت ہے اگر الیکشن کے بعد بھی ا
میں بھارتیہ جنتا پارٹی اقتدار میں رہتی ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ مہنگائی کے باوجود عوام بھ
جنتا پارٹی کو اقتدار میں بنے دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ان صوبوں میں بھارتیہ جنتا پارٹ
خلاف عوام ووٹ دیتے ہیں اور اقتدار سے بے دخل کرتے ہیں تو اس کا صاف مطلب ہوگا کہ
جنتا پارٹی سے عوام الناس عاجز آ چکے ہیں اور وہ اسے اقتدار کی کنجی دینے کی دوبارہ غلطی کر
تیار نہیں ہیں ایسی صورت میں ہمارے خیال میں اس الیکشن کا دوررس اثر ہوگا مرکزی حکوم
اس کی آنچ آئے بغیر نہ رہے گی۔ کانگریس اور اس کی حلیف پارٹیاں ہمت و حوصلہ کے ساتھ م
میں کود یں گی اور وہ مرکزی حکومت کے لئے مشکل کھڑی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گی دونو
پارٹیاں، سماج وادی پارٹی اور لالو پرشاد کی راشٹریہ جنتا دل لنگر لنگوٹ کس کر مرکزی حکو
خلاف واویلا کرنا شروع کریں گے۔ جس سے مستقبل کے حالات کے بارے میں تشویش ہے کہ
حالات کیا کروٹ لے لیں۔ خدا تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ جو بھی حالات بنیں وہ ملک و قو
ہی کے لئے ہوں۔ ملک میں امن و امان ہو اور اس میں رہنے والے تمام باشندوں کو راحت
اور امن نصیب ہو۔ یہ ہی تمنا و خواہش اور آرزو ملک و قوم کے ہر بہی خواہ کی ہے۔

بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم کی ملاقات کے بعد اسلام آباد میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کی خوشگوار ماحول میں بات چیت سے ہندوستان کے ہر باشندہ کو خوشی ہے بیشک یہ بات چیت کسی نتیجہ پر نہ پہونچی ہے مگر اس بات نے آگے بات چیت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے نمائندے پرامید ہیں کہ آپس میں تعلقات بحال ہو جائیں گے۔

وزیراعظم ہندوستان جناب اٹل بہاری باجپئی کی یہ بات بڑی ہی اہم اور قابل تعریف ہے کہ انہوں نے پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی اہمیت بتلاتے ہوئے یہ بات زور دے کر کہی کہ پاکستان ہمارا پڑوسی ملک ہے اور ہمیں پاکستان سے تعلقات اچھے اور خوشگوار اس لیے بھی بنانے ہیں کہ پڑوسی کبھی الگ نہیں ہوتا ہے دوست بچھڑ سکتا ہے لیکن پڑوسی تو ساتھ ہی رہتا ہے اور پڑوسی کبھی نہیں الگ ہو سکتا ہے۔ وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی کی اس بات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہندوستان دل سے پاکستان سے اچھے خوشگوار بھائی چارگی کے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے بدقسمتی سے پاکستان کے حکمراں یہ بات ابھی تک اپنے دل و دماغ میں نہیں بٹھا سکے ہیں کہ ان کے لئے پڑوسی ملک ہندوستان سے دوستی بھائی چارگی کتنی ضروری اور فائدہ مند ہے اور جس دن پاکستان کے حکمراں طبقہ نے ہندوستان جیسے پڑوسی ملک سے بھائی چارگی کے تعلقات کی اہمیت کا احساس دل و دماغ میں بٹھا لیا اسی دن ہندوستان اور پاکستان میں آپس میں بھائی چارگی کے تعلقات قائم ہونے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگے گی، اور اس طرح دونوں ملک کی ترقی و فلاح بہبود کو دنیا عظیم الشان نظریہ سے دیکھے گی انشاء اللہ!
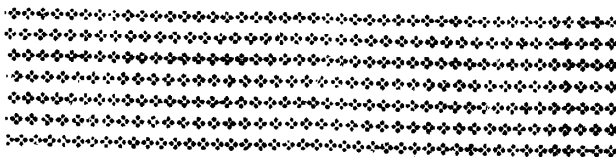
قطعاتِ وفاتِ شعرائے اردو
قسط نمبر ۲

عبدالرؤف خاں ۔ اودی کلاں (راج) ۳۲۲۲۰۱

حکیم مومن خاں مومن :۔ مومن ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا۔ گھر والوں نے ان کا نام حبیب اللہ تجویز کیا لیکن رئیس المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے محمد مومن خاں نام رکھا اور اسی نام سے شہرت پائی اور تخلص بھی اسی اعتبار سے اختیار کیا۔ مومن نے ہمہ گیر طبیعت پائی تھی چنانچہ مختلف علوم و فنون میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں اپنے کوٹھے سے گرے۔ گرتے ہی ہاتھ اور بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ خود ہی تاریخ کہی۔

"دست و بازو بشکست" ۱۲۶۸ھ

بہت علاج کرایا مگر کارگر نہ ہو سکا۔ زائچہ دیکھ کر کہا کہ پانچ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکوں گا۔ چنانچہ مذکورہ مادہ ہی وفات کی تاریخ بھی ہوئی۔ اور آسمانِ شاعری کا یہ روشن درخشاں ستارہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء کو ڈوب گیا۔ کسی شاگرد نے مادۂ مذکورہ کو تضمین کیا۔

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت گفتا — خود با خردش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت گفت تاریخ این مصیبت — گفتا خموش گفتم "بشکست دست و بازو"[1] ۱۲۶۸ھ

---

[1] الواح الصنادید ۱/۲۰۶ مولفہ عطاء الرحمٰن قاسمی شاہ ولی اللہ اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۸۹ء

مرزا قادر بخش صابرؔ نے جو مومنؔ سے تعلق خاطر رکھتے تھے اپنی فکر رسا سے یہ تاریخ حاصل کی:

برلبِ کوثر و تسنیم برفت　　　　تشنۂ جام محبت مومنؔ

گفت تاریخ وفاتش صابرؔ

"یافت مقبولی جنت مومنؔ"[۳] ۱۲۶۸ھ

اجودھیا پرشاد صبرؔ نے "ماتم مومن خاں" (۱۲۶۸ھ) اور محمد شارب علی صادقؔ نے "مومن آباد کرد خلد بریں"[۴] (۱۲۶۸ھ) مادے برآمد کئے جو نہایت بہترین ہیں۔ قربان علی بیگ سالکؔ نے عارف و تسکین عہ و مومن کی وفات پر صنعتِ تجمع بین الاتفاق قطعہ کہا:-

برس دن میں مرے یہ تین شاعر　　　　کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن

نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت　　　　رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن

کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب

"ارم میں عارف و تسکین و مومن" عہ ۱۲۶۸ھ

یعنی "ارم + عارف + تسکین + مومن" (۱۲۶۸ھ) حرفِ ربط "میں" اور واو عاطفہ شامل مادہ نہیں ہیں۔ عبدالغفور نساخ کے قطعہ کا تاریخی بیت ہے:-

نساخ فکر سالِ تاریخ میں نہ رہ تو　　　　کہہ "ہائے ہائے مومن کیا خوب آدمی تھا"[۵] ۱۲۶۸ھ

---

[۳] گلستانِ سخن از مرزا قادر بخش صابر ص ۴۳۹، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

[۴] بروقت حوالہ نوٹ نہ کرسکنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

[۵] تاریخ لطیف ص ۵۵۔　　عہ یعنی زین العابدین خاں عارف اور میر حسین تسکین۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ: ذوق ۱۲۰۳ھ یا ۱۲۰۴ھ میں کابلی دروازے قدیم دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ شاعری میں شاہ نصیرؔ کے شاگرد تھے۔ لیکن بعد میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجلسوں میں بیٹھنے لگے۔ آگے چل کر بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے استاد ہوئے۔ خاقانیِ ہند خطاب تھا۔ یہ طوطیِ ہند ۲۳ ماہ صفر ۱۲۷۱ھ / ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۴ء میں انتقال فرما گئے۔ مرتے دم درج ذیل شعر وردِ زبان تھا:

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

بہادر شاہ ظفرؔ نے تاریخ کہی:

طوطیِ ہند حضرتِ استادِ ذوقؔ نے لی گلشنِ جہاں سے جو باغِ جناں کی راہ

سالِ وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفرؔ

کہہ ذوقؔ جنتی ز سرِ بخششِ الٰہ ۱۲۷۱ھ

ظفرؔ نے مصرع مادہ ہی میں دو عدد کا نہایت ہنرمندی سے بہترین تدخلہ کیا ہے جو اردو میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسرا قطعہ فارسی زبان میں کہا، جس میں روز و ماہ کی اطلاع بھی دی گئی ہے:

شبِ چارشنبہ بہ ماہِ صفر بحکمِ خداوندی جاں داد ذوقؔ

ظفرؔ رو سے اردو بہ ناخن ز غم

خراشید و فرمود "استادِ ذوقؔ" ۱۲۷۲-۱=۱۲۷۱ھ

مصرع اولیٰ میں ایک عدد کا تخرجہ ہے جسے سمجھنا دشوار نہیں۔

منشی اسماعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی نے اِس خاقانیِ ہند کی رحلت پر درج ذیل قطعۂ تاریخ

---

۶ واقعاتِ دارالحکومت دہلی ۲: ۵۴۳

۷ گلستانِ سخن ص ۲۲۱ تا ۲۳۱۔

کہہ کر اپنا نذرانہ پیش کیا :-

رحلتِ ذوقِ سخن پیرا سے　　ہے بلند آہ و فغاں دہلی میں
واقعی شاعرِ خوش گو تھا وہ　　روئے ہیں پیر و جوان دہلی میں
نظم کی میں نے یہ تاریخ منیر
"نہ رہا ذوقِ زباں دہلی میں" ۱۲۷۱ھ

مادہ سالم الاعداد اور ذو معنی ہونے کے سبب بہت پر لطف ہو گیا ہے۔

ڈپٹی عبد الغفور نساخ نے، جنہیں تاریخ گوئی میں مہارتِ تامہ حاصل تھی، یہ تاریخ کہی :-

کی قضا ذوق نے افسوس ہے ہے　　مرگ کا اوسکے جہاں کو غم بجا ہے
سال کا نساخ نے مصرع یہ لکھا
" انتقالِ شاعرِ کامل ہوا ہے" ۱۲۷۱ھ

مولوی عبد الکریم سوز ابن صہبائی نے ذوق کی رحلت پر تاریخی عنوان "واقعہ تعب خیز (۱۲۷۱) کے تحت ۲۴۹ اشعار پر مشتمل ایک طویل مرثیہ لکھا جس میں اکتالیس تاریخیں ہیں۔ ان میں سے صرف چند پیش ہیں :-

صبحدم نکلا میں اپنے گھر سے باآہ و فغاں　　ذوق کے مرنے کا جب مشہور افسانہ ہوا
آج وہ دن ہے کہ ہر جا نالہائے زار سے　　حشر سے پہلے ہی اب اک حشر ہے برپا ہوا
جب گیا اس جا سے وہ پیشِ خدائے لایزال　　اوس نے فرمایا "یہ ہے کامل ہنر بخشا ہوا" ۱۲۷۱ھ
ہاتھ مل مل کر یہ کہتا تھا فرشتہ موت کا　　"جاں تو لی اس کی اجل نے اور میں رسوا ہوا" ۱۲۷۱ھ

ھ　ماہنامہ نیا دور لکھنؤ جولائی ۱۹۹۲ء ص ص ۴-۳۳

ھ　سخنِ شعرا از نساخ ص ۱۶۶، اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

اور اجل کہتی تھی حسرت سے یہ شرمائی ہوئی "مجھسے ایسا آدمی افسوس کیوں کشتا ہوا" ۱۲۷۱ھ

نوحہ گر تاریخ میں اوسکے ہوئے یوں آشنا "مر گئے سب دوست گویا اوسکا مرنا کیا ہوا" ۱۲۷۱ھ

کھو لکر آنکھیں کہا نرگس نے ہر سو دیکھ کر "حیف گویا نورِ چشم آنکھوں سے پوشیدا ہوا" ۱۲۷۱ھ

ہاتفِ میخانہ بولا جب سنا یہ ماجرا "آہ میخانہ پڑا ہے اوسکے بن اجڑا ہوا" ۱۲۷۱ھ

اوسکے شاگردوں پہ جب یہ ماجرا ظاہر ہوا شعر یہ تاریخ میں سب کی زباں سے وا ہوا

"کون فرمائے گا ہم پر مہربانی اس طرح" ۱۲۷۱

"تھا عجب استاد وہ یکبار ناپیدا ہوا"[۱۰] ۱۲۷۱

ذوق کی وفات پر دو قطعات غالب نے کہے جنہیں اُن کے دیوانِ فارسی میں دیکھا جا سکتا ہے

وحشت :۔ مولانا حافظ رشید النبی، تخلص وحشت فاروقی مجددی رامپور میں پیدا ہوئے مسکن کلکتہ، ہگلی میں، دار الافتار کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ عربی، فارسی و اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۲۷۴ھ میں عین عالم شباب میں رحلت کی۔ مولوی عبد الغفور نساخ نے جو کہ مولانائے مرحوم کے شاگرد تھے۔ تاریخیں موزوں کیں :۔

مر گئے حیف حضرتِ وحشت یا خدا ہوں وہ داخلِ جنت

گوہرِ دُرجِ علم و فضل تھے وہ نیّرِ برجِ علم و فضل تھے وہ

عالمِ باعمل تھے اور کامل علم میں بے بدل بڑے فاضل

قاضیِ شرع حافظِ قرآں تھے وہ بے شبہ صاحبِ عرفاں

جب کہ اوستاد کا وصال ہوا مجھکو تاریخ کا خیال ہوا

یہ ندا دی سروش نے ناگاہ

"مرگئے آہ ایسے فاضل آہ"[۱۱] ۱۲۷۴ھ

---

[۱۰] گلستانِ سخن ص ص ۲۲۱ تا ۲۳۱ [۱۱] سخن شعراء ص ۵۴

مذکورہ قطعہ سے مولانا کے سوانح و سیرت پر بھی وافر معلومات ملتی ہیں۔ باقی دو قطعات "سخن شعرا" میں ترجمۂ وحشت کے تحت ملاحظہ ہوں۔

قبولؔ :۔ مرزا مہدی علی خاں لکھنوی المتخلص بہ قبولؔ، خطاب مقبول الدولہ مصاحب واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ (لکھنؤ) واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے تھے واپس آکر ۱۲۷۶ھ میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ نساخ نے تاریخ کہی :۔

میرزا مہدی علی خاں مر گئے افسوس　　دوستوں کو کر گئے مغموم و محزون و ملول

مصرعِ تاریخ نساخِ حزیں نے یہ کہا　　" وائے ہے ہے مر گیا مہدی علی خانِ قبولؔ" ۱۲۷۶ھ[۱۲]

ہلالؔ :۔ امیر علی خاں نام، ہلالؔ تخلص، باشندۂ لکھنؤ، شاگردِ رشکؔ۔ ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ مندرجہ ذیل شعر انہی کا ہے :۔

بحرِ دنیا میں ہیں یکساں مجھے موج و ساحل　　آشناؤں میں محبت ہے نہ بیگانوں میں

شاہ غلام حیدر صغیر لکھنوی نے صنعتِ مراتب و سروپا میں ندرت کے ساتھ تاریخ کہی جو فارسی میں ہے :

افسوس ہلالؔ ازیں جہاں رفت　　دل در غم او پُر اضطراب است

شیریں سخنے بشاعراں بود　　دیوان کہ از دست خوش کتاب است

جستیم چو اے صغیرؔ تاریخ　　دل گفت حیات چوں حباب است

بنویس در حرف از سروپا　　باقی ز حباب غرقِ آب است

اعدادِ حروف چوں نوشتم　　یک یک کم شد ہمیں حساب است[۱۳]

---

[۱۲] حوالۂ ماقبل ص ۳۸۲

[۱۳] تاریخِ لطیف ص ۶۰

یعنی افسوس کہ ہلالؔ اس جہان سے چلا گیا، اس کے غم میں دل پر اضطراب ہو گیا ہے۔ وہ
عروں میں شیریں سخن تھا اور اس کا دیوان عمدہ دیوان ہے۔ اے صغیرؔ میں نے جب اس کی رحلت
تاریخ تلاش کی تو دل نے کہا کہ حیات حباب کی مانند ہے (تو اس کے نام امیر علی) کے سر و پا
رؤ سے دو حرف لکھ (یعنی امیرؔ "ا" نیز علی = "ع ی") اور باقی کو حباب کی مثل غرق
یا کر دے۔ اب اُن (سر و پا) حروف کو جب میں نے (الف، مأت اور عشرات کے مرتبہ پر) لکھا
ر پھر ان کے حساب میں سے ایک ایک یعنی دو عدد کم کر دیئے تو مطلوبہ سال حاصل ہو گیا۔
ب حل ملاحظہ فرمائیں:۔

الف بمعنی ہزار چنانچہ ۱/ا + ب/۲ + ج/۲ + ۱۰/ی = ۱۲۸۰ نیز مصرعۂ آخر کی رؤ سے دو عدد کے
منہا کا واضح قرینہ موجود ہے اس لئے ۱۲۸۰ = ۱۲۷۸ھ۔ مادہ میں اکائی کے درجہ میں
ئی حرف نہیں ہے۔

غالب کی تاریخہائے وفات ۱۲۸۵ھ پر ہم ایک علاحدہ مضمون سپردِ قلم کر چکے ہیں، بہرحال
ن زد مادۂ وفات ہے: "آہ غالب بمرد" ۱۲۸۵ھ

سرورؔ:۔ فسانۂ عجائب کے مصنف مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی شخصیت سے اردو دنیا
ں کون ہے جو واقف نہیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور رام نگر (بنارس) میں انتقال کیا۔
ں جس طرح ان کا سالِ ولادت قیاساً ۱۲۰۰ھ بتلایا جاتا ہے، اسی طرح ان کی رحلت کے سنہ
ں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی کے قطعہ کے مادہ "ہائے
مدالم و رفت سرورؔ" سے ۱۲۸۴ھ ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن "آمد" میں الف ممدودہ کے دو عدد
رکھیں تو ۱۲۸۵ھ۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا کہنا ہے کہ "سرورؔ نے محرم ۱۲۸۶ھ میں ۳ اپریل اور ۱۴
ئی ۱۸۶۹ء کے درمیان کسی تاریخ کو انتقال کیا[۱]"۔ چنانچہ سید محمد علی جویاؔ کا قطعہ ذیل
ش ہے:

---

۱ رجب علی بیگ سرورؔ ص ۳۰۰۔

جس کو فسانہ گوئی کا انداز یاد تھا وہ آج سب کے پاس سے دور آج چل دیا

آخر سنا زبان سے ہاتف کی بہر سال ۵ +

" افسوس غمکدہ سے سرور آج چل دیا "[15] ۱۸۶۴ء = ۱۸۶۹ء

جویا نے ایک دوسرے قطعے کے مادہ : " کز بزم جہاں سرور رفتہ "[16] سے بھی ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) ہی برآمد کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر حنیف نقوی اور رشید حسن خاں صاحب سرور کا سالِ وفات ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ احسان علی خاں کے نثری فقرہ (مادہ) " فوت میرزا سرور حزیں "[17] سے ۱۲۸۵ھ شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی کے قطعہ کے مادے : " بردہ سر دراز دل و جانم سرور "[18] (۱۲۸۵ھ) سے ظاہر ہے۔ بہرکیف ہمیں صرف قطعہ لکھنا تھا، یہاں درست سالِ وفات سے کوئی سروکار نہیں۔ جویا نے ممکن ہے چند یوم کے تفاوت سے قطعات لکھے ہوں۔

گرم :۔ محمد مظفر خاں گرم رامپور میں پیدا ہوئے۔ ذوق سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ اواخر عمر میں جے پور چلے آئے تھے۔ وہاں ساٹھ برس کی عمر میں ۱۰ رجمادی الآخر ۱۲۸۵[19]ھ میں انتقال ہوا اور جے پور ہی میں دفن ہوئے۔ سید محمد علی جویا بھی اُس زمانہ میں جے پور ہی میں تھے یعنی ۱۸۶۲ء میں جے پور آئے تھے مگر گرم کی وفات کے مادے ۱۲۸۶ھ / ۱۸۷۰ء کے برآمد کیے ہیں :۔

گیا جنت کو جب وہ شاعر افسوس کہوں کیا غم ہوا عالم کو از حد

کہا ہاتف نے بہر سال جویا

ہو ہے جان مظفر خان احمد[20] ۱۸۷۰ء

---

[15] خیابانِ تاریخ ص ۴۸ [16] ایضاً ص ۴۶

[17] رجب علی بیگ سرور چند تحقیقی مباحث از ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۲۱ بحوالہ تاریخ بنارس ۲: ۲۷۱

[18] کنز تواریخ ص ۳۲ [19] دیکھئے تذکرہ کاملانِ رامپور مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق (م ۱۹۳۳ء) ص ۳۹۳-۳۹۴ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۶ء نیز انتخاب یادگار از امیر مینائی ص ۳۱۸-۳۱۹، ناشر اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء۔

مادہ "مظفر خان احمد" ہے جس کی کل قیمت ۱۹۲۴ ہوتی ہے اس میں سے "بے جان" کہتے ہوئے "جان کے (۵۴) عدد خارج کر کے مطلوبہ سنہ ۱۸۷۰ء حاصل کیا ہے۔ دوسرا قطعہ ہے:۔

مُجرم کو پلٹا فلک نے قدر سے" کہہ زبان سے اپنی جویا سال فوت ۱۲۸۶ھ

حافظ شیراز کا ارشاد ہے

"سخن باید کرامت فال موت" ۱۲۸۶ھ

مصرعۂ اول بھی تاریخی ہے جس کے کل عدد ۱۲۸۳ھ ہوتے ہیں۔ ان میں "جویا" کی جیم کے تین عدد شامل کر کے ۱۲۸۶ھ حاصل کیا۔

شیفتہ:۔ نواب مصطفٰے خاں دہلوی رئیس جہانگیر آباد ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے اردو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص تھا۔ ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں وفات پائی کسی نے صنعت بے سرو پا میں نہایت عمدہ قطعۂ وفات کہا:۔

چو رفت از جہاں مصطفٰی خاں امیر کہ بود اصل پاکیزہ و پاک فرع

خداوند تقویٰ خداوند زہد فقیر آشنا سالک راہ شرع

شد از فوت آں بے سرو پا تمام

وفا و کرم، بذل و تقویٰ، ورع ۱۲۸۶ھ

یعنی ف + ر + ذ + ق و + ر = ۱۲۸۶ھ۔ دوسری تاریخ سجع میں ہے جو تعریف سے بے نیاز ہے:

چوں رئیس ابن رئیس نامدار کرد رحلت زیں جہانِ بے بقا

حالِ تاریخ وفاتش فی البدیہہ ملہم غیبی بمن کردہ عطا

ء خیابانِ تاریخ ص ص ۸۱ و ۸۲۔

ۂ واقعاتِ دارالحکومت دہلی ۲ : ۳۴۳۔

کزسسر زاری ببایدگفت ایں[۲۳]
"رحمتِ حق بر محمد مصطفےٰ" ۱۲۷۹ = ۱۲۸۶ھ[۲۴]

انیس :- مشہور و معروف مرثیہ گو میر ببر علی انیس کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، ان کا انتقال ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بر ۹ دسمبر ۱۸۷۴ء روز چہارشنبہ کو شام کے قریب لکھنؤ میں ہوا۔ بہت سے شعراء نے تاریخیں کہیں لیکن یہاں ہم صرف سید حسن لطافت خلف سید آغا حسن امانت کا تاریخی مرثیہ پیش کرتے ہیں، جس میں پیچیدگی ضرور ہے مگر لطف سے خالی نہیں۔ پھر وقت و روز و ماہ و تاریخ اور عیسوی و ہجری سنین بصراحت موجود ہیں :-

جو میر ببر علی تھے انیس ذاکرِ شاہ	وحید دہر سب اہل جہاں کے راس و رئیس
فصیح و کامل و حسانِ وقت و دعبلِ دہر	جناں میں جا کے ہوئے ساتھ حور عین کے جلیس
قریب شام ہوئے وہ مہِ کمال تمام	اخیر چاند تھا گذرے تھے آہ دن اونتیس
سنا یہ واقعہ جا نکاہ جب کہی تاریخ	کہ جس میں لفظ ہیں آئے مناسب اور سلیس
بیان مصرعِ آخر کے اب صنائع ہوں	بہ فکر سمجھیں لطافت جسے حساب نویس
شروع مصرعِ تاریخ جو کہ ہیں دو حرف	مہینہ ایک ہے اور دوسرا ہے روز خمیس[ع]
سنین بھی ہیں عیاں اوس سے عیسوی ہجری	جو بینات و زُبُر ہوں رقم بطورِ نفیس
وہ مرثیہ نہ وہ پڑھنا نہ وہ بڑے مجمع	اور اس مجلسِ ماتم ہے سامعین دین ہیں

عجیب مصرعِ تاریخ ہے ملا "یکتا"
"یہ بخشش کا ہے نوحہ انیس ہائے انیس"[۲۵]

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

---

[۲۳] ایضاً ص ۴۴-۳۴۳

[۲۴] ریاضِ لطافت ص ۳۶۳ مطبع شوکتِ جعفری لکھنؤ ۱۳۰۶ھ۔

[ع] خمیس بمعنی پنجشنبہ یعنی جمعرات لیکن از روئے تقویم ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو بدھ تھا۔ ملاحظہ ہو تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی ص ۶۵، انجمن ترقی اردو ہند دہلی مارچ ۱۹۷۷ء۔

ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

ڈاکٹر میر ولی الدین، ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا

(قسط نمبر ۳)

یا یوں کہو کہ ہماری زندگی ایک تربیت گاہ ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے معلم اور استاد ہیں، روز مرہ کے واقعات اور حادثات وہ آلات ہیں جن کے ذریعہ ہماری سیرت کی تکمیل کی جارہی ہے۔ دنیا کی مثال ایک "روح ساز وادی" سے دی جاتی ہے۔ یہاں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں! راحت وغم، بلا و طرب، لذت والم ہمیں اپنا سلوک طے کرنے میں مدد دے رہے ہیں، دونوں ہمارے لئے خیر ہیں، ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی ؎

بس زبونِ وسوسہ باشی دلا
گر طرب را باز دانی از بلا

موت وحیات کی تخلیق، قرآن حکیم کے الفاظ میں، اس لئے ہوئی ہے کہ اس امر کی آزمائش کی جائے کہ ہم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک ع ۱)

جب حقیقت یہ ہے تو عارف نہ زندگی کے تغیرات سے گھبراتا ہے نہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، یہ تو اس کی تادیب و تزکیہ کے لئے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ان تغیرات و تحولات سے وہ اسی طرح سبق لیتا ہے جس طرح کہ ایک ذہین و محنتی طالب علم استاد کی تقریر و تعلیم سے استفادہ کرتا ہے اپنے جہل کو دور کرتا ہے، اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ

اور اپنے دماغ کا خیالات فاسدہ سے تخلیہ کرتا ہے! ان واقعات و تغیرات کی حیثیت اس کی نگاہ میں ایک پردہ کی سی ہے اور اس پردے کے پیچھے وہ حق تعالیٰ ہی کو مصروف عمل دیکھتا ہے اور شیخ جیلیؒ کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے مخاطب ہوکر کہتا ہے:

رَبِّ اَشْهِدْنِی مُطْلَقَ فَاعِلِیَّتِكَ فِی کُلِّ مَفْعُولٍ حَتّٰی لَا اَرٰی فَاعِلًا غَیْرَكَ لِاَکُوْنَ مُطْمَئِنًّا تَحْتَ جَرَیَانِ اَقْدَارِكَ مُنْقَادًا لِکُلِّ حُکْمٍ۔

اے پروردگار مجھے ہر شئی میں اپنی فاعلیت کا مشاہدہ نصیب کر تاکہ تیرے سوا کسی کو فاعل نہ دیکھوں تاکہ تیرے اقدار کے جاری ہونے سے مطمئن ہوجاؤں اور تیرے ہر حکم کا مطیع و فرماں بردار ہو جاؤں۔

اسی علم و عرفان کے ایک متوالے کی زبان سے یہ سریلے نغمے نکلے ہیں:

یاریست مرا ورائے پردہ　　　حسن رخ او سزائے پردہ
عالم ہمہ پردۂ مصور　　　اشیا ہمہ نقشہائے پردہ
ایں پردہ مرا ز تو جدا کرد　　　اینست خود اقتضائے پردہ
نے نے میانِ ما جدائی　　　ہرگز نکند غطائے پردہ (لا اعلم)

جاہل تغیرات کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے: ان کا مقابلہ کرتا ہے، مزاحم ہوتا ہے! لیکن زندگی دائمی تغیر کا نام ہے "سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں" اس لئے جاہل کا مقابلہ خود زندگی کے قانون اور اس کی قوتوں سے ہے! یہ قانون اور اس کی قوتیں مقصد و غایت کے لحاظ سے منصفانہ اور مہربان اور عمل کے لحاظ سے غیر جانبدارانہ اور ناقابل شناست ہوتی ہیں!

ہمیں زندگی کے واقعات و تغیرات کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ان کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کرنا چاہیئے! یعنی ہمیں اس سبق پر نگاہ رکھنی چاہیئے جو ہمیں ان واقعات و تجربات کے ذریعہ دیا جا رہا ہے کیونکہ جب ہم اس سبق کو یاد کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و عمل

میں تغیر پیدا کر لیتے ہیں تو پھر یہ تکلیف دہ، ناخوشگوار اور المناک واقعات و تجربات رفع ہو جاتے ہیں اور طمانیت و برد قلبی ہمیں نصیب ہوتی ہے۔ حقیقی معنیٰ میں کامیاب زندگی کا راز حق تعالیٰ کے ارادے اور مقصد کے ساتھ توافق و اتحاد ہے! اور اس مقصد وارادہ کا اظہار ان ہی واقعات و تجربات و تغیرات میں ہو رہا ہے جس کے ساتھ توافق ضروری ہے جس کا شرع کی زبان میں توافق بالقضا، نام ہے جس کو "رضا بالقضا، و حفظ حال" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے! اسی لئے واقفان راز نے کہا ہے کہ

بدیں سپاس کہ مجلس منّور ست بناز   گرت چو شمع جفائے رسد بسوز و بساز

ہمیں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تجربات کے ذریعہ سیرت کی تکمیل کریں، اپنی پوشیدہ و نہفتہ روحانی قوتوں کو ظاہر و نمایاں کریں جو الہٰی قوتیں ہم میں بالقویٰ ہیں انھیں بالفعل کریں اور ہم اسی صورت میں ارادۂ اللہ کے ساتھ توافق قائم کر سکتے ہیں جب ہم اپنی زندگی کے واقعات و تجربات کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کریں، اور جو سبق وہ ہمیں سکھلانے کے لئے رونما ہو رہے ہیں انھیں سیکھیں نہ کہ ان سے تجاہل برتنے کی کوشش کریں۔

ریاضِ بندگی رعنا تر از شاخ گل ست
گردنے کز بارِ تسلیم و رضا خم می شود!   (ملا شاہ احمد)

تمام تجربات کا مقصد ہمیں اس راہ پر لے چلتا ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے! ہم اپنے جہل کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں، دور جا پڑتے ہیں! جذبات و شہوات ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹالے جاتے ہیں! صراطِ مستقیم کی طرف ہمارے قدم اسی وقت اٹھ سکتے ہیں جب ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقا عمل میں آئے اب زندگی میں رونما ہونے والے سارے تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہمارے روحانی ارتقاء میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم اس صراط مستقیم پر جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لیجاتا ہے چلیں لہٰذا تجربات و حالات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غم ناک، بہر طور یہ ہمارے خیر برتر کے حصول کے لئے ضروری و لابدی

ہیں، ان میں ہمارے لئے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیئے اور جیسے ہی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہمیں شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی، اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج، تنگی، خوف و حزن سے بھی!

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ تو جو شخص میری اتباع کرے گا تو وہ نہ گمراہ ہوگا وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً اور نہ شقی اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ۔ کریگا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت (طٰہٰ: ۱۲۴) کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

ہر تجربہ، ہر واقعہ زندگی کا خیر لامتناہی کی طرف لے جاتا ہے، تصادم کی بجائے اس سے توافق ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے، رضا بالقضا اسی کو کہا جاتا ہے، ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدّر فرمایا ہے، وہ ہمارے مولیٰ ہیں آقا ہیں ہمیں اپنے سب کام ان ہی کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔

شاد و خنداں پیش تیغش سر بنہ
ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ　(رومی)

تمام تجربات و حادثات دوا و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے؛

بسر دو گرم جہاں خاطرت چو راضی شد
تمام عمر ترا آب سرد و نانِ گرم است　(سلیم)

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے، کجروی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں، اتباع

شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں! جب ہم نے سبق ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی ہے ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں، ہمارا نقطۂ نگاہ بدلتا ہے؟ قانون الٰہی کے مطابق ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا ورود جس غرض کی تکمیل کے لئے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ پوری ہو چکی ہوتی ہے، وہ بھی بتدریج غائب ہونے لگتے ہیں!

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبقِ ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں ہمیں سبق سیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں رہنا چاہیئے چنانچہ تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے کہ فلیکثر الدعاء عند الرخاء۔ چین و آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔

چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ۔ کیونکہ درحقیقت منعم و قاسم نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہٰذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے۔ جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے۔ امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب ہماری آزمائش و ابتلاء کے لئے ہوتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجہ کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہو گیا، ہم شہوتوں و لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے؟ موجودہ نعمتوں کو حقیر و خوار تو نہیں سمجھنے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے؟ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں و راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں، اور معصیتوں میں منہمک تو نہیں ہو گئے؟ اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی

آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے بہت بڑا ہوتا ہے صاف بات ہے کہ گناہوں پر قدرت ہونے کے باوجود ان سے رک جانا یا صبر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے! عیش و آرام سے انسان کا جسم فربہ ہونے لگتا ہے عیش و آرام بغیر اس کو میسر نہیں آتا اور دوامِ عیش اسی وقت ممکن ہے جب اس کے حصول میں وہ لوگوں سے مدد چاہے اور ظالموں سے التجا کرے اور یہ امور نفاق، کذب، ریا، بغض، دشمنی کا سبب ہو جاتے ہیں اور ان سے تمام روحانی مہلکات پیدا ہوتے ہیں! قلب کے سارے امراض جنم لیتے ہیں! اسی لیے صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے" ! لہ

جب انسان نعمت و عافیت کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ عموماً حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے! از دیادِ دولت کی تدبیریں، اپنے بچاؤ کا خیال، مال کی حفاظت کا بندوبست! اس کے خرچ کرنے کا انتظام، یہ تمام امور اس کے قلب پر ہجوم کرتے ہیں، اور یہ سب اس کے دل کو سیاہ کرتے اور حق تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔

اسی لیے عیش سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ حضور انور صلعم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ "تم تنعم سے بچو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کرنے والے نہیں ہوتے (اِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ)

سچ ہے کہ نعمت کا فتنہ مصیبت کے فتنہ سے بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اور نعمت و مصیبت

لہ حب الدنیا راس کل خطیئۃ (رواہ البیہقی فی الشعب و ابن ابی الدنیا)

ہر دو ہمارے لئے ابتلا یا آزمائش ہیں! اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (پ ۹ ع ۱۱)

ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض اور طرح کے اور ہم انکو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

اسی طرح فرمایا:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً (پ ۱۷ ع ۳)

اور ہم تمکو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں۔

نعمت و عافیت کی حالت میں مرد مومن مشکور ہوتا ہے، یہی اس حالت کا ادب ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ مَشْكُوْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ

مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے

دل و زبان و اعضاء کے شکر ہی سے نعمتیں سلب و نقصان سے محفوظ ہوتی ہیں اور ان میں اضافہ ہوتا ہے۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ

اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں۔

خوب سمجھ لو کہ اجابت دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے کہ چاہا تو دیا چاہا تو نہ دیا لیکن شکر کے معاوضہ میں زیادتی نعمت بلا تکلف ہے! اسی لئے حضور انور صلعم نے فرمایا:

مَنْ نَزَلَتْ اِلَیْهِ نِعْمَةٌ فَلْیَشْكُرْهَا

جس کو نعمت ملے وہ اس کا شکر ادا کرے!

نیز، فَلْیُكْثِرِ الدُّعَاءَ عِنْدَ الرَّخَاءِ

چین و آسایش کی حالت میں زیادہ دعا کرتے رہو

زندگی کے تجربے، حادثے، تغیر و تحول ہماری آزمائش، ہماری سیرت کی تعمیر، تکمیل ہماری صلاحیتوں کو بیدار کرنے، بالقوۃ کو بالفعل کرنے ہی کی غرض سے رونما ہو رہے ہیں! ان کی دو قسمیں ہیں ملائم

ناملائم اور انسان کے نفس کی بھی دو حالتیں ہیں، تیسری حالت نہیں ایک عافیت دوسری بلاء۔
ناملائم یا دردناک حادثات کا ورود اس لیے ہوتا ہے کہ ہم کجروی سے باز آجائیں، شہوتوں کے اتباع سے رک جائیں، سیرت کی اصلاح کریں! سوہان قضا ہمارے پیکر خاکی کو تختہ و ہموار بناتا ہے اس کی کمی وخامی کو غم والم کے انگارہ سے دور کرتا ہے! بقول اقبال!

جہانِ ماکہ جز انگارہ نیست　　　اسیر انقلابِ صبح وشام است

زسوہانِ قضا ہموار گردد

ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

نفس کی اس حالت کو بلا ومصیبت کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے!

ملائم یا نعمت و عافیت کے حالات سے بھی ہماری آزمائش ہوتی ہے اگر ہم ان حالات میں یادِ حق سے غافل نہ ہوجائیں، اپنا رخ حق تعالیٰ ہی کی جانب رکھیں، ان کی نعمتوں کو انکی مرضی کے مطابق استعمال کریں تو ہم اپنے باطن میں یہ ندا سنتے ہیں۔

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ　　اپنا پاؤں مارو یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور
شَرَابٌ　　(پ ۲۳ ع ۱۳)　　پینے کا۔

یعنی ہم حق تعالیٰ کی رحمت ورافت، لطف ومنت کی دریا سے سیراب ہوتے ہیں، ہم پر ان کی نعمت وناز ومحبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ظاہر وباطن کی نعمتیں ہم پر تمام کردی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے ہماری پرورش و پرداخت کرتے ہیں اور یہ حالت موت کے وقت تک باقی رہتی ہے اور موت کے بعد وہ اپنے فضل وکرم سے ایسی نعمت عطا کرتے ہیں جس کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ گذرا![1]

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (السجدہ ع ۲)

ناملائم یا دردناک واقعات وحادثات پر غالب آنے کا طریقہ تعطل، عجز، کسل، جبن، بزدلی اہم

---

[1] فتوح الغیب مقالہ، ۴۱

وسیلہ کوئی نہیں نہ ہی مزاحمت و مقابلہ سرکشی و سب و شتم ہے بلکہ جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ان حادثات کے سبق ہدایت سے مستفید ہونا، صبر و استقامت، حکمت و عقل مندی سے اپنی سیرت و اخلاق میں تغیر پیدا کرنا ہے! ہم میں سے اکثر کے لیے اس امر کا اعتراف سخت مشکل ہے کہ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی درد و غم، اندوہ و الم کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کی اصل علت خود ہمارے انفس میں پوشیدہ سرگرم عمل ہوتی ہے! شیخ محی الدین اکبرؒ کی یہ تہدید کہ "یداک کبتا و فوک نفخ" یہ تیرے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہے اور تیرے منہ کی مانگ ہے" ہمارے سمجھ میں نہیں آتی اور ہم الزام زندگی پر رکھتے ہیں، حق تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہیں یا اپنے ہم جنسوں کو متہم ٹھہراتے ہیں، اور اس سبق کو سیکھنے سے انکار کرتے ہیں جو حادثات والمناک واقعات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی لامتناہی حکمت ہمیں سکھلانا چاہتی ہے ہم ٹوٹے ہوئے دل لے کر چیخ اٹھتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو! میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہے! ایک مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری اس سے زیادہ آفت مجھ پر نازل ہوتی ہے! بتلاؤ میرا کیا قصور ہے؟ یہ سب میری تقدیر کا نوشتہ ہے! ہائے تقدیر!"

طالعے دارم آنکہ از پے آب	گر روم سوئے بحر بر گردد
ور بدوزخ روم پے آتش	آتش از بخ فسردہ تر گردد
ور زکوٰۃ التماس سنگ کنم	سنگ نایاب چوں گہر گردد
ور گر سلامے برم نزد کسے	ہر دو گوشم بحکم کر گردد
ور بصحرا روم بجستن خاک	خاک حالی بہ نرخ زر گردد
ایں چنیں حالہا بہ پیش آید	ہر کرا روزگار بر گردد

(مولانا لطف اللہ نیشاپوری)

لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے روحانی ارتقا کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ہم خود انھیں اپنی طرف جذب کرتے ہیں، ان تمام بلاؤں اور آفتوں کا باعث خود ہم ہی ہیں اور

صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع و مانع الفاظ میں ہماری "ھوی متبع و شح مطاع" (خواہشات نفسانی کا اتباع کیا گیا اور وہ مرض جس کی پیروی کی گئی ہے! جب ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ "از ماست کہ برما است" "از ما خیزد برما ریزد" اور زندگی میں کمال انصاف ہے تو پھر ہم چیخ اٹھتے ہیں :

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (یونس)

بے شک حق تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتے لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

اب ہم اپنا رخ حق تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں، "انصار اللہ" بن جاتے ہیں، حق تعالیٰ کی مخالفت ترک کر دیتے ہیں، ان کے قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے، ان کے قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں! اسی میں ہماری عظیم الشان کامیابی ہے!

ماحول پر غالب آنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے قلب کا جائزہ لیں اور خارجی مشکلات و آفات کے اسباب و علل کی تلاش "النفس" میں کریں!

اگر ہم دیکھیں کہ حق تعالیٰ کی محبت سے ہمارا قلب عاری یا خالی ہے۔ دنیوی لذتوں و شہوتوں سے مملو ہے، اس کے گرد فریفتہ گرویدہ ہے، اس کے رنگ و بو پر فدا، اس کے خندۂ گریہ آمیز" پر قربان، تو ہمیں اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہنا چاہیئے کہ :

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ — سو تم کو دنیاوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے اور تمکو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے۔

اور "النفس" کے تغیر کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیئے اور اس وقت کے انتظار میں نہ رہنا چاہیئے جب آفات کا نزول ہونے لگے اور ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑے! جیسا کہ ہوتا ہے کہ ہماری سیہ کاری کی وجہ سے ہمارے قلب کی محبوب ترین چیز

ہم سے چھین لی جاتی ہے۔ اور اس وقت ہم شدتِ حزن و فرطِ غم سے ہر چیز سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے یہ چیخ نکلتی ہے۔

اللھم انک تسمع کلامی وتریٰ مکانی وتعلم سری وعلانیتی لا یخفیٰ علیک شیٔ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی! اسئلک مسألۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لک رقبتہ وفاضت لک عبرتہ وذل لک جسمہ ورغم لک انفہ اللھم لا تجعلنی بدعائک شقیاً وکن لی رؤفاً رحیماً یا خیر المسئولین ویا خیر المعطین۔ (کنز العمال عن ابن عباسؓ وعبد اللہ بن جعفرؓ)

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے! تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی! میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنیوالا ہوں۔ تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہے جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جسکی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور اسکے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو! اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحیم ہو جا! اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر! اے سب دینے والوں سے بہتر!!

بلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزول سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے تھے غم والم کے انگارہ سے جھلسنے کے بعد اگر ہماری عبدیت کی یہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب ہی نازل نہ ہوتا۔

مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَ کَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا۔ (پ۵ ع۸)۔ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

عذاب یا دردناک تجربوں اور مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ "ایمان و شکر" ہے عقیدہ و عمل ہے، ایمان باللہ و عمل صالح ہے! یعنی "انفس" کا تغیر ہے نقطۂ نظر کا بدلنا ہے سیرت کی اصلاح ہے، تقویٰ کا پیدا کرنا ہے۔ حق تعالیٰ کا دامن پکڑنا ہے، ان کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہے۔ ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہے! ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی عافیت کے خرمن میں آگ لگاتے ہیں، ہم خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں ہم خود اپنی جانوں کے دشمن ہیں، ہمارے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں! شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ نے اس حقیقت کو خوب لکھا ہے:

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش اے وائے من و دست من و دامن خویش

اسی لئے حق تعالیٰ نے جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں، ہم سبھوں کو اگلوں اور پچھلوں کو، ایک ہی وصیت فرمائی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ (پ۵ ع۱۶)

واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ حکم خداوندی کی اطاعت کرو اور اسکی مخالفت سے بچو یعنی تقویٰ کی زندگی اختیار کرو۔ (ختم شد)

ہم سے چھین لی جاتی ہے۔ اور اس وقت ہم شدت حزن و فرط غم سے ہر جذبے سے لوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے یہ چیخ نکلتی ہے۔

اللھم انک تسمع کلامی وتری مکانی وتعلم سرّی وعلانیتی لا یخفیٰ علیک شیٔ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی! اسئلک مسئلۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر ودعاء من خضعت لک رقبتہ وفاضت لک عبرتہ وذلّ لک جسمہ ورغم لک انفہ اللھم لاتجعلنی بدعائک شقیاً وکن لی رؤفاً رحیماً یا خیر المسئولین ویا خیر المعطین۔ (کنز العمال عن ابن عباسؓ وعبداللہ بن جعفرؓ)

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے! تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی! میں مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں، اعتراف کرنیوالا ہوں۔ تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل وخوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہے جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جسکی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور اسکے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو! اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحیم ہوجا! اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر! اے سب دینے والوں سے بہتر!!

بلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزول سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے تھے غم والم کے انگارہ سے جھلسنے کے بعد اگر ہماری عبدیت کی یہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب ہی نازل نہ ہوتا۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔ (پ ۵ ع ۸)۔ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

عذاب یا دردناک تجربوں اور مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ "ایمان و شکر" ہے عقیدہ وعمل ہے، ایمان باللہ و عمل صالح ہے! یعنی "النفس" کا تغیر ہے نقطۂ نظر کا بدلنا ہے سیرت کی اصلاح ہے، تقویٰ کا پیدا کرنا ہے۔ حق تعالیٰ کا دامن پکڑنا ہے، ان کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہے۔ ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہے! ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی عافیت کے خرمن میں آگ لگاتے ہیں، ہم خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں ہم خود اپنی جانوں کے دشمن ہیں، ہمارے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں! شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ نے اس حقیقت کو خوب لکھا ہے:

آتش بدودست خویش در خرمنِ خویش چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش اے وائے من و دستِ من و دامن خویش

اسی لئے حق تعالیٰ نے جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں، ہم سبھوں کو اگلوں اور پچھلوں کو، ایک ہی وصیت فرمائی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

ولقد وصینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللہ (پ ۵ ع ۱۶)

واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ حکم خداوندی کی اطاعت کرو اور اسکی مخالفت سے بچو یعنی تقویٰ کی زندگی اختیار کرو۔ (ختم شد)

شطرنج کی اصل

ڈاکٹر مقصود احمد، شعبۂ عربی، بڑودہ یونیورسٹی بڑودہ ۳۹۰۰۰۲

شطرنج کو شاہانہ کھیل ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ یہ آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ پہلے تھا بلکہ اس کی مقبولیت میں پہلے کی بہ نسبت اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس کی اصل کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ اہلِ ایران اس کو اپنی ملکیت قرار دیتے ہیں اور اس کی اصل "ہشت رنگ" بتاتے ہیں۔ ایرانیوں کے علاوہ یونانیوں، رومیوں مصریوں اور دیگر قدیم قوموں نے بھی اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا ہے۔ مگر یہ سارے دعوے غلط اور بے بنیاد محض ہیں۔ شطرنج ایک خالص ہندوستانی کھیل ہے۔ جو ابتداءً قدیم ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے درمیان کھیلا جاتا تھا۔ اس کے دو عناصر — ہاتھی اور رخ (جس کی اصل رتھ ہے اور جس کا ہندوستان سے خاص تعلق ہے) اس کے ہندی الاصل ہونے کا بیّن ثبوت فراہم کرتے ہیں اور پھر اس کا ذکر رامائن میں بھی موجود ہے[۱]
لفظ شطرنج کی اصل سنسکرت کا لفظ "چترنگ —— (CHATURANGA)
ہے جو قدیم ہندوستانی فوج کے چار دستوں (ہاتھی سوار، رتھ سوار، گھوڑ سوار اور پیدل فوج) کی نشاندہی کرتا ہے۔ (۲)

چھٹی صدی عیسوی میں نوشیروانِ عادل متوفّٰی ۵۷۹ء کے طبیب خاص، بزرجمہر

کے طفیل یہ ایران میں متعارف ہوا اور وہاں سے عہدِ عباسی کے اوائل (آٹھویں صدی عیسوی) میں شطرنج یا شِطرنج کی شکل میں سرزمین عرب میں جلوہ فگن ہوا۔ (۳)

ابتداءً یہ چار اشخاص کے مابین دو پانسوں کے ذریعہ کھیلا جاتا تھا اور اس کا تمام تر انحصار اتفاق اور تقدیر پر تھا لیکن بعد کو جب ہندو "دھرم شاستر" میں پانسہ اندازی کو ممنوع قرار دیا گیا تو یہ دو اشخاص کے مابین کھیلا جانے لگا اور اب پانسہ پھینکنے کے بجائے عقل و ذہانت کو بروئے کار لایا جانے لگا۔ اسی سبب سے ہندوستان میں اب یہ "بدھی بل" (قوتِ ذہن و عقل) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (۴)

حوالہ جات

۱۔ دیکھیے سید سلیمان ندوی : عرب و ہند کے تعلقات، الہ آباد، ۱۹۳۰، ص ۱۸۳

۲۔ ملاحظہ ہو Encyclopaedia Britanica, Vol. IV, 1970, p. 195

۳۔ دیکھیے پروفیسر خورشید احمد فارق : عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، دہلی ۱۹۴۳ء، ص ۳۲۱، ۳۲۴، مقبول احمد : Indo-Arab Relations دہلی ۱۹۶۹، ص ۱۸، اور Encyclopaedia Britanica Vol. IV, p. 195

۴۔ ملاحظہ ہو Encyclopaedia Britanica, Vol. IV, p. 195

وفیات

حکیم محمد سعید دہلوی آف ہمدرد دواخانہ پاکستان کی شہادت

کس قدر ظالم ہاتھ تھے اور کس قدر درندہ صفت دل کا وہ انسان نہیں حیوان رہا ہوگا جس نے فرشتہ صفت ہستی غریب انسانوں کا مسیحا، ملک و ملت کا خیر خواہ، پوری انسانیت کی فلاح و بہبودگی چاہنے والا، شرافت کا پیکر مجسم حکیم محمد سعید دہلوی پر گولیاں چلا کر آن کی آن میں ان کو شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جیسے ہی یہ خبر عوام الناس تک پہنچی کہ کراچی پاکستان میں ہمدرد دواخانہ کے مطب سے فراغت کے بعد جب حکیم محمد سعید دہلوی اپنی کار میں بیٹھنے لگے تو کچھ نامعلوم درندوں نے ان پر اندھادھند گولیاں چلانی شروع کر دیں جس سے وہ ان کا ڈرائیور اور تین ان کے ہمراہ اصحاب موقع پر جاں بحق ہوگئے۔ غم و صدمہ میں ڈوب گئے۔ اور ان سب کے منہ سے ایک چیخ نکل پڑی کہ ہائیں یہ کیا ہو گیا، کیا شرافت و انسانیت کا بھی قتل ہونا شروع ہوگیا ہے حکیم محمد سعید دہلوی شرافت انسانیت کی جیتی جاگتی تصویر تھے، وہ بڑے وضعدار انسان تھے انہوں نے دوسروں کے آرام کے لئے اپنا آرام چھوڑ دیا تھا۔ ان کا مقصد حیات صرف اور صرف بنی نوع آدم کی خدمت کرنا تھا اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے وہ انسانیت کی فلاح و بہبودگی کے کاموں ہی میں اپنے کو لگائے ہوئے تھے۔

تقسیم سے پہلے وہ اور ان کے برادر معظم ملک و ملت کی نادر روزگار ہستی حکیم عبدالحمید دہلوی حفظہ اللہ تعالیٰ متحدہ ہندوستان میں اپنے عظیم الشان کارناموں کی بدولت مشعل راہ تھے مجھے ان کی وہ صحبتیں یاد ہیں جب قبلہ آبا جان حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ اور ان کے مخصوص احباب حضرت قاضی سجاد حسینؒ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کی قربت میں حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی اور ان کے برادر خورد حکیم محمد سعید دہلوی بڑے سے بڑے مسائل پر تبادلۂ خیالات کر کے ان کے حل و تدارک کے لئے مستعد ہو جایا کرتے تھے۔ اکثر

ذہانت تھی اور حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی و حکیم محمد سعید دہلوی دونوں بھائیوں کی محبت اتفاق و اتحاد ضرب المثل تھا ملک و ملت کی فلاح و بہبودگی سے متعلق کوئی بھی کام ہوتا تو اس کی ذمہ داری یہ دونوں بھائی اپنے کاندھوں پر اٹھانا باعث فخر سمجھتے۔ تقسیم ملک کے بعد حکیم عبدالحمید دہلوی نے ہندوستان میں رہ کر ملک و ملت کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا تو حکیم محمد سعید دہلوی نے ہجرت جیسی سخت ترین مصیبت کو ہنسی خوشی جھیلتے ہوئے انسانیت کی فلاح و ترقی کے لئے پاکستان کی سرزمین میں کام کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بڑے بڑے ارب پتی نے بھی انسانیت کی فلاح کے لئے سوہ عظیم کام نہ کیا ہوگا جو بے سروسامانی کی حالت میں اکیلے دم پر حکیم محمد سعید دہلوی نے انجام دے دیا۔ کالج اسکول اسپتال سے لیکر چھوٹے بڑے تمام وہ کام انجام دیدیئے جو انسانیت کی بقاء ترقی اور ضرورت کے لئے ہوتے ہیں۔ بلکہ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ حکیم محمد سعید دہلوی نے پاکستان میں انسانیت کے لئے ایسے بہت سے عظیم کام انجام دیئے ہیں جس کو انجام دینے کے لئے حکومتِ پاکستان بھی اپنے کو بے بس سمجھتی رہی۔

جب مجھے ان کی شہادت کی خبر ملی تو میں خود دم بخود ہو کر رہ گیا دل و دماغ کو ایک زبردست ناقابل برداشت جھٹکا لگا۔ اور صدمہ سے تمام جسم کی وہ حالت ہو گئی کہ جو بیان سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم حکیم محمد سعید دہلوی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ خصوصیت سے دعا ہے کہ ان کے برادرِ معظم حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی کو اس عظیم حادثہ وفات پر پہاڑ جیسا غم جھیلنے کی توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین۔

دعائے صحت کی درخواست

مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے صاحبزادے اور "دین و دنیا" کے مفتی شوکت علی فہمی کے بڑے داماد مفتی نجیب الرحمان عثمانی گردہ کی بیماری کی وجہ سے پچھلے دنوں سینجیون نرسنگ ہوم میں تھے لیکن اب گھر پر ہیں تکلیف بدستور باقی ہے۔

معززین شہر، عمائدین ملک و ملت، مرکزی حکومت کے وزراء و ممبران پارلیمنٹ، سابق مرکزی وزیر جناب یونس سلیم اور محترم حضرت مولانا قاری محمد ادریس صاحب امام مسجد جامع نئی دہلی خصوصی طور پر ان کی مزاج پرسی کے لئے آچکے ہیں۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے ملت کے تمام افراد سے اپیل ہے کہ وہ حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے صاحبزادے اور میرے چھوٹے بھائی مفتی نجیب الرحمان عثمانی کی مکمل صحت یابی و تندرستی کے لئے مخصوص اوقات میں بارگاہ عالی اللہ رب العزت میں خصوصیت سے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کا التزام فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم و فضل سے صحت یابی اور عمر دراز عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

(ادارہ)

بقیہ صـ۱۵ کا

قطعہ کے پانچویں شعر سے تاریخ کی بابت وضاحت شروع ہوتی ہے کہ مادہ کے ابتدائی دو حرف "یہ"، میں پہلا حرف "ی" دسویں ماہ یعنی شوال کو بتلاتا ہے اور "ہ" پانچویں دن (روز خمیس) یعنی بدھ کو واضح کرتا ہے۔ اگرچہ جمعرات ہونا چاہیئے۔ شوال کا آخیر دن یعنی ۲۹ تاریخ تھی۔ زبر و بینات کی رو سے مادہ ۱۸۷۳ کا اظہار کرتا ہے۔ (جاری)

اس شمارے میں

زرِ تعاون
فی پرچہ ۶ روپے
سالانہ: ۷۲ روپے
کمپیوٹر کتابت
CREATIVE VISION

جملہ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ برہان
4136 - اُردو بازار جامع مسجد دہلی-110006 * فون نمبر 3262815

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۲۵ نومبر ۱۹۹۸ء کو ہندوستان کی چار ریاستوں مدھیہ پردیش، دہلی، راجستھان اور میزورم کی اسمبلیوں کے ہوئے انتخابات کے نتائج نے یہ بات تو اب بالکل صاف کردی ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمان سمجھداری، عقلمندی، دانشمندی اور دوراندیشی کے ساتھ اپنے حق رائے دہی کا استعمال کریں تو ہندوستان میں فرقہ پرستی کبھی بھی پنپ نہیں سکتی ہے۔ اور فرقہ پرستی کو کراری شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ بی جے پی بڑی حکمت عملی کے ساتھ اپنے جھاریتوں کو انتخابی میدان میں اتارا تھا۔ اور بڑی ہی چابکدستی کے ساتھ انتخابی مہم چلائی تھی ایک طرف ہندوتو کا کارڈ کھیلنے کی کوشش اور دوسری طرف سیکولرزم کے نام کی دہائی۔ مگر یہ سب باتیں بے اثر ثابت ہوئیں بلکہ ان دونوں باتوں سے بی جے پی کی ساکھ خراب ہی ہوتی رہی انتخابی جلسوں کے آخری دن دہلی کے لال قلعہ کے سامنے ہندوستان کے وزیراعظم جناب اٹل بہاری باجپئی نے بی جے پی کے حق میں لوگوں سے ووٹ دینے کی اپیل کرتے ہوئے بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں کہ جو بی جے پی کے ورکر کے لئے تو گوارہ ہوسکتی ہیں مگر ہندوستان کے وزیراعظم کے شایان شان قطعاً نہیں۔ ہندوستان کا وزیراعظم ہندوستان کے سیکولر آئین کی پاسداری و حفاظت کے لئے حلف اٹھاتا ہے اور جب وہ ہی وزیراعظم کوئی ایسی بات اپنے منہ سے نکال بیٹھے جس سے "سیکولرزم" پر "آنچ" آتی ہو تو پھر ایسے وزیراعظم کے بارے میں دانشور طبقہ کس طرح کا خیال ذہن میں پیدا کرے گا، لال قلعہ پر انتخابی جلسہ میں وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی نے کانگریس کی صدر شریمتی سونیا گاندھی سے غالباً ان کے عیسائی مذہب کی ہونے پر چٹکی لیتے ہوئے اس قسم کی بات کہی کہ جیسے انھیں ہندوستان میں عیسائیوں پر ظلم وستم ہی سے دکھ ہوتا ہے اور وہ سیاست میں شاید اسی لئے زیادہ مستعد نظر آتی ہیں۔ جب اخبارات میں عیسائی فرقہ پر ظلم وستم کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس قسم کی باتیں کرنا کیا ہندوستان

... وزیر اعظم کے لئے زیب دیتا ہے جو ہندوستان کے سیکولر آئین کی حفاظت و پاسداری کا حلف لئے بیٹھے ہو۔ انتخابی مہم کے دوران میں ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنا ایک ہنر بنتا جا رہا ہے لیکن جب اس قسم کے ہنر کی ترکیب اونچی کرسی پر فائز کسی انسان کی طرف سے عمل میں لائی جائے تو اسے دیکھ کر افسوس کے ساتھ دکھ اور تشویش کا ہونا قدرتی بات ہے۔

اس اسمبلی انتخابات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ووٹ فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور جب اس کا استعمال کسی ایک پارٹی کے حق میں کیا جاتا ہے تو وہ پارٹی مسند اقتدار پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے ووٹ بٹتے رہے ہیں دو پارٹیوں کے درمیان میں تیسرا شخص آکر مسلمانوں کے ووٹ میں حصہ پتی کر بیٹھتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلم ووٹ ایک جگہ نہ پڑ کر کئی جگہ بٹ جاتا تھا اور پھر اس کے نتیجہ میں فرقہ پرست فائدہ میں ہو جاتا تھا انتخابی نتائج کے وقت مسلمانوں کے ہاتھ سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا اور فرقہ پرستوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلنا شروع ہو جاتے تھے۔

لیکن اس کے لئے ہم مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرانا قطعاً پسند و گوارہ نہیں کریں گے اس کے لئے ہمیں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ اس کے لئے ذمہ دار وہ افراد اور جماعت ہے جو مسلمانوں کے ووٹ سے مسند اقتدار پر فائز رہتے ہوئے مسلمانوں کو ذرا بھی نہیں گردانتی رہی ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی کے آخری دور اقتدار میں جس طرح ہندوتو کا کارڈ کھیلا گیا اور مسلمانوں کو درکنار کرنے کے حربے استعمال کئے گئے اسے ہم اس ساری خرابی کا ذمہ دار کہیں گے جب ایک پارٹی اپنے اولین آئین سے ہٹتی نظر آتی تو پھر مسلمانوں کے لئے اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ بھی اپنی راہ الگ بنائیں اور پھر اس کا جو بھی انجام ہو وہ اگر مسلمانوں کے لئے بہتر نہیں ہے تو پھر خود اس جماعت کے لئے بھی کسی لحاظ سے اچھا نہ ہوا۔ اس کی بربادی و تباہی سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اور جب اپنی تباہی و بربادی سے وہ ابھر نہ سکی تو پھر اس کو ہوش آیا اور اس نے اپنی پچھلی کوتاہیوں، لغزشوں، غلطیوں کی طرف خیال کیا اس کے لئے نہ صرف معافی مانگی بلکہ اس کی تلافی کرنے کا بھی وعدہ کیا ـــــ انڈین نیشنل کانگریس جب اپنے بنیادی اصولوں سے کھسک گئی تو

نظرات

۲۵ر نومبر ۱۹۹۸ء کو ہندوستان کی چار ریاستوں مدھیہ پردیش، دہلی، راجستھان اور میزورم کی اسمبلیوں کے ہوئے انتخابات کے نتائج نے یہ بات تو اب بالکل صاف کردی ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمان سمجھداری، عقلمندی، دانشمندی اور دوراندیشی کے ساتھ اپنے حق رائے دہی کا استعمال کریں تو ہندوستان میں فرقہ پرستی کبھی بھی پنپ نہیں سکتی ہے۔ اور فرقہ پرستی کو کراری شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ بی جے پی بڑی حکمت عملی کے ساتھ اپنے مہارتیوں کو انتخابی میدان میں اتارا تھا۔ اور بڑی ہی چابکدستی کے ساتھ انتخابی مہم چلائی تھی ایک طرف ہندوتو کا کارڈ کھیلنے کی کوشش اور دوسری طرف سیکولرزم کے نام کی دہائی۔ مگر یہ سب باتیں بے اثر ثابت ہوئیں بلکہ ان دونوں باتوں سے بی جے پی کی ساکھ خراب ہی ہوتی رہی انتخابی جلسوں کے آخری دن دہلی کے لال قلعہ کے سامنے ہندوستان کے وزیراعظم جناب اٹل بہاری باجپئی نے بی جے پی کے حق میں لوگوں سے ووٹ دینے کی اپیل کرتے ہوئے بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں کہ جو بی جے پی کے ورکر کے لئے تو گوارہ ہوسکتی ہیں مگر ہندوستان کے وزیراعظم کے شایان شان قطعاً نہیں۔ ہندوستان کا وزیراعظم ہندوستان کے سیکولر آئین کی پاسداری وحفاظت کے لئے حلف اٹھاتا ہے اور جب وہ ہی وزیراعظم کوئی ایسی بات اپنے منہ سے نکال بیٹھے جس سے "سیکولرزم" پر "آنچ" آتی ہو تو پھر ایسے وزیراعظم کے بارے میں دانشور طبقہ کس طرح کا خیال ذہن میں پیدا کرے گا، لال قلعہ پر انتخابی جلسہ میں وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی نے کانگریس کی صدر شریمتی سونیا گاندھی سے غالباً ان کے عیسائی مذہب کی ہونے پر چٹکی لیتے ہوئے اس قسم کی بات کہی کہ جیسے انھیں ہندوستان میں عیسائیوں پر ظلم وستم ہی سے دکھ ہوتا ہے اور وہ سیاست میں شاید اسی لئے زیادہ مستعد نظر آتی ہیں۔ جب اخبارات میں عیسائی فرقہ پر ظلم وستم کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس قسم کی باتیں کرنا کیا ہندوستان

کے وزیر اعظم کے لئے زیب دیتا ہے جو ہندوستان کے سیکولر آئین کی حفاظت و پاسداری کا حلف لے چکے ہو۔ انتخابی مہم کے دوران میں ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنا ایک ہنر بنتا جا رہا ہے لیکن جب اس قسم کے ہنر کی ترکیب اونچی کرسی پر فائز کسی انسان کی طرف سے عمل میں لائی جائے تو اسے دیکھ کر افسوس کے ساتھ دکھ اور تشویش کا ہونا قدرتی بات ہے۔

اس اسمبلی انتخابات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ووٹ فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے اور جب اس کا استعمال کسی ایک پارٹی کے حق میں کیا جاتا ہے تو وہ پارٹی مسند اقتدار پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے ووٹ بٹتے رہے ہیں دو پارٹیوں کے درمیان میں تیسرا شخص آکر مسلمانوں کے ووٹ میں حصہ بٹا کر بیٹھتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلم ووٹ ایک جگہ نہ پڑ کر کئی جگہ بٹ جاتا تھا اور پھر اس کے نتیجہ میں فرقہ پرست فائدہ میں ہو جاتا تھا انتخابی نتائج کے وقت مسلمانوں کے ہاتھ سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا اور فرقہ پرستوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلنا شروع ہو جاتے تھے۔

لیکن اس کے لئے ہم مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرانا قطعاً پسند و گوارہ نہیں کریں گے اس کے لئے ہمیں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا پڑے گا کہ اس کے لئے ذمہ دار وہ افراد اور جماعت ہے جو مسلمانوں کے ووٹ سے مسند اقتدار پر فائز رہتے ہوئے مسلمانوں کو ذرا بھی نہیں گردانتی رہی ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی کے آخری دور اقتدار میں جس طرح ہندوتو کا کارڈ کھیلا گیا اور مسلمانوں کو درکنار کرنے کے حربے استعمال کئے گئے اسے ہم اس ساری خرابی کا ذمہ دار کہیں گے جب ایک پارٹی اپنے اولین آئین سے ہٹتی نظر آتی تو پھر مسلمانوں کے لئے اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ بھی اپنی راہ الگ بنائیں اور پھر اس کا جو بھی انجام ہو وہ اگر مسلمانوں کے لئے بہتر نہیں ہے تو پھر خود اس جماعت کے لئے بھی کسی لحاظ سے اچھا نہ ہوا۔ اس کی بربادی و تباہی سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اور جب اپنی تباہی و بربادی سے وہ ابھر نہ سکی تو پھر اس کو ہوش آیا اور اس نے اپنی پچھلی کوتاہیوں، لغزشوں، غلطیوں کی طرف خیال کیا اس کے لئے نہ صرف معافی مانگی بلکہ اس کی تلافی کرنے کا بھی وعدہ کیا ـــ انڈین نیشنل کانگریس جب اپنے بنیادی اصولوں سے کھسک گئی تو

پھر مسلمان بھی اپنی من مانی کرنے میں آزاد ہوگئے۔ اور انہوں نے اپنے ووٹ کا استعمال کانگریس کو سبق سکھانے کے لیے کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بابری مسجد کی مسماری نے ہندوستانی مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے انصاف پسند انسانوں کے دلوں کو رنج وغم سے چھلنی کر دیا ہندوستان کے شریف ہندؤں کو بھی بابری مسجد کی مسماری نے اسی طرح رونے پر مجبور کیا جس طرح مسلمان روئے اور بلبلائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے سیکولرازم کی بنیاد میں شگاف پڑا اور فرقہ پرست طاقتیں کھلے عام ہندوستان میں وہ سب کرنے پر اتر آئیں جو ملک کی یکجہتی و اتحاد کے لئے زبردست خطرہ ہیں۔ آخر اس صورت حال کو زیادہ دن کون برداشت کرسکتا تھا انڈین نیشنل کانگریس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور شریمتی سونیا گاندھی کی قیادت میں کانگریس نئے عزم نئے ولولہ اور جوش کے ساتھ میدان میں اتری اور اس نے مسلمانوں کے ساتھ دیگر اقلیتوں دلتوں کے زخموں پر مرہم رکھا جو کچھ ہوا اسے بھول جانے اور آئندہ ایسا کچھ نہ ہونے کا یقین دلایا گیا۔ دلت بھی مسلمان بھی اور اقلیتوں کے دیگر طبقے بھی کانگریس کی طرف جھک گئے کانگریس کی حمایت کرنے پر آمادہ و مائل ہوئے جس کی وجہ سے کانگریس ان اسمبلی انتخابات میں زبردست اکثریت سے کامیابی سے ہمکنار ہوگئی۔ دہلی اور راجستھان میں تو کانگریس نے ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کی اور مدھیہ پردیش میں اس نے اپنی پوزیشن کو قائم رکھا۔ میزورم میں مقامی حالات کے زیر اثر عوام نے اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال کرکے اس پارٹی کو کامیاب کرایا جو اس کے مسائل کو حل کرنے کی طرف زیادہ دھیان سے توجہ دینے کا وعدہ کرتی رہی۔ ملک کے حالات پر وہاں کوئی اثر نہ دکھائی دیا۔ ہندوتو کا وہاں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہاں وہ ہی پارٹی کامیاب ہوئی جو مقامی حالات کے تحت عوام کی توقعات پر پوری اترتی دکھائی دی۔

ایک طرف تو بی جے پی کہتی ہے کہ وہ ہندوستان کے سیکولر آئین کی ہر طرح حفاظت کرے گی دوسری طرف اس کی پارٹی کے کئی ذمہ دار افراد ہندوستان کے اسکولوں میں کالجوں میں کسی مذہب کی مخصوص دعاؤں کو پڑھانے کی لازمی پابندی کہنے کی بات کرنے لگے ہیں۔ سرسوتی وندنا اور بندے ماترم ایک مورتی سامنے رکھ کر پڑھنے کے لئے یوپی حکومت کی طرف سے ضروری کرنے کی خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ تو ہندوستان کی سیاست میں زبردست تہلکہ مچ گیا۔ سیکولرزم کی دہائی دینے والے

ازاد، یہ خبر بجلی کی طرح دل و دماغ کو دہلا گئی اور عالم اسلام کی زبردست مقتدر ہستی جناب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کا تو دن کا چین رات کی نیند ہی حرام ہو گئی۔ جو شخصیت و ہستی سیاست کے بکھیڑوں سے ہمیشہ دُور رہتی ہے اور جو کبھی پبلک جلسوں سے کتراتی رہی ہے آخر وہ بھی حکومت کی نیت خراب دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوئی کہ اگر سرسوتی وندنا اور بندے ماترم پڑھنے کی بات حکومت کی طرف سے لازمی قرار دے دیا گیا تو پھر مسلمانوں کو اپنے بچوں کو ان اسکولوں سے ہٹا لینا چاہیئے جہاں سرسوتی وندنا اور بندے ماترم پڑھنا لازمی ہو اس بات سے بی جے پی کی حکومت کو ہوش آیا اور اس نے اس سلسلے میں تردید کرنا ہی اپنے لئے عافیت کی بات سمجھی۔ یوپی کے وزیراعلیٰ کلیان سنگھ نے کہا کہ حکومت کی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے کہ جس سے یوپی کے اسکولوں میں سرسوتی وندنا اور بندے ماترم پڑھنا لازمی قرار دیا گیا ہو۔ حکومت کے ذمہ دار کی طرف سے اس پر تردید نے یہ معاملہ تو یہاں ختم کر دیا ہے لیکن اب اس قسم کی دیگر باتیں جو وقتاً فوقتاً کہی جاتی رہی ہیں یا کہی جائیں گی بہتر ہو کہ حکومت اس پر ابھی سے روک لگا دے اور اس قسم کی شر انگیز باتیں کہنے والوں کے خلاف قانونی کاروائی عمل میں لائے تو یہ ملک اور ملک کے آئین کے ساتھ وفاداری کا عمل ہوگا ہماری حکومت ہند کے ذمہ داران سے اپیل ہے کہ وہ سیکولر آئین کے خلاف باتیں کرنے والوں کے خلاف کڑی کاروائی کرے جب ہی ملک کے عوام کا اعتماد و یقین ہوگا اس حکومت کی ایمانداری اور نیک نیتی پر۔

ان اسمبلی انتخابات میں مہنگائی، تشدد اور بجلی و پانی کے مسائل سے عوام الناس کی پریشانیوں کا بھی زور و شور سے چرچا رہا۔ بی جے پی کی حکومت مہنگائی پر قابو پانے اور تشدد کے واقعات کی روک تھام کرنے اور پانی و بجلی کی دقتیں دور کرنے میں جس طرح ناکام دکھائی دی ہیں اس پر عوام نے اس کے خلاف ووٹ کا استعمال کر کے یہ بات واضح کر دی کہ جو پارٹی عوام کے بنیادی مسائل حل اور جان و مال کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ عوام اس سے حکومت کی کرسی چھین لیتے ہیں اب یہ ہی اصول سب کے لئے ہے اب عوام نے جس پارٹی کو حکومت کی باگ ڈور سونپی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملک میں سے مہنگائی کا خاتمہ کرے جمع خوروں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کرے ملک میں لا اینڈ آرڈر کے مسئلہ کو ہر صورت میں ترجیح دے آخر عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے بجلی پانی ضروریات زندگی

کی لازمی اشیا رہے اس کی طرف حکومت سے کسی بھی قسم کی کوتاہی ناقابل برداشت ہے۔ ہم ہل راجستھان اور مدھیہ پردیش میں انڈین نیشنل کانگریس کو اس کی شاندار کامیابی پر مبارک باد دیتے ہوئے اس سے توقع وامید رکھیں گے کہ وہ ان صوبوں میں اچھی اور شالی حکومت دے گی جس میں عوام الناس کو مہنگائی، تشدد اور پانی و بجلی کی پریشانی و مار سے نجات اور ہر شہری کو امن وچین اور راحت نصیب ہوگی۔

گذشتہ دنوں ہندوستان کی علمی شخصیت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کی رہائش گاہ مہمان خانہ میں تلاشی لی گئی اس سے دنیا بھر کے مسلمانوں اور انصاف پسند وانسانیت نواز غیر مسلموں میں غم و غصہ پیدا ہونا لازمی تھا چنانچہ ہر طرف سے اس تلاشی کے خلاف احتجاج کیا گیا جمعیۃ علماء ہند نے اسے ملک دشمنی سے تعبیر کیا کتنے ہی اداروں اور تنظیموں نے اس تلاشی کے واقعہ کی سخت ترین مذمت کی۔ مقام شکر ہے کہ حکومت یو پی کو جلد ہوش آگیا اور اس نے یہ کہہ کر اپنی جان بچائی کہ حکومت کی طرف سے حضرت مولانا علی میاں کے ہاں تلاشی کی کوئی ہدایت جاری نہیں کی گئی یہ حرکت جس نے بھی کی ہے بہر حال قابل مذمت ہے اور حکومت اس کی تحقیقات کرائے گی اور جو بھی اس مذموم حرکت کا ذمہ دار ہوگا اس کے خلاف سخت کارروائی کرنے سے حکومت قطعاً دریغ نہیں کرے گی۔ حکومت یو پی کے تردیدی بیان کے بعد ہم اس بات کو یہیں ختم کرتے ہیں ورنہ تو ہمارا دل رو رہا تھا کہ ایک ایسی ہستی جو ہندوستان کی شان ہے ہندوستانی عزت ہے ہندوستان کا وقار ہے اور جس کی وجہ سے عالم اسلام میں ہندوستان کی سربلندی ہے اس ہستی کو اس طرح کی بچکانہ وشرمناک حرکات کرکے ستایا جائے یہ کسی بھی طرح قابل معافی نہیں ہے۔ اچھا ہوا کہ حکومت یو پی نے اس مذموم حرکت پر اپنے کو فوری طور پر بری الذمہ کرلیا۔ اگر خدا نخواستہ حکومت یو پی کی اس طرف سے خاموشی رہتی تو نہ معلوم حالات کس قدر خطرناک صورت اختیار کر جاتے اس کے تصور و خیال ہی سے دل و دماغ میں لرزہ پیدا ہو رہا ہے۔ اب ہمیں اس کا انتظار بے چینی سے رہے گا۔ کہ حکومت یو پی اپنے وعدہ کے مطابق اس تلاشی کے ذمہ دار افراد کی نشان دہی کرکے کب انھیں کیفر کردار تک پہنچائے گی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس پر ہندوستان کے ہی نہیں تمام دنیا کے مسلمانوں کو فخر و ناز ہے۔

غیبت کی مذمت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

مفتی محمد خبیر ندوی ایم اے علیگ

شریعت اسلامیہ مطہرہ نے انسانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کی بابت خصوصی تاکید فرمائی ہے چنانچہ اللہ رب العزت نے ایسی تمام ناشائستہ حرکتوں کو جو عزت و ناموس کو پامال کرنے کے مترادف ہیں ان کو قطعی طور پر حرام فرما کر ـــــ پوری انسانی برادری کو باہمی تعلقات خوشگوار رکھنے کی ہر موقع پر ترغیب دی ہے اور متعدد مقامات پر اس کی شناعت و قباحت کو واضح انداز سے بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے مذہب اسلام نے عزت و آبرو کو خاک میں ملانے والی مرکزی حیثیت کی حامل غیبت کو قرآن کریم کے ذریعہ صراحۃً حرام قرار دے دیا ہے۔ اور اس کی قباحت کو مکمل ایک سورۃ میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے۔

"اور تم میں سے ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سب کا خیال کرنے والا اور خوب رحم کرنے والا ہے۔" (سورۂ حجرات/۲۰)

مذکورہ بالا آیت قرآنیہ سے معلوم ہوا انسانوں خصوصاً مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری حرام ہے اور شرعی اصطلاح میں پردہ دری کا دوسرا نام غیبت ہے۔ یہ اور بات ہے موجودہ دور کا مسلمان غیبت کو نہایت معمولی گناہ سمجھ کر اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے کر دوسروں کی عزت و آبرو لوٹنے کو ذاتی فخر قرار دیتا ہے۔ اور ـــ طرفہ تماشہ یہ ہے غیبت کرنے والا اس کو غیبت تصور کرنے سے بھی کتراتا ہے اور اس برائی کرنے کو اظہار حقیقت کا عنوان دے کر لوگوں میں اس کی ترغیب بھی دیتا ہے جبکہ وہ اپنے اس "اظہار حقیقت" کے قول سے دوگنے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے ۱۔ عظیم ترین اور غیر معمولی

گناہ کبیرہ کو نہایت ہلکا اور معمولی سا قرار دے رہا ہے۔

۲۔ غیبت کرکے دوسرے کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا رہا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور احادیث شریفہ کی روشنی میں غیبت کی حقیقت اور اس کی شناعت و قباحت پر تفصیلی نظر ڈالی جائے اور اس کے خطرناک نتائج سے واقفیت حاصل کرکے اس سے بچنے کی تدبیر کی جائے۔

قرآن کریم اور غیبت

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر غیبت کی مذمت بیان کرکے نہایت بلیغ انداز سے اس کی تباہی و خطرناکی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

۱۔ تم میں سے کوئی کسی کی اس کی پیٹھ پیچھے غیبت اور برائی نہ کرے (حجرات/۲)

۲۔ لوگوں پر آوازیں کسا کرتا ہے۔ (سورۂ قلم/۱)

۳۔ ہر وہ شخص جو لوگوں کی عیب جینی کرتا ہے اسکی بڑی تباہی ہے۔ (سورۂ ھمزہ/۱)

۴۔ اللہ تعالیٰ کو بدگوئی پسند نہیں آتی۔ (سورۂ نساء/۲،۱)

آیات مذکورہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیبت کا ہر پہلو مذموم ہے خواہ وہ اشارۃً ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اصحاب لغت قرآن کریم میں واقع الفاظ متعلقہ غیبت کی توضیح فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ھمز اور لمز میں ہر طرح کی غیبت شامل ہے مثال کے طور پر ھمز میں (۱) سامنے غیبت کرنا (۲) نسب کی برائی کرنا (۳) ہاتھ کے اشارہ سے غیبت کرنا (۴) زبان سے غیبت کرنا (۵) برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا اور لمز میں پیٹھ پیچھے برائی کرنا (۲) آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا (۳) آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو غرضیکہ تمام اشاروں سے غیبت کرنا شامل ہے۔ (لغات القرآن، ومفردات القرآن)

غیبت کی مذمت و قباحت احادیث نبویہ کی روشنی میں

اصحابی رسول حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ تمہیں معلوم

ہے کہ غیبت کی حقیقت کیا ہے ــــ؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ــــ غیبت کی حقیقت کے بارے میں سب سے زیادہ صحیح علم اللہ رب العزت اور پیارے رسول کریمؐ کو ہی ہے ــــ اس پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ــــ! غیبت کی حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو اس طریقہ سے یاد کرے اور اس کا ذکر اس طرح سے کرے جس سے اسکو ناگواری، تکلیف اور خفت محسوس ہو، اور اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرے جس کو وہ ناپسند کرے ــــ کسی نے عرض کیا ــــ کیا ایسی ناگوار اور تکلیف دہ بات کا ذکر کرنا جو اس میں واقعۃً موجود ہو۔ اور اس میں وہ عیوب پائے بھی جاتے ہوں یہ بھی غیبت میں داخل ہے ــــ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ جی ہاں، وہ عیوب، اور وہ تکلیف دہ بات جسکا ذکر اس کو ناگوار ہو وہ اس میں پائی بھی جاتی ہو جب ہی تو وہ غیبت ہے ــــ اور ــــ اگر ایسا نہ ہو کہ اس میں وہ عیب موجود ہی نہ ہو پھر تو وہ تہمت اور بہتان ہے (مسلم شریف ج ۲ ص ۳۲۲، ابوداؤد ج ۲ ص ۶۶۸)

۲ - ایک حدیث میں فرمان نبویؐ ہے "سب سے زیادہ برے لوگ وہ ہیں جو چغل خوری کرتے اور چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوسروں کے آپسی تعلقات خراب کرتے رہتے ہیں"

(حضرت اسماء بنت یزید بروایت مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۹)

۳ - آپؐ کی حیات مبارکہ میں ایک مرتبہ شہر میں بدبو پھیل گئی۔ اس کی بابت آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا! تم جانتے ہو یہ بدبو کیسی ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں۔

(حضرت جابر بن عبداللہ بروایت ادب المفرد، و مسند احمد)

۴ - معراج جیسی عظیم الشان رات میں حضور اکرمؐ کا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جس کے ناخن تانبے کے سے تھے۔ اور وہ قوم اپنے ان ناخنوں سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہی تھی ــــ حضورؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس بابت دریافت کیا ــــ جس کے جواب میں حضرت جبرئیلؑ نے ارشاد فرمایا۔ رسول محترم یہ وہی قوم ہے جو لوگوں کا گوشت کھاتی پھرتی تھی اور لوگوں کی غیبت کر کر کے اس کی عزت و آبرو پر حملہ کیا کرتی رہتی تھی

(حضرت انس بن مالک رضؓ بروایت ابوداؤد ج ۳ ص ۶۶۹)

۵ ۔ ایک حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کرنے کو زنا سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے چنانچہ فرمان نبوی ہے۔

" غیبت کرنا زنا کاری سے بھی زیادہ سخت ترین جرم ہے" (امام بیہقی بروایت شعب الایمان)

۶ ۔ ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کرنے والوں کو منافقین جیسے بُرے افراد کی فہرست میں شمار فرمایا ہے۔ (حضرت ابو برزہ اسلمی بروایت ابوداؤد)

۷ ۔ ایک مرتبہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ نے ایک خاتون کی نقل اتاری جو اس خاتون کے لئے باعث تکلیف تھی چنانچہ آپؐ نے اس پر نکیر فرماتے ہوئے اپنی شدید خفگی ظاہر فرمائی۔ (ایضاً)

مذکورہ بالا احادیث نبویہ کی روشنی میں غیبت کی حقیقت اور اس کی قباحت واضح ہوگئی کہ غیبت نہایت ذلیل، گھناؤنی حرکت ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ میں فتنہ و فساد بھڑکانے میں مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ اور معاشرہ اس کی لپیٹ میں خون کی ہولی کھیلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

امام وقت حضرت امام غزالیؒ اپنی مایہ ناز عرفانی و روحانی کتاب احیاء العلوم میں اس کے مفاسد کی نشاندہی فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ " چونکہ تصریح، تعریض، اور اشارات تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کئے جاسکتے ہیں اور ہر شخص دوسرے کے حسب نسب، اخلاق عادات، دین و دنیا طریقہ معاشرت زندگی بود و باش جسم اور کپڑے وغیرہ غرضیکہ ہر ہر چیز میں انسان عیب نکال سکتا ہے اس لئے یہ سب چیزیں غیبت میں داخل ہیں ان سب سے بچنا چاہیئے۔"

(احیاء العلوم ج ۳ ص ۲۰۱)

غیبت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ خداوند قدوس میدان حشر میں غیبت کرنے والے کی تمام نیکیاں ان تمام لوگوں میں تقسیم کردے گا جن کی اس نے غیبت کی ہوگی اس کے ساتھ مزید براں یہ ہوگا کہ جب اس غیبت کرنے والے کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی

تو اب ان تمام لوگوں کے گناہوں کو اس شخص کے ذمہ منتقل کر دیا جائے گا جس کا بالآخر انجام یہ ہوگا کہ وہ گناہوں کے بوجھ سے بوجھل ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں غیبت کرنے والا شخص دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ جہاں اسے مختلف قسم کے دردناک عذاب سے واسطہ ہوگا اور جہاں اس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔

موجودہ وقت میں غیبت کو نہایت معمولی گناہ سمجھ کر اس میں خوب دلچسپی لی جاتی ہے جبکہ علمائے امت نے بالاجماع غیبت کو کبائر میں شمار کیا ہے چنانچہ امام قرطبیؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ غیبت گناہِ کبیرہ ہے مگر افسوس کہ اس وقت لوگ دن رات لوگوں کی غیبتیں کیا کرتے ہیں اور ہر امیر و فقیر کو سنا کر ہر کس و ناکس کا گوشت وہ بھی مردار گوشت کھا کر معاشرہ میں فتنہ و فساد پھیلانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس وقت عوام الناس کے ساتھ ساتھ علماء اور حفاظ بھی برابر کے شریک ہیں کہ ایک عالم دوسرے عالم کی، اور ایک حافظ دوسرے حافظ کی خوب جی بھر کر غیبت کرتا ہے اور اپنے آپ میں سرخروئی حاصل کر کے آخرت میں دوگنے عذاب کا مستحق بن جاتا ہے۔

غیبت کے احکام: غیبت کے سلسلہ میں متعدد احکامات کتب فقہ میں نقل کئے گئے ہیں اور غیبت کی قسمیں تفصیلی طور پر بیان کر کے ان کا شرعی حکم بھی واضح کیا گیا ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تقسیم غیبت باعتبار اسلام و غیر اسلام وغیرہ۔
۲۔ تقسیم غیبت باعتبار معاہدہ وغیرہ
۳۔ تقسیم غیبت باعتبار اجسام و ابدان، دلباس، وغیرہ۔
۴۔ تقسیم غیبت باعتبار زندگی و موت وغیرہ
۵۔ تقسیم غیبت باعتبار بالغ و غیر بالغ، نیز عاقل و غیر عاقل وغیرہ
۶۔ تقسیم غیبت باعتبار طرز زندگی و بود و باش وغیرہ
۷۔ تقسیم غیبت باعتبار حسب و نسب، و خاندان وغیرہ۔

۸ - تقسیم غیبت باعتبار اطوار و عادات وغیرہ
۹ - تقسیم غیبت باعتبار عبادات و مذہبی رسومات وغیرہ
۱۰ - تقسیم غیبت باعتبار اقوال، افعال، اعمال وغیرہ
۱۱ - تقسیم غیبت باعتبار نقل و حکایت، وصراحت و اشارہ و تعریض وغیرہ۔

یہ مجموعی طور پر گیارہ قسمیں ہوئیں، ان میں سے ہر قسم کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلی قسم :- الف : پہلی قسم یہ ہے کہ غیبت کرنے والا کون ہے اور کس شخص کی غیبت کر رہا ہے قرآن کریم کی آیت ولا یغتب بعضکم بعضاً سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان شخص کی غیبت ہر حال میں قطعی طور پر حرام ہے کیونکہ بعضکم میں کم کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہے اور آیت کے معانی یہ ہوئے کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کی غیبت نہ کرے لہذا کسی مسلمان کی غیبت درست نہیں ہے۔

ب) غیر مسلم کی غیبت : غیر مسلم کی غیبت اسلام دشمنی کی وجہ سے بعض حالات میں درست ہے جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ صاحبِ تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازیؒ نے بعضکم بعضا کی تفسیر بیان کرتے وقت تحریر فرمایا ہے کہ کافر اور غیر مسلم کی غیبت درست ہے، لیکن اگر فتنہ کا اندیشہ ہو تو اس وقت احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ ایسے میں کافر کی بھی غیبت سے احتراز کیا جائے۔

دوسری قسم : ایسے شخص کی غیبت کی جائے جسے مسلمانوں نے امن دے دیا ہو یا مسلمانوں سے اس کا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو یا اس شخص نے دارالاسلام میں مطیع و فرماں بردار ہو کر رہنے کا عہد کر لیا ہو جسے عرف عام میں ذمی کہتے ہیں ان تینوں صورتوں میں غیبت کرنا درست نہیں ہے کیونکہ جب یہ افراد مسلمانوں کے تابع ہو گئے تو ان سب کی عزت و آبرو اور ان سب کی جان و مال مؤمنین کی مانند ہو گئی اور مسلمانوں کی طرح ان سب کی غیبت کرنا بھی حرام ہے جیسا کہ صاحب درمختار نے درمختار میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔

تیسری قسم :- (الف) جو لوگ وفات پا چکے ہیں ان کی غیبت کرنا اور ان کو برا بھلا کہنا یعنی مُردوں کی غیبت کرنا۔ تو اس سلسلہ میں واضح رہے کہ زندوں کی طرح مُردوں کو گالی دینا، برا کہنا، ان کی غیبت کرنا اور ان کے عیوب بیان کرنا یہ سب حرام ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پا جانے والوں کی غیبت کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے چاہے وہ وفات پا جانے والے افراد زندگی میں گناہوں میں کثرت سے مبتلا رہے ہوں پھر بھی ان کی غیبت نہیں کرنی چاہیئے چنانچہ متعدد احادیث مبارکہ میں مُردوں کی غیبت کرنے سے منع

فرمایا گیا ہے۔ چند حدیثیں ملاحظہ ہو :

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا مات احدکم فدعوہ ولا تقعوا فیہ ۔ (ابوداؤد) کہ جب تم لوگوں میں سے کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دو، اور اس کی غیبت نہ کرو۔

(۲) اور ایک دوسری حدیث میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے لا تسبوا الاموات، فانھم افضوا الی ما قدموا ۔ کہ جو لوگ اللہ کے حضور پہونچ چکے اور اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف کوچ کر چکے ایسے لوگوں کو بُرا مت کہو اور نہ ہی انکو گالی دو، کیونکہ انہوں نے دنیاوی زندگی میں جیسے اعمال کئے تھے وہ ان کی جزاء و سزا تک پہونچ چکے ہیں اور انکو ان کے اعمال کا بدلہ مل چکا ہے ۔

(ابن حبان و کتاب الترغیب والترہیب)

(۳) ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اذکروا محاسن موتاکم، وکفوا عن ساویھم : کہ تم لوگ (مسلمانو) وفات پا جانے والوں کے محاسن، ان کے اوصاف حمیدہ اور ان کی اچھی عادتیں ذکر کیا کرو ان میں جو جو خوبیاں تھیں انکو بیان کیا کرو اور ان سے جو کوتاہیاں سرزد ہوگئی ہوں ان کے بارے میں اپنی زبان کو روکے رکھو اور کبھی غفلت میں بھی ان کی ان کوتاہیوں اور برائیوں کو ذکر نہ کرو۔ (ابوداؤد شریف)

حضرات صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت ابو داؤدؓ کے متعلق حضرت امام غزالی نے احیاء العلوم میں تحریر فرمایا ہے کہ ہر دو حضراتؓ اکثر قبرستان جایا کرتے تھے اور جب لوگوں نے کثرت سے قبرستان جانے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ قبرستان جا کر ایسے لوگوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے جو آخرت کو یاد دلاتے ہیں اور زندوں کے برخلاف نہ تو ہماری شکایتیں کرتے ہیں اور نہ ہی غیبت کرتے ہیں۔

(احیاء العلوم صفحہ ۲۰۱/۳)

نیز اس موقع پر یہ بھی خیال رہے کہ (۱) بعض اوقات مرنے والے کا چہرہ کسی وجہ سے سیاہ ہو جاتا ہے (۲) یا بعض وقت مرتے وقت کلمہ لا الہ الا اللہ زبان سے نہیں نکلتا ہے (۳) یا دفن کرتے وقت کسی عذاب الٰہی کا ظہور اور مشاہدہ ہو جاتا ہے تو لوگ ایسے شخص کو بہت لعنت ملامت کرتے ہیں اور اس شخص کی بدنصیبی کا ذکر کرکے اسے منحوس سمجھتے ہیں واضح رہے یہ بھی غیبت میں داخل ہے لہذا ایسے گناہگار کی

میں پھیلانے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے فرماتے ہیں "میرے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد اظہار الحق لکھنویؒ کے انتقال کے وقت ان کی زبان سے کلمہ نہ نکلا اور تجہیز و تکفین کرکے سب لوگ گھر سے باہر نکل آئے تو کچھ لوگوں نے بطور طعن چند جملے ایسے کہے جو بہت خطرناک تھے اور یہاں تک کہا گیا کہ واہ کیسے مولانا تھے ظاہر میں تو نہایت متقی اور پرہیزگار تھے لیکن مرتے وقت زبان سے کلمہ بھی نہ نکل سکا۔ یہ بات گھر والوں کے لئے بہت زیادہ تکلیف کا باعث ہوئی اور ہم سب کو بہت رنج ہوا ابھی رنج و غم کی کیفیت طاری ہی تھی کہ حضرت مولانا مرحومؒ نے دونوں پاؤں سمیٹتے ہوئے بلند آواز سے کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھا کہ حاضرین تک نے اس کو سنا اور لعن و طعن کرنے والوں تک کو بھی اس کلمہ کی آواز سنائی دی تب ان لوگوں نے معافی مانگی اور انھیں کو لوگوں نے مطعون کیا۔

(زجر الشبان والشیبۃ عن ارتکاب الغیبۃ ص۱۹)

(ب) **زندوں کی غیبت کرنا:** یہ عام ہے خواہ زندوں میں اپنے رشتہ دار ہوں یا عام لوگ سبکی غیبت کرنا گناہ کبیرہ ہے۔

چوتھی قسم: بالغ اور غیر بالغ نیز عاقل اور غیر عاقل کے اعتبار سے غیبت کرنا۔ کہ اگر وہ غیر بالغ یا غیر عاقل (دیوانہ) جو اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہو اور اپنی برائی کے بیان ہونے سے ناخوش، ہر دو حالتوں میں ایسے دیوانوں اور نابالغوں کی غیبت بھی ناجائز ہے۔

البتہ بعض فقہاء نے ایسے دیوانوں کی بابت جو اپنے عیوب کے بیان ہونے سے نہ تو ناخوش ہوتے ہوں اور نہ ہی اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہوں تو ایسے دیوانوں کی غیبت درست ہے بشرطیکہ اس کا کوئی ولی اور قرابت دار نہ ہو تاکہ اس سے اس کو رنج نہ ہو سکے۔ لیکن فقہاء نے ایسے لوگوں کی غیبت کرنے سے بھی منع کیا ہے۔

پانچویں قسم: کسی کی اس کے جسم، لباس اور اعضاء کے اعتبار سے غیبت کرنا۔ جس کا مقصد ذلیل کرنا اور رسوا کرنا ہو، مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شخص بہت موٹا ہے۔ فلاں بہت پستہ قد اور کوتاہ قد ہے۔ اس کی ناک بہت لمبی ہے اس کی آنکھ بہت چھوٹی ہے، یہ شخص بہت زیادہ کالا ہے۔ وہ تو بہرا ہے، یہ تو کم سنتا ہے وہ تو اتنا اندھا ہے کہ کسی چیز کو دیکھتا ہی نہیں، اس کا ہاتھ ایک طرف سے لمبا ہے۔ اس کا ایک پیر چھوٹا ہے۔

وہ توحد سے زیادہ طویل ہے۔ غرضیکہ بدن اور جسم کے وہ عیوب بیان کرنا جس سے کہ متعلقہ اشخاص کی تحقیر ہو۔ ان سب کی ممانعت ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ صرف اس وجہ سے ناراضگی ظاہر کی تھی کہ انہوں نے ایک خاتون کے پستہ قد ہونے کو عیب دار بتایا تھا۔

(ابو داؤد شریف)

چھٹی قسم: کسی کے طرز زندگی پر کیچڑ اچھالنا، کہ فلاں تو نہایت غیر مہذب طریقے سے زندگی گذار رہا ہے اور فلاں کے طریقہ زندگی میں یہ خرابیاں ہیں۔ کھانا بے ڈھنگے طریقہ سے کھاتا ہے، پانی ایک ہی سانس میں جانوروں کی طرح پی جاتا ہے وغیرہ۔

ساتویں قسم: کسی کو نسب کے اعتبار سے بدنام اور رسوا کرنا کہ ارے تم کیا بات کرتے ہو اس کا تو نسب تک درست نہیں ہے اور فلاں فلاں لوگوں کے آباء واجداد نہایت رذیل تھے وغیرہ، اور یہ مرض تو اب بہت عام ہوگیا ہے کہ ذات پات کی بنیاد پر پوری پوری عصبیت جاہلیہ کی عمارتیں کھڑی کی جاتی ہیں۔

آٹھویں قسم: معاشرہ میں بعض فطری کمزوریوں پر نشاندہی کرتے ہوئے اس کے عادات واطوار پر انگلی اٹھانا۔ فلاں بہت سوتا ہے۔ اسے کام کرنے کا سلیقہ نہیں وہ تو نہایت بے وقوف شخص معلوم ہوتا ہے ارے وہ تو نہایت بازاری قسم کا آدمی ہے۔ ہمیشہ لوگوں کو اس کی بے وقوفی سے پریشان ہونا پڑتا ہے۔ سونے پر آجائے تو دن چڑھے تک سوتا ہی رہتا ہے وغیرہ

نویں قسم: کسی شخص کی عبادات میں خامی اور کمی تلاش کرنا، اور اس کو عام کرنا، مثلاً فلاں رکوع صحیح طریقہ سے ادا نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اچھی طرح نماز پڑھتا ہے۔ تہجد سے تو اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور نوافل کا حال اللہ جانے، اگر کبھی نماز کی توفیق ہوگئی تو مکروہ وقت میں ادا کرتا ہے۔ غرضیکہ اس کی مذہبی عبادات میں نقصان تلاش کرکے اس کو رسوائی کا ذریعہ بنانا۔

دسویں قسم: کسی کی بات، کسی کی کوئی حرکت، اور کسی کا کوئی کام اس انداز سے پیش کرنا کہ اصل فرد کو جب وہ بات معلوم ہو تو رنج پہونچے، مثلاً فلاں تو بہت جھوٹ بولتا ہے، اور شراب پینے کی تو اس کو عام عادت ہے، اکثر چوری کرتا ہے، فلاں بہت بدزبان ہے بات بات پر گالی دیتا ہے۔ غرضیکہ اس کی کوئی معمولی سی حرکت بے جا کو بڑی غیر معمولی حرکت کے طور پر پیش کرکے اس کو رسوا کرنا۔ بدقسمتی سے یہ مرض آج کے علمائے سو میں بہت عام ہوگیا ہے۔

— —

یارہویں قسم : کسی کی غیبت کرنا اس کے کسی واقعہ کو بنیاد بناکر، یا اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب
سکے یہ غیبت صراحۃً بھی ہوتی ہے اور کبھی یہ غیبت اشارۃً بھی ہوتی ہے چنانچہ بعض مرتبہ ایک شخص
ب مجلس میں بیٹھا ہوا ہے اسے علم نہیں ہے لیکن فتنہ پرور شخص اس کی طرف اشارہ اور کنایہ سے ایسی کوئی
ت منسوب کرتا ہے جو باعث تکلیف ہوتی ہے۔ کبھی کوئی لنگڑا ہے یا لولا ہے اب دوسرا شخص جو تندرست
ا ہے وہ اس کے لنگڑے پن کی نقل اتارتا ہے۔ کوئی بولنے میں معذور ہے تو دوسرا شخص اس کے گونگے
ی نقل اتارتا ہے۔ بعض اوقات ایک شخص کسی کا نام نہیں لیتا لیکن قرائن ایسے پیش کرتا ہے کہ ہر شخص
ذہن متعین شخص کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے غرضیکہ نقل و حکایت، صراحۃ و اشارہ ہر طریقے سے
بت کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا قسمیں تو اس وقت عام ہیں اور یہ سب قسمیں غیبت میں داخل ہیں لہٰذا ہمیں ان تمام
کورہ بالا طریقوں سے بچکر زندگی گزارنا چاہیئے اور کسی بھی طریقہ سے خواہ وہ مذہب کے نام پر ہو، جسم
ر لباس کے اعتبار سے ہو، طرز زندگی اور طریقۂ عبادات کے اعتبار سے ہو یا حسب نسب اور خاندان
ے اعتبار سے ہو ہر طریقہ کی غیبت حرام ہے۔ اور اس کی قرآن و سنت میں عام ممانعت ہے لہٰذا ہم
ن تمام اقسام میں غور کرکے غیبت کے ہر طریقہ سے بچ کر اس بدترین کبیرہ گناہ سے خود کو محفوظ رکھ
ر خالص اسلامی طریقہ پر زندگی گزارنے کا عہد کریں اور اسلامی معاشرہ میں اسلامی تعلیمات کو
ام کرنے کا ذریعہ بن کر لوگوں کو اپنے کیرکٹر اور کردار سے اسلام قبول کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں۔
اللہ رب العزت ہم سب کو غیبت سے محفوظ فرما کر اپنی خوشنودی عطا فرمائے۔ (آمین)

قسط ۳

قطعاتِ وفات شعرائے اُردو

عبدالرؤف خان ایم اے ہسٹری اودے کالج (راج)

یا ہا پا نون جیم نا نون کاف الف ہا یا نون واو حا ہا الف نون یا سین ہا یا الف نون یا سین ۱۸۷۳ نیز پہلے مصرع میں "ملا یکتا" سے مراد ایک عدد کا تدخلہ ہے لہذا ۱۸۷۴ء لیکن ہجری سنہ کے لئے ہمارے معلومات کی حد تک کئی حضرات نے بغیر حل کے آگے ۱۲۹۱ رکھ دیا ہے۔ جبکہ ہجری سنہ زبر و بینہ کے ذریعہ نہیں بلکہ ضعتِ ضرب میں ہے۔ قرینہ پنجتن سے واضح ہے یعنی برائے ہجری سنہ مادہ " انیس ہائے انیس" ہے جن کے اعداد (۲۵۸) ہوتے ہیں۔ ان کو پانچ سے ضرب دیا تو ۵×۲۵۸ = ۱۲۹۰ حاصل ضرب آیا۔ اس میں "ملا یکتا" کی رو سے ایک عدد کا تدخلہ کر دیا تو ۱۲۹۱ حاصل ہو گیا۔ رئیس سلیس، نفیس وغیرہ انیس کے بیٹے اور جلیس پوتے کا نام ہے۔ آغا حجو شرف نے بھی بہت عمدہ تاریخی قطعہ کہا :-

شبیر کی وِلا سے جنابِ انیسؔ کو　　فردوس میں ملا ہے عجب گلشنِ نفیس

دنیا میں انکو عشقِ دلی تھا حسینؓ سے　　مدّاح تھے یہ، معتقد ان کے تھے سب رئیس

منبر ملا جناں میں تو رضواں نے یوں کہا　　تم ہو خطیب عرشِ الٰہی کے ہم جلیس

اُن کے بیاں پہ وجد میں روح القدس ہوئے　　کہنے لگے سنی نہیں ایسی زباں سلیس

عالم نے کی دعا منہ رحلت میں اے شرفؔ

"روحِ امین عرش مبارک ہوائے انیسؔ" ۲۵　　۱۲۹۱ھ

---

۲۵ ماہنامہ آجکل نئی دہلی نومبر ۱۹۸۷ء ص ۱۰

[illegible] "کاذب بکم" "[illegible] کلیم اللہ [illegible]" ۱۲۹۱ھ

[illegible] کا زبردست اختلافات ہیں کیونکہ مادہ مختلف ٹکڑوں کے زبر یا بینہ یا زبر و بینات لیتے ہوئے حل کیا گیا ہے مثلاً ایک حل ملاحظہ فرمائیں :۔

" طور سینا " کا زبر (۳۳۶) " بے " کا زبر و بینہ (۱۴) " کلیم اللہ " کا زبر (۱۶۶) " و منبر بے [illegible] " کا زبر و بینات (۷۷۵) = ۱۲۹۱ھ ۔ یعنی مکمل مادہ صنعت زبر و بینہ میں نہیں ہے ۔ اس طرح ٹکڑوں میں تاریخ کم از کم بیس طرح حل ہوتی ہے گویا نہایت دماغ سوز اور بکھیڑے بھری ہے جو علاحدہ مضمون کی متقاضی ہے ۔ بعض دیگر تاریخوں کو ہم نے مضمون کی طوالت کے مد نظر یہاں حذف کر دیا ہے ۔

دبیر : سلامت علی نام ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۔ چھ سات برس کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے ۔ پندرہ برس کی عمر میں مرثیہ گوئی شروع کی اور آخری دم تک مراثی کہتے رہے ۔ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ ہی میں وفات پائی ۔ سید حسن لطافت نے تاریخ کہی ، جو لطیف تعمیہ (تخرجہ) میں ہے ۔

صائبِ وقت انوریِ عصر سحبانِ جہاں	دعبلِ دوران و حسانِ زماں مرزا دبیر
صاحبِ عز و شرف مداحِ آلِ مصطفٰے	تھے فرزدقِ مرتبہ روح القدس کے ہمصفیر
سمتِ ملکِ جاوداں اس دارِ فانی سے گئے	داغ بر دل ، خاک بر سر ، غم سے ہیں برنا و پیر
روز سہ شنبہ تھا اور سلخ[عہ] محرم وقت صبح	ماتم شہ میں ہوئے یہ ماہ الم کے ساتھ ۱ تغیر (دکھا)

---

۲۶ پندرہ روزہ " شاعر " آگرہ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء ص ۹ ۔

عہ ہر مہینے کی آخری تاریخ کو سلخ کہتے ہیں ۔ ۱۲

[illegible] مدہوش — تھے مدام اس دور میں مست مئے خم غدیرؑ

[illegible] ہو گیا تھا اہلِ دل — تھے رجوعِ قلب سے شاگردِ دلگیر و ضمیرؔ

مجلسیں سنسان ہیں ویران ہیں ماتم سرا — ہائے وہ گریہ نہ وہ شور ہے نہ وہ جم غفیر

[illegible] فکرِ سال جب مجھکو ہوئی — آئی ہاتف کی صدا یہ تخرجہ ہے بے نظیر

ہاں الم سے سر اوٹھا کر لکھ دے تاریخ وفات

"باغ بے بلبل ہے، ہندستاں لطافت بے دبیرؔ"[27] ۱۲۹۲ھ

[illegible] کا حل:۔ باغ۔ بلبل + ہندوستان۔ دبیر

(۱۰۰۳-۶۴) ۹۳۹+ (۲۱۶-۵۷=) ۳۵۴ = ۱۲۹۳، لیکن پہلے مصرع

[illegible] "الم" کا سر یعنی الف کا ایک عدد اوپر اٹھایا (ساقط کیا) جائے گا۔ ۱۲۹۳-۱=۱۲۹۲ھ

[illegible] اسم [illegible] "بے" ہمیشہ تخرجے کے لئے ہی نہیں آتا۔ بعض تراکیب میں "بے" نافی شامل ہوتا ہے

[illegible] بے پرواہ، بیدل، بیدماغ وغیرہ اور تاریخ میں قرینے نیز وسعتِ مطالعہ سے یہ

[illegible] جاتا ہے کہ یہاں "بے" برائے نفی استعمال نہیں ہوا ہے۔ مثلاً شہزادہ مرزا جہانگیر ابن

[illegible] متوفی ۱۲۳۷ھ کے قطعہ کا بیتِ تاریخی ہے:۔

شد عیاں ایں مصرعہ از ترکیب "آہ"

"حیف بے رونق الہ آباد گشت" ۱۲۳۰+۷=۱۲۳۷ھ

"آہ" کے سات عدد لیتے ہوئے تاریخ مکمل کی گئی ہے۔ یہاں "بے رونق" میں بے نفی کا نہیں ہے۔

آغا جو شرف نے انیسؔ و دبیرؔ کی ایک مصرع سے تاریخیں برآمد کی ہیں:

"ہے ہے غم انیس میں"، "غم ہے دبیر کا"[28]

نیز کسی نے اسے یوں کہا: "غم انیس میں ہے ہے" ۱۲۹۱ھ "دیا دبیر کا غم" ۱۲۹۲ھ[29] ۱۲۹۲ھ

---

[27] حضرتِ شیعہ کی یعد۔ (۲۷ھ) ریاض لطافت ص ص ۶۴-۳۶۳۔

[28] ماہنامہ نیا دور فروری ۱۹۹۵ء ص ۱۷ (۲۹ھ) تاریخ ادب اردو ص ۲۷۲ ج ۲

سید محمد علی جویا کے دو قطعات (اردو) خیابانِ تاریخ صفحہ ۶۰ پر دیکھیں۔ دبیر نے وفات انیس پر جو تاریخ کہی اس کا مخبر سال بیت ہے :۔

سالِ تاریخش بزبر و بینہ شد زیب نظم "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" [۲۶] ۱۲۹۱ھ

اس تاریخ پر اساتذۂ فن میں زبردست اختلافات ہیں کیونکہ مادہ مختلف [ع] ٹکڑوں کے زبر یا بینہ یا زبر و بینات لیتے ہوئے حل کیا گیا ہے مثلاً ایک حل ملاحظہ فرمائیں :۔

"طور سینا" کا زبر (۶۳۳) "بے" کا زبر و بینہ (۱۴) "کلیم اللہ" کا زبر (۱۶۶) "و منبر بے انیس" کا زبر و بینات (۴۷۷) = ۱۲۹۱ھ۔ یعنی مکمل مادہ صنعتِ زبر و بینہ میں نہیں ہے۔ اس طرح ٹکڑوں میں تاریخ کم از کم بیس طرح حل ہوتی ہے گویا نہایت دماغ سوز اور بکھیڑے بھری ہے جو علاحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔ بعض دیگر تاریخوں کو ہم نے مضمون کی طوالت کے مدنظر یہاں حذف کر دیا ہے۔

دبیر : سلامت علی نام ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سات برس کی عمر میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے۔ پندرہ برس کی عمر میں مرثیہ گوئی شروع کی اور آخری دم تک مراثی کہتے رہے۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ سید حسن لطافت نے تاریخ کہی، جو لطیف تعمیہ (تخرجہ) میں ہے۔

صائبِ وقت انوریِ عصر سحبانِ جہاں — دعبلِ دوران و حسانِ زماں مرزا دبیر
صاحبِ عز و شرف مداحِ آلِ مصطفےٰ — تھے فرزدق مرتبہ روح القدس کے ہمصفیر
سمتِ ملکِ جاوداں اِس دارِ فانی سے گئے — داغ بر دل، خاک بر سر غم سے ہیں برنا و پیر
روز سہ شنبہ تھا اور سلخِ [ع] محرم وقت صبح — ماتم شہ میں ہوئے یہ ما الم کے ساتھ اخیر (دکھنا)

---

[۲۶] پندرہ روزہ "شاعر" آگرہ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء ص ۹۔

[ع] ہر مہینے کی آخری تاریخ کو سلخ کہتے ہیں ۱۲۔

مدح حیدر میں عجب تھا جذب اور جوش و خروش　　تھے مدام اس دور میں مست مئے خم غدیر
ہر طرح اللہ نے اونکو کیا تھا اہل دل　　تھے رجوع قلب سے شاگرد دلگیر و ضمیر
مجلسیں سنسان ہیں ویران ہیں ماتم سرا　　ہائے وہ گریہ نہ وہ شہرے نہ وہ جم غفیر
واقعہ جب سنکے فکر سال جب مجھکو ہوئی　　آئی ہاتف کی صدا یہ تخرجہ ہے بے نظیر

ہاں الم سے سر اوٹھا کر لکھدے تاریخ وفات
"باغ بے بلبل ہے، ہندستاں لطافت بے دبیر" [27]　　۱۲۹۲ھ

مادہ کا حل :۔ باغ۔ بلبل + ہندوستان۔ دبیر

(۱۰۰۳-۶۴) ۹۳۹ + (۵۸۰-۲۱۶ =) ۳۵۴ = ۱۲۹۳، لیکن پہلے مصرع کی رُو سے "الم" کا سر یعنی الف کا ایک عدد اوراٹھایا (ساقط کیا) جائے گا۔ ۱۲۹۳-۱ = ۱۲۹۲ھ

لیکن واضح ہو کہ "بے" ہمیشہ تخرجے کے لئے ہی نہیں آتا۔ بعض تراکیب میں "بے" نافیہ شامل رہتا ہے مثلاً بے نیاز، بے پرواہ، بیدل، بیدماغ وغیرہ اور تاریخ میں قرینے نیز وسعت مطالعہ سے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہاں "بے" برائے نفی استعمال نہیں ہوا ہے۔ مثلاً شہزادہ مرزا جہانگیر ابن اکبر ثانی متوفی ۱۲۳۷ھ کے قطعہ کا بیت تاریخی ہے :۔

شد عیاں ایں مصرعہ از ترکیب "آہ"
"حیف بے رونق الہ آباد گشت" ۱۲۳۰+۷ = ۱۲۳۷ھ

"آہ" کے سات عدد لیتے ہوئے تاریخ مکمل کی گئی ہے۔ یہاں "بے رونق" میں بے نفی کا نہیں ہے۔
آغا جو شرف نے انیس و دبیر کی ایک مصرع سے تاریخیں برآمد کی ہیں :

"ہے ہے غم انیس میں" ؛ "غم ہے دبیر کا" [28]
کسی نے اسے یوں کہا : "غم انیس میں ہے ہے" ۱۲۹۱ھ "دیا دبیر کا غم" ۱۲۹۲ھ [29]

---

[26] حضرات شیعہ کی عید۔　　(۲۷) ریاض لطافت ص ص ۶۴-۳۶۳۔
[28] ماہنامہ نیا دور فروری ۱۹۹۵ء ص ۱۷　　(۲۹) تاریخ ادب اردو ص ۲۷۲ ج ۲ ۔

سحر: شیخ امداد علی نام اور سحر تخلص تھا۔ ناسخ کے تلامذہ میں سب پر گوئے سبقت لے گیا۔ ۱۲۹۵ھ میں رحلت کی۔ شیخ محمد جان شاد لکھنوی نے صنعت مہملہ وحسابیہ میں خالی تاریخ کہی:

مہملے کے حرف مصرعِ سحر ۔۔۔ سحر کے یوں سنین شاد لکھو

چھ دہائی سے جو بڑھیں آحاد ۔۔۔ ضرب وہ سات، پانچ میں کرلو

ہو چکیں ضرب جب وہ سات اعداد ۔۔۔ سیکڑے پھر سہ چند کیجئے تو

رحلت سحر کی یہ ہو تاریخ

"آشنا تھا غریق رحمت ہو"[30] ۱۲۹۵ھ

مادہ کے حروفِ مہملہ یہ ہیں:۔ " آ + ا + ھ + ا + ر + ر + ح + م + ہ + و بحساب ابجد ان کے اعداد کا میزان ۴۶۷ ہوتا ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی رو سے چھ دہائی یعنی ساٹھ سے (۷) بڑھ رہے ہیں۔ ان کو چوتھے مصرع کی رو سے (۵) سے ضرب کیا۔ ۷×۵ = ۳۵ ہوئے۔ اب چھٹے مصرع کے بموجب سیکڑے یعنی (۴۰۰) کو (۳) سے ضرب دے کر سہ چند کیا تو ۳×۴۰۰ = ۱۲۰۰ ہوئے۔ اب ۳۵+۶۰ (جو اپنے مرتبہ پر موجود تھا) + ۱۲۰۰ کا میزان کیا تو ۱۲۹۵ حاصل جمع آیا اور یہی ہجری سنہ مطلوب تھا۔

اسیر: منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی مصحفی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ امیٹھی میں پیدا ہوئے نوابان اودھ سے مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب پایا چوراسی برس کی عمر میں سترہویں ربیع الاول ۱۲۹۹ھ کو دو بجے لکھنؤ میں رحلت فرمائی۔ کاظم حسین کاظم پھپھوندوی اور دیگر شعراء نے تاریخیں کہیں۔ کاظم کا قطعہ جو حسنِ تضاد کا اعلا نمونہ ہے، پیش ہے:۔

گزرے جہاں سے آہ مظفر علی اسیر ۔۔۔ آگاہ خاص و عام ہیں اونکی صفات سے

فنِ سخنوری میں وہ استادِ وقت تھے ۔۔۔ تھا شاعری کا رتبہ بلند اونکی ذات سے

گو اک جہاں کو رنج ہے اونکے فراق کا ۔۔۔ تھے نیک، راحت اونکو ہے اپنی وفات سے

---

[30] تاریخ لطیف ص ۲۹

دنیا ہے بجن مومن اور اوس سے رہائی موت وہ کون ہے جو خوش نہ ہو اپنی نجات سے
(مفہوم حدیث پاک مصرعِ اول)
کاظم نے سالِ ہجری، مرگ اد نکالا یہ لکھا
"اچھا اسیر چھوٹا قید حیات سے"[۳۱] ۱۲۹۹ھ

نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی نے صنعتِ انگشتان و انامل (انگلیوں اور پوروں) میں درج ذیل خوبصورت قطعہ کہا:

اسیر خوش سیر خوش وضع خوش فکر ہوئے راہی سوئے دار البقا جب
تو ہاتف نے برائے سال یہہات سوائے نر اٹھادیں انگلیاں سب
مگر گن گن کے دو انگلی کے پورے کہا لکھ لے انھیں اے ہوش تو اب
رہیں باقی جو دو اُن کا سرِ اکبر جھکا دینا کہ ہو جائے مؤدب[۳۲] ۱۲۹۹ھ

حل: قطعہ میں حروفِ ابجدی کے بجائے صرف ہاتھ کی انگلیوں اور پوروں کے ذریعہ مطلوبہ سال برآمد کیا ہے یعنی چوتھے مصرعے کے بموجب نر انگشت یعنی انگوٹھے کو چھوڑ کر باقی چار انگلیاں اٹھادی جائیں پھر دو انگلیوں کے پوروں کو دو بار گنا جائے کیونکہ ہاتف نے تاریخ گو سے دو انگلیوں کے پوروں کو گن گن کے "اب" لکھنے کو کہا ہے۔ یہ محض اشارہ ہے اصل عدد پوروں کو دو بار گننے سے حاصل ہوتا ہے، وہ یوں کہ ایک انگلی کے تین پور ہوتے ہیں لہٰذا دو انگلیوں کے چھ ہوئے اور دو بار گننے پر بارہ (۱۲) اس طرح ہزار اور سیکڑے کے اعداد حاصل ہو گئے۔ باقی دو انگلیوں کے سرِ کبر کو جھکا دیں، دونوں "۹۹" بن جائیں گی اس طرح ۱۲۹۹ حاصل ہو گئے مراد پہلے پورے کو جھکا دینے سے ہے یہ دونوں (۹۹) اکائی و دہائی پر شمار ہوں گے۔

لطافت: سید حسن لطافت صاحب دیوان شاعر تھے۔ تاریخ گوئی کا ملکہ راسخ تھا![۱۳۰]

---

۳۱ نشیدِ کاظم از کاظم حسین ص ۵۷ مطبع اسرار کریمی الہ آباد ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء۔
۳۲ تاریخ لطیف ص ۲۵۔

میں وفات پائی۔ اُن کے تلامذہ میں سے بیشتر نے قطعات وفاتِ لطافت کہے۔ ان میں سے دو دو تین پیش ہیں شیخ رحیم بخش نے یہ قطعہ کہا:

اوٹھے میرے استاد دنیا سے ہائے　　نہ باقی رہا شاعری کا مزا
ہوئی طبع کو فکرِ تاریخ جب　　تو یہ ہاتفِ غیب نے دی ندا[۳۳]
رقم کر پئے سالِ ہجری کلیم　　"فنا آج بے مثل شاعر ہوا" ۱۳۰۱ھ

منشی امیر احمد مینائی نے بالکل نرالے انداز کی تاریخ بزبان فارسی کہی، جس کی مثال شاید ہی ملے:

خرد چوں وفاتِ لطافت شنید　　پئے سالِ رحلت بہر سو دوید
گزشت از شمارِ حروف و نقاط　　ہم از مصرعِ سال اضافت کشید
پس آنگہ بگفتا کہ بشنو امیر
"لطافت بحدِ لطافت رسید"[۳۴]

یعنی عقل نے جب لطافت کی وفات کی خبر سنی تو (وہ) برائے سال ہر طرف دوڑی (تب) اس نے مصرعِ سال میں سے حرفوں اور نقطوں کو گن کر خارج کیا اور ساتھ ہی اضافت بھی کھینچ لی (ساقط کردی) تو (عقل نے) اُسی وقت کہا کہ امیر سُن: "لطافت بحدِ لطافت کشید" سے سالِ رحلت برآمد ہوتا ہے۔ حل یہ ہے کہ مادہ کے تمام حروف سترہ (۱۷) ہیں، نقاط نو (۹) اور اضافت ایک (۱)۔ ان کا میزان ۱۷ + ۹ + ۱ = ۲۷ ہوا۔ اور مصرعِ مادہ کی کل قیمت ۱۳۲۸ ہوتی ہے۔ اس میں سے ۲۷ عدد ساقط کئے تو (۱۳۲۸-۲۷ = ۱۳۰۱) ۱۳۰۱ حاصل ہوگیا جو مطلوب تھا۔

نیر: نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کی ذاتِ گرامی محتاج تعارف نہیں۔ نیّر نے ۱۳۰۲ھ میں وفات پائی۔ میر مہدی مجروح نے تاریخی مرثیہ کہا۔ جسے حضرتِ دہلی مرحوم کا مرثیہ کہنا بھی بجا ہے:

---

۳۳ ریاضِ لطافت ص ۳۷۶

۳۴ حوالۂ ماقبل ص ۳۷۰

شہرِ دہلی کو تفوق تھا انہیں باتوں سے — کہ نظر آتے تھے ہر فن کے یہاں اہلِ کمال

محفلِ شعر کے تھے صدر نشینوں میں یہی — غالبِ سحر بیاں، شیفتۂ مغز مقال

مولوی علوی و صہبائی و ذوق و مومن — اونمیں ہر ایک سخن سنج تھا بیمثل مثال

تھوڑے ہی عرصے میں ویران کدۂ دنیا سے — راہیئے ملکِ عدم ہوگئے یہ نیک خصال

ان میں سے ایک یہ تھے حضرتِ نیر باقی — آہ اونکے بھی لئے آگیا پیغامِ زوال

بادہ پیمائے اجل ہوگئے سرمستِ سخن — اب نہ وہ بزم، نہ وہ ساقی خورشید جمال

میکدہ ہوگیا سنسان، پڑے ہیں ہر سو — ٹوٹے پھوٹے کہیں ساغر تو کہیں جامِ سفال

"اب وہ باقی نہ رہی رونقِ شہرِ دہلی" ۱۳۰۲ھ

بہرِ تاریخ یہ کیا خوب ہے ہاتف کا مقال [۳۵]

مولانا الطاف حسین حالی نے نواب صاحب کے سانحۂ ارتحال پر فارسی میں صنعت خارجی و داخلی میں یہ خوبصورت قطعہ کہا:

دردا کہ ضیاءِ دین احمد بربست — رختِ سفر از جہاں کہ جائے الم ست

از طاق و ز ایوان و ز بزم و جلسا

بگسستہ بہ "رحمتِ الٰہی" پیوست [۳۶]

یعنی ہائے افسوس کہ "ضیاءِ دین احمد" نے اس جہان سے جو کہ جائے الم ہے، جانے کے لئے سامانِ سفر باندھ لیا، (اور) "طاق و ایوان و بزم و جلسا" (ہمنشیناں) سے رشتہ توڑتے ہوئے، "رحمتِ الٰہی" کے ساتھ پیوست ہوگیا۔ تاریخ اسطرح حاصل ہوتی ہے کہ "ضیاءِ دین احمد" کے اعداد ہمزہ کا ایک عدد محسوب کرتے ہوئے، (۹۲۹) ہوتے ہیں، ان میں سے "طاق" ایوان" بزم اور جلسا" کے اعداد ۳۲۱ ساقط کر دیئے جائیں تو (۶۰۸) حاصل باقی آئے گا۔ اب

---

[۳۵] مظہرِ معانی معروف بہ دیوانِ مجروح ص ص ۳۹-۲۳۸ سرفراز پریس دہلی ۱۳۱۶ھ

[۳۶] دیوانِ حالی ص ۱۸۲ انوار المطابع لکھنؤ ۱۵ اگست ۱۹۲۲ء

۶۰۸ عدد "رحمت الٰہی" کے عدد (۶۹۴) میں جمع کر دیئے گئے تو ۱۳۰۲ حاصل ہو گئے مختصر صورت یہ ہوگی (۹۲۹-۳۲۱+۶۹۴=) ۱۳۰۲ھ۔

ہوش: نواب نیاز احمد خاں ہوش بریلوی نبیرہ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں صاحب بہادر روہیکھنڈ[۳۷]، ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۲ء (۱۳۰۲ھ) میں راہی ملک بقا ہوئے۔ ہوش بریلی کے مشہور شاعر، مورخ اور طبیب حاذق تھے۔ اُن کو قصیدہ نگاری میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ وہ دو مانِ روہیلہ کے بے حد ہر دلعزیز فرد اور مربی سخن تھے۔ ہوش کی عرفیت بنّے میاں تھی۔ قطعہ وفات مولوی سید قاسم علی خاں خواہاں بریلوی نے کہا ہوش کی لوح قبر پر یہ کتبہ کندہ ہے:۔

"آرامگہ طبیب زمن نواب نیاز احمد خاں ہوش اعلی اللہ مقامہ،" ۱۸۹۲ء خواہاں کا قطعہ یہ ہے:

اوٹھ گیا فخر خانداں کیا	صدمۂ جاوداں ہے دنیا کو
نامِ نامی نیاز احمد خاں	ہر زباں بر زباں ہے دنیا کو
دفن زیرِ زمیں ہوا نواب	غم تہِ آسماں ہے دنیا کو
آں حکیم و مورخ و شاعر	جو ہر اُس کا عیاں ہے دنیا کو

لکھ یہ تاریخ فوت اے خواہاں
"غم بنّے میاں ہے دنیا کو" ۱۳۰۹ھ

دیگر از راجہ عنایت سنگھ عنایتؔ:

از روے الم کہو عنایت تاریخ
"جنت کو گئے نیاز احمد خاں واے"[۳۸] ۱+۱۳۰۸=۱۳۰۹ھ

---

[۳۷] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۹۵ء ص ۴۴۳

[۳۸] ایضاً اپریل ۱۹۸۱ء ص ۲۷۳-

عزیزؔ : نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ بریلوی رئیس بریلی حافظ رحمت خانی کی وفات ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ میں ہوئی۔ جب اُنہیں دفن کیا جا چکا تو نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ نے جن کی وفات عزیزؔ کے کچھ دن بعد ہی ہوئی، فی البدیہہ یہ قطعہ کہا:

"عزیز مصر سخن چل دیے عدم جو آج" تو رنج و غم ہوا تنا شمار جس کا نہیں

برائے سال تو اے ہوشؔ پہلے مصرع سے[۳۹]

مٹا دے شرط کہ اس وقت کام اس کا نہیں ۱۳۰۹ھ

پہلے مصرعے کے اعداد جو کہ مادہ ہے ۱۳۱۸ ہوتے ہیں، مگر چوتھے مصرع کی رُو سے اس میں سے حرف "شرط" "جو" کے (۹) عدد کا استخراج کیا جائے (۱۳۱۸-۹) = ۱۳۰۹ تو مطلوبہ ہجری سنہ حاصل ہو رہا ہے۔ اس تاریخ پر سالم الاعداد تاریخ بھی سر تسلیم خم کرتی ہے۔

سفلیؔ : عنایت اللہ خاں نام عرف کالے خاں۔ رامپور میں تقریباً ۱۲۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عظیم اللہ خاں۔ آگرہ میں آکر رہائش اختیار کی۔ عنایتؔ و سفلیؔ تخلص تھے۔ بڑے مزاحیہ شاعر تھے۔ بروزِ جمعہ دہم صفر ۱۳۱۶ھ میں انتقال ہوا۔ انورؔ نے قطعہ تاریخ کہا جس سے سفلیؔ کے اوصاف و شخصیت پر بھی واضح روشنی پڑتی ہے:۔ امام الدین خاں انورؔ رامپوری کا کہا ہوا قطعہ یہ ہے:۔

عنایت اللہ کہ مشہور تھے جو کالے خاں ہوئے طفیل محمدؐ غریقِ رحمتِ رب

صفر کی دسویں کو جمعہ کے دن جو رحلت کی گئے بہشت میں الطافِ کبریا کے سبب

بڑے فصیح و بلیغ و ظریف شاعر تھے چراغِ ہند انہیں جانتے تھے اہل عرب

یہ لطف ہے کہ لطیفہ تھا اُن کا ہر فقرہ ہر ایک بات میں کتنے ہی معنی و مطلب

کمالِ پاک طبیعت فرشتہ طینت مرد جہاں میں ہوتے ہیں انسان ایسے پیدا کب

---

[۳۹] تاریخ لطیف ص ۴۸۔

خوش اعتقاد و خوش اخلاق، خوش نویس و ذکی وفا شعار عبادت گذار اہلِ ادب
سخی و منکسر و نیک خو، کریم النفس! حلیم و صابر و ہر دل عزیز و خیر طلب
ہر ایک مذہب و ملت کے خاص و عام انکو عزیز رکھتے تھے اور اُن کے ہیں ثنا خواں سب
سروش غیب سے اقوؔس نے یہ سنی تاریخ
"عنایت اللہ یہ ہے رحمتِ الٰہی اب[سے]" ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء

شادؔ: شیخ محمد جان شادؔ لکھنوی ہیرو میر بعارضہ فالج ربیع الآخر ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء مطابق سمت ۱۹۵۶ بکرمی میں فوت ہوئے۔ راجہ عنایت سنگھ عنایتؔ لکھنوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:۔

لکھنؤ خالی ہوا جاتا ہے، جنت آباد عیشؔ کے بعد گئے شادؔ بھی اِس عالم سے
لکھو سمت میں عنایت زسرِ آہ و بکا
"عیشؔ ہی[سے] جب نہیں تو شادؔ یہاں کیا کرتے" ۱۹۵ [۳] = ۱۹۵۶ بکرمی

مولانا محمد عبدالرحیم کلیمؔ لکھنوی نے فارسی میں تاریخ لکھی :۔

نکتہ دانے شاعرے در لکھنؤ کرد انتقال یادگارِ میرؔ و سوداؔ بود آں والا نژاد
سال مرگش در سنِ ہجری نوشتم اے کلیم[سے]
"موجب گلہا بجنت شد محمد جان شادؔ" ۱۳۱۷ھ

امیرؔ مینائی: منشی امیر احمد امیرؔ مینائی مولوی کرم محمد مینائی کے خلفِ اصغر تھے۔ ۱۶ر شعبان

[سے] سہ ماہی نخلستان جے پور جلد ۹ شمارہ ۴ ص ۱۰۸ بابت جنوری تا مارچ ۱۹۸۹ء

[سے] تاریخ لطیف ص ۳۴

[سے] گلدستۂ خرد المعروف بہ کلام کلیم از مولانا محمد عبدالرحیم کلیمؔ لکھنوی ص ۲۶۷ قومی پریس لکھنؤ ۱۹۰۶ء

[سے] مراد فدا علی عیشؔ لکھنوی۔

۱۲۴۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ مینا صاحبؒ کی اولاد میں ہیں اس لیے مینائی کہلاتے ہیں۔ شاعری میں مظفر علی خاں اسیر لکھنوی سے استفادہ کیا۔ ۱۲۷۶ھ میں رام پور تشریف لے گئے اور عدالتِ دیوانی کے مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی علالت شروع ہو گئی اور ۱۷ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ/۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور وہاں ہی دفن ہوئے۔ درج ذیل شہرہ آفاق شعر امیر ہی کا ہے:

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا قتل کیونکر جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا[۴۳]

مولانا عبدالجلیل نعمانی صاحب نے "غریب الوطنی" (۱۳۱۸ھ) سے امیر مینائی کی تاریخ وفات برآمد کی۔ بقول بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب "اس تاریخ کا لطف اُس وقت معلوم ہوتا ہے جبکہ منشی صاحب کا یہ شعر بھی پیشِ نظر ہو":

اب نہ ٹھہرو نگا کرے میری خوشامد بھی وطن کہ بلایا ہے غریب الوطنی نے مجھے[۴۴]

داغ دہلوی نے جو قطعہ اس سانحہ پر کہا وہ یہ ہے:

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ	جو مرا ہم فن تھا میرا ہمصفیر
(رامپور) مصطفےٰ آباد سے آیا دکن	یہ سفر تھا اس مسافر کا اخیر
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں	کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلائے حدتِ صفر او تپ	موردِ آزار و اسہال و زحیر (پیچش)
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب	درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ	شاعری میں خاص تلمیذِ اسیر

---

۴۳ انتخاب یادگار از امیر مینائی ص ۴۴ ناشر اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

۴۴ چند ہم عصر از ڈاکٹر عبدالحق ص ۳۱ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ اگست ۱۹۵۷ء

ہے دعا بھی داغ کی، تاریخ بھی
"قصرِ عالی پائے جنت میں امیر"[۴۵] ۱۳۱۸ھ

فصلی سنہ میں ایک بامحاورہ زبان میں یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

لوگ کہتے ہیں آمیر آئے تھے — اُن کو بھائی تھی دکن کی مٹی
یاں پہ آتے ہی حضوری پائی — کیا رسائی تھی دکن کی مٹی

ہوئی اس وصل کی فصلی تاریخ
"مرنے لائی تھی دکن کی مٹی"[۴۶] ۱۳۱۰ فصلی

حکیم میر ضامن علی جلال لکھنوی کے قطعہ کا حاصل تاریخ شعر ہے:

جلال لکھدو یہ تاریخ ان کی رحلت کی
"امیر ہو گئے صد رولے ایک مردِ غریب"[۴۷] ۱۹۰۰ء

دیگر مختلف قطعات و ابیاتِ تاریخی سے مضمون کے محدود دائرے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، صرف نظر کیا جاتا ہے۔ آئندہ قسط میں ہم یہ سلسلہ وفاتِ داغ کے قطعات سے شروع کریں گے بشرطیکہ توفیق ایزدی شاملِ حال رہی۔ (جاری)

۴۵؎ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری ص ۳۶۰ مطبوعہ ۱۹۸۶ء

۴۶؎ چند ہم عصر ص ۱۴۔

۴۷؎ تاریخ لطیف ص ۲۷۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مسلم جانبازانِ حریت

ڈاکٹر مختار احمد مکی۔ ریڈر و صدر شعبہ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور بہار

۱۸۵۷ء کے واقعات کو انگریز مورخین نے شر پسند فوجیوں کی سرکشی اور خود غرض اقتدار پسندوں کی مذموم اور گمراہ کن سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اس وجہ سے اسے غدر کا نام دیا گیا لیکن درحقیقت یہ غدر نہیں تھا اور نہ ہی صرف ہنگامی شورش جو چند شورہ پشت اور سرکش فوجی افسروں کی ناراضگی سے پیدا ہو گئی تھی بلکہ انگریزوں کو ہندوستان کی سرزمین سے باہر نکالنے کی ایک جرأت مندانہ کوشش، انقلاب اور بغاوت تھی جو دراصل آزادی کے حصول کے لئے پہلی منظم جنگ ثابت ہوئی بقول مٹ جولنس "یہ عوامی جنگ تھی اور ہندوستان کی کسی بھی جنگ میں آج تک عوام کی اتنی بڑی تعداد نے حصہ نہیں لیا تھا۔" برطانوی وزیر اعظم، ڈزرائیلی بھی اس سے متفق ہیں جب ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ بنگالی دستہ کے باغیوں نے محض فوجی تکلیفات کی بنا پر بغاوت کی تھی بلکہ در پردہ وہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ (۱) اگرچہ حریت پسند اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور وطن عزیز کو نجات دلانے کی مشترکہ جدوجہد میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور انگریزوں کا ظالمانہ و جابرانہ تسلط اور شکنجہ ہندوستان کی سرزمین پر بھی سخت ہوتا گیا۔ تہذیب و تمدن کی دعویدار انگریز قوم نے بربریت اور سفاکی کے وہ مظاہرے کئے جن سے چنگیز خاں، ہلاکو اور نادر شاہ کی روحیں بھی کانپ اٹھی ہونگیں۔

انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی نفرت کی کئی وجہیں تھیں ابتدا انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے اور ایک خود غرض تاجروں کی طرح آتے ہی انہوں نے لوٹ کھسوٹ سے ہندوستانیوں کی معیشت کو برباد کرنا شروع کر دیا ان کے کچھ پرجوش اہلکار اور پادری ہندوستانیوں کے مذہب کے درپے تھے جنگ پلاسی اور سرنگا پٹنم کے بعد اس نے حکومت کا

روپے بھی دھار لیا اور گرگ مردم خور بن کر نہ صرف ملکی صنعت و حرفت کے کارخانہ کو تباہ کیا بلکہ
بڑی بڑی حکومتوں کے پرخچے اڑانا بھی شروع کر دیا پہلے بہار بنگال اڑیسہ کی دیوانی شاہ عالم سے
حاصل کی پھر اودھ پہونچے روہیلوں کو تباہ و برباد کیا ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد مرہٹوں کو
مٹایا اور نظام کو بے دست و پا کر دیا اور شاہ عالم کے ہمدرد بن کر دہلی میں قدم جمایا اور اسے
نظر بند کر دیا اور عملی طور پر دہلی میں اپنی حکومت قائم کر لی توسیع سلطنت کے لئے صوبوں کا الحاق
ڈلہوزی کی حکمت عملی حکومت کی بد عہدی اور اس طرح دوسری مکارانہ غداری کو ہندوستان کا
سنجیدہ طبقہ بتدریج محسوس کر رہا تھا انہیں یہ بھی احساس تھا کہ تمام قوانین ان کی تذلیل تباہی اور
ہم وطنوں کو ان کے دین و ایمان سے محروم کرنے کی غرض سے بنائے جا رہے ہیں وہ انگریز حکومت کو
ایک دیرا اثر زہر اور شعلہ فریب تصور کرتے تھے جو ریت کی دیوار کے مانند ہے ان کی خواہش تھی کہ
ہندوستان کو انگریزی راج کی بدترین غلامی سے نجات دلا کر اپنی عظمت وقار آزادی اور خودداری
کو پھر سے حاصل کیا جائے اس کے لئے ان لوگوں نے ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ مقرر کر رکھی تھی جبکہ
ایک ہی وقت میں پورے ہندوستان میں بغاوت کر دی جائے لیکن اس سے قبل ہی مذہبی جذبات
و ہیجان کی وجہ سے سپاہی آگ بگولہ ہو گئے جیل خانہ میں ایک ہی طرح کا کھانا، فوجی بھرتی میں سمندر
پار جانے کی شرط، نکاح بیوگان، دختر کشی کی ممانعت ستی کا انسداد گھی میں گائے اور سور کی چربی اور
آٹے میں ان کے ہڈیوں کی راکھ کا پروپیگنڈا۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان کو عیسائی بنانے
کا منصوبہ اور اس کے لئے عیسائی مشنریوں کی پر زور اور ناروا کوشش شمالی ہندوستان کے
دیہاتوں اور فوجیوں کے درمیان پراسرار چپاتی اور کنول کے پھول کی تقسیم چربی لگے کارتوس کے
افسانے اور شاہ ایران و روس سے مدد کی غلط توقعات وغیرہ انگریزوں کے خلاف فوجی
شورش کے محرک ثابت ہوئے۔

ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان بے چینی کی عملی شکل سب سے پہلے ۲۲ جنوری ۱۸۵۷ء
کو دیکھنے کو ملی جبکہ دم دم چھاؤنی (کلکتہ) میں مقیم دیسی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں سے ا
فیلڈ رائفلوں کے کارتوس میں گائے اور سور کی چربی ہونے کی شکایت کی حکومت کی جانب سے اس
کی تردید کی گئی لیکن یہ افواہ بارود کی ڈھیر میں چنگاری کا کام کر چکی تھی بارک پور کے فوجیوں

بہرام پور (مرشد آباد) کی انیسویں رجمنٹ میں بے چینی کا بیج بو دیا ۲۶ فروری کی رات اس رجمنٹ میں حکومت کے خلاف مظاہرے بھی ہوئے بارکپور کے ۳۴ ویں رجمنٹ کے ایک فوجی منگل پانڈے نے ۲۹ اپریل کو پریڈ کے دوران دین دین کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو فرنگیوں کے خلاف لڑنے کے لئے اکسایا اور سرجنٹ میجر پر گولی چلادی ۶ اپریل کو اس کے خلاف مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی اور سرسری سماعت کے بعد ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو اسے پھانسی دے دی گئی اور ۱۹ ویں اور ۳۴ ویں رجمنٹ کو ختم کر دیا گیا۔ بارک پور کی خبریں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ شمالی ہندوستان بھی پہونچیں میرٹھ چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہیوں نے بھی مختلف طریقوں سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا ۶ ارمئی کو میرٹھ میں تیسرے کیو میری میں پریڈ کے لئے کل نوے سپاہی کے علاوہ سبھوں نے اس کارتوس کو لینے سے انکار کر دیا ان ۸۵ فوجیوں میں ۴۹ مسلمان اور باقی غیر مسلم تھے۔ (۲)

۹ مئی کو عمومی پریڈ کے دوران ان فوجیوں کو دس دس سال قید بامشقت کی سزا ذلیل کن طریقوں سے سنائی گئی اور فوراً ہی ان کے فوجی تمغے چھین لئے گئے ان کی وردیاں پشت سے پھاڑدی گئی اور انہیں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا گیا اور باپیادہ شہر کے جیل میں پہونچا دیا گیا (۳) یہ نظارہ بہت ہی حسرتناک اور اشتعال انگیز تھا۔ جس نے ہندوستانی افواج کے علاوہ عام عوام کی غیرت و حمیت کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ ایک اتفاقیہ چنگاری تھی جو کہ آتش گیر مادے پر گر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔ ۱۰ ارمئی کی شام دیسی افواج کے سواروں کے ایک دستہ نے بیرکوں کو آگ لگادی دو پیادہ پلٹن نے بغاوت کر کے جیل پر حملہ کر دیا اور تمام قیدیوں کو آزاد کرالیا جو فرنگی بھی سامنے آئے انہیں گولی ماردی گئی دیسی فوجیوں کا پورا دستہ دہلی چلو کا نعرہ لگاتے ہوئے دہلی کے لئے باپیادہ کوچ کر گیا اور ۹ گھنٹہ کے اندر ہی ۴۴ میل کا راستہ طے کر کے ۱۱ مئی کی صبح دہلی پہونچکر لال قلعہ میں داخل ہو گیا اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہوئے رہبری اور رہنمائی کی درخواست کی۔ باغی انہیں قومی اتحاد کی نشانی سمجھتے تھے جن کی پشت پر ہندوستان کے مختلف فرقے اور طبقے اکٹھا ہو سکتے تھے بوڑھے بادشاہ نے دہلی کے انگریز ریزیڈنٹ کو بلاکر صلح و صفائی کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہیں ملی ان انقلابی سپاہیوں نے دہلی

کے انگریزوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ دہلی چھاؤنی کی ۴۵ ویں ریجیمنٹ اور دہلی کے عوام بھی ان کے ساتھ مل گئے ایک عارضی مرکزی حکومت کا اعلان ہوا۔ ۱۳ مئی کو شاہی دربار منعقد ہوا بادشاہ بذاتِ خود اس میں شریک تھے ایک کونسل امورات جنگ کے لئے منتخب ہوئی وزیر حرب مرزا جواں بخت بنائے گئے ایک فوج کی کمان نواب زینت محل کو سپرد ہوئی۔ مرزا مغل کمانڈر افواج مقرر ہوئے جہاد اور دھرم یدھ کا نعرہ شمالی ہندوستان کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ اور دس دنوں کے اندر صوبہ اودھ میں انگریز حکومت کے پرخچے اڑ گئے اور اس کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ ۱۳ مئی کو فیروز پور ۱۴ مئی کو مظفر نگر، ۲۰ مئی کو علی گڑھ، ۲۱ مئی کو نوشیرہ (پنجاب) ۲۳ کو اٹاوہ اور مین پوری، ۲۵ کو روڑکی اور بدایوں، ۲۸ جون کو اعظم گڈھ اور سیتا پور، ۴ جون کو بنارس محمدی اور کانپور، ۶ جون کو جھانسی اور الہ آباد، ۷ جون کو فیض آباد، ۸ جون کو دریا باد اور فتح پور وغیرہ میں انقلاب کی آگ پھیل گئی ان جگہوں پر فوجیوں کی سرکشی کے ساتھ ہی ساتھ یا اس سے قبل ہی وہاں کے عوام نے بغاوت کا علم بلند کر دیا ہندو مسلم اتحاد و الفت کی خاطر گائے کی قربانی بند کر دی گئی تاجرانہ متاع فروش در بیگانگاں بعید الوطن جنہیں ہندوستانی غاصب بد عہد اور خائن سمجھتے تھے اپنے وطن عزیز کو پاک کرانے کی خاطر علماء تاجر، قدیم زمیندار، عام سادھو سنیاسی گھومنے پھرنے والے فقیر گداگر اور مداری وغیرہ متفقہ طور پر تن من دھن کی بازی لگا کر ان میں کود پڑے بقول کے (ﷺ) دریائے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقہ میں شاید ہی کوئی مسلم یا ہندو ہوگا جو ہمارے خلاف صف آرا نہ ہوا ہو" تھامس لو کے مطابق دختر کش راجپوت، کٹر برہمن، متعصب مسلمان اور عیش پسند توندوالا من چلا مرہٹہ سبھی اس جہاد میں شامل ہو گئے گائے کا قاتل اور گائے کا پجاری، خنزیر سے کراہیت رکھنے والا اور خنزیر کا گوشت کھانے والا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا اور برہما کے منتروں کا جپنے والا سبھوں نے مل کر بغاوت کر دی۔ (۴)

(بقیہ آئندہ)

(حواشی)

(۱) ایڈوارڈ ٹامسن دی اور سائیڈ سن اوف میڈل (لندن ۱۸۹۲ء) صہ ۲۷

(۲) غلام رسول مہر ۱۸۵۷ء کے مجاہدین (لاہور ۱۹۶۰ء) صہ ۲ سید محمد میاں علماء ہند کے شاندار ماضی جلد ۴ دہلی الجمعیۃ ۱۹۶۰ء) صہ ۹۴

(۳) وی ڈی ساورکر ۱۸۵۷ء دی انڈین وار اوف انڈیپنڈنس (بمبئی ۱۹۴۷ء) صہ ۵۴ (۴) تھامس لیو

(۷۸۶)
نصر من اللہ و فتح قریب
سنہ ۱۳۳۶ ہجری
کتبہ حکیم قاضی حافظ محمد افضل عالم التونی ۱۹۲۶ء
بشکریہ جناب حکیم قاضی محمد یٰسین عالم
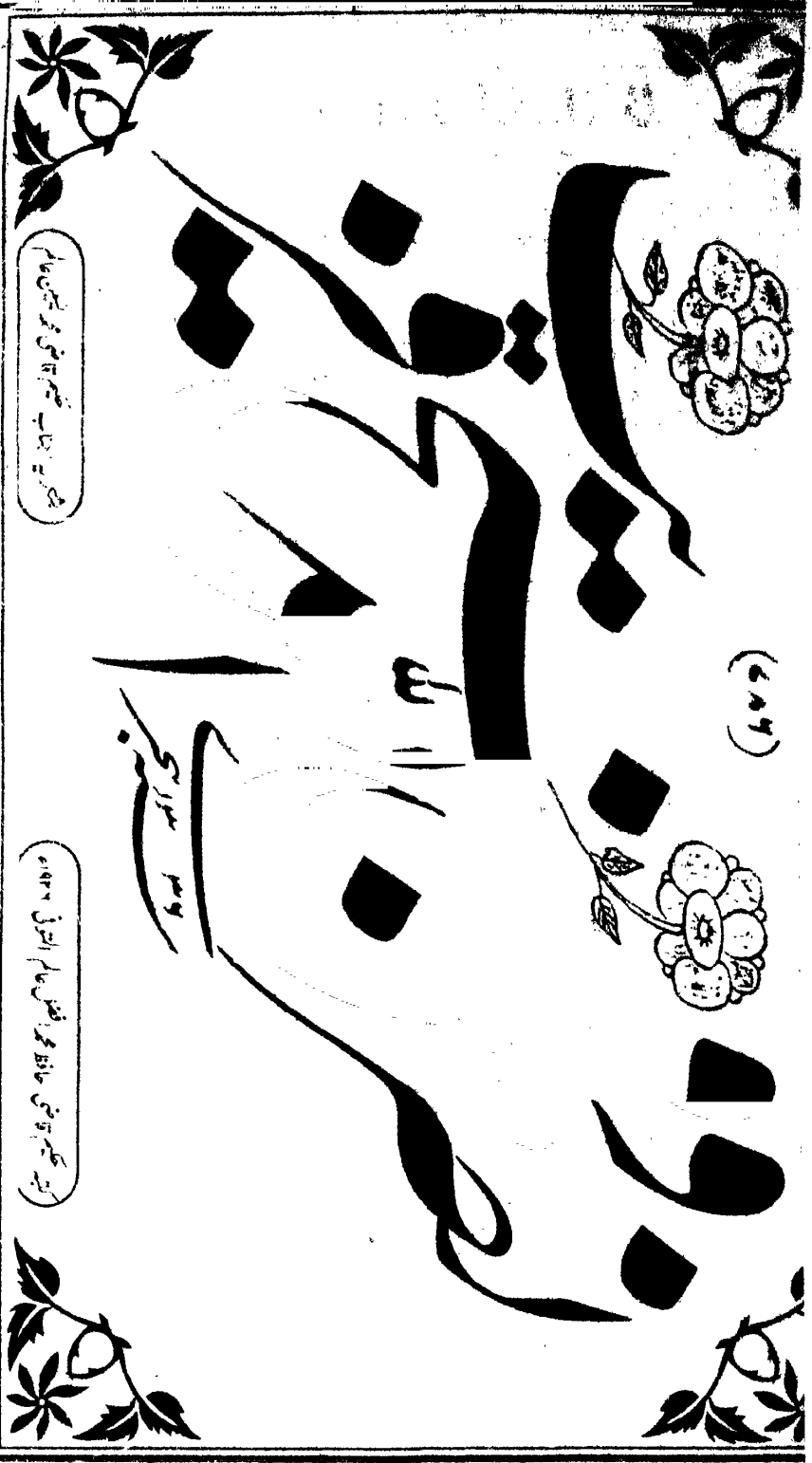
تازگی
شربت روح افزا
کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلتیں